

# فردوسِ گم گشتہ

(مجموعہ خطبات و مقالات)

پر ویز

شائع کردہ

ط (رجسٹرڈ)، بی، ۲۵، گلی، لاہور  
طابع اسلام پوسٹ، بی، ۲۵، گلی، لاہور

## جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	فردوس گم گشتہ
مصنف	پرویز
ناشر	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	25-B گلبرگ II لاہور 54660 پاکستان
	فون: 5753666-5764484

مطبع

عالمین پریس

تیسرا ایڈیشن

جون 1998ء

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ  
جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

# فہرست مضامین

۱۲۷	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں	۴	پیش لفظ
۱۶۴	وراثتِ ارض کا ابدی قانون	۸	دُنیا کی نجات
۱۹۲	شُرآن اور تاریخ	۲۳	جنگ
۳۱۱	مسلمان کی زندگی	۳۵	فردوسِ گم گشتہ
۲۲۹	یہ زمین کس کی ہے؟	۴۵	ایمانِ بلا عمل
۲۴۶	شُرآن کا معاشی نظام	۵۴	اسلام اور سائنس
۳۶۷	اپنی آنکھ اور قرآن کی روشنی	۷۳	خدا کی بادشاہت
۲۸۱	نسخہ اور اس کا استعمال	۹۱	اسلام اور مذہبی رواداری
۲۹۰	خدا اور قیصر	۱۱۰	تمتک بالکتاب

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# پیش لفظ

نوع انسان کی زندگی میں ایک مدت سے جہنم کی سی کیفیت پاپا ہے۔ سائنس کے محیر العقول انکشافات کے باوجود اس کا امن و سکون، ہیجان و اضطراب کے لپکتے ہوئے شعلوں کی زد میں ہے۔ حکمائے مغرب کی شبانہ روز کاوشیں اسے اس اضطراب مسلسل اور عذاب الیم سے نجات دلانے میں یکسر خاسر و ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ مفکرین عالم کو اپنی شکست کا کھلا اعتراف ہے۔ اور مورخ کا قلم علی وجہ البصیرت اس صورت حال کا تجزیہ کرنے اور اس کے محرکات کا سراغ لگانے میں اظہارِ عجز پر مجبور ہے۔ کیا کاروانِ انسانیت کو اس جہنم سے نجات دلانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا؟ کیا اس کارگہ عظیم میں انسانی زندگی کا مقصود و نتیجہ یہی تھا کہ وہ مایوسیوں اور حیران نصیبیوں کے پتے پتے ہوئے صحرا میں دم توڑنے کے لئے سرگرداں رہے؟ یہ وہ اہم سوالات ہیں جنہوں نے مفکرین عالم کو طلسمِ پیچ و تاب بنا رکھا ہے اور امید کی کوئی ایک آدھ شرمائی ہوئی سی کرن بھی ان کی بے تاب نگاہوں کے سامنے جلوہ بار نہیں ہو رہی۔

چودہ سو سال قبل بھی نوع انسان کو اسی قسم کی صورت حال کا سامنا تھا۔ اس وقت بھی ظہورِ الفساد فی البر و البحر کی ایسی ہی کیفیت سے کاروانِ انسانیت دوچار تھا۔ لیکن تاریخ کے اوراق شہادت دے رہے ہیں کہ مایوسی اور بے بسی کی ان اندوہناک تاریکیوں میں ہی وہ صبح بہار نورپاش ہوئی تھی جس کی روشنی میں کاروانِ حیات طفولیت کے کٹھن مرحلوں سے گزر کر عالمِ شباب میں داخل ہوا۔ یہی سعادت آفریں دور تھا جس کا آغاز حضور رسالتِ نبی کی اس دعوتِ انقلاب سے ہوا جو قرآن کی صورت میں قیامت تک کے لئے زندگی کی نئی منزلوں کا سراغ دے گئی اور اپنی عطا فرمودہ ابدی اور مستقل اقدار حیات سے ایک ایسا عالم آرا نظام تشکیل کر گئی جس میں ہر نوع غلامی کے بندھن ٹوٹ گئے اور یہ زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور

سے جگمگا اٹھی۔

انسانی تاریخ کا یہ حادثہ عظیم تھا کہ انسانیت کو قرآن کی اس حیات آفریں روشنی سے زیادہ دیر تک کسبِ ضیاء نصیب نہ ہوا۔ اور ابھی نصف صدی بھی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ سازشِ عجم کی روباہ بازیاں اور دسیسہ کاریاں منظم ہو کر منظرِ عام پر آگئیں۔ ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری کا گٹھ جوڑا اپنی مفاد پرستیوں کی بے تابیوں میں اس سازشِ عجم کا امین دسر پرست بن گیا اور اس ملی بھگت سے عجمی اسلام کا وہ تانا بانا تیار ہوا جس کے دبیز و دل فریب پردوں میں قرآن کی روشنی گم ہو کر رہ گئی اور پھر اس کے بعد صدیاں گزر گئیں اس روشنی کو از سر نو ابھرنے کا نصیب نہ ہوا۔ ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری کے اقانیم ثلاثہ نے اپنے مقاصدِ مشنومہ کو وہ تقدیس عطا کی کہ غلامی کی جن زنجیروں کو قرآن نے توڑ کر رکھ دیا تھا وہ پھر سے نوعِ انسانی کے زیبِ گلو بنادی گئیں اور انہیں جزو دین بننے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

قرآن کے خلاف یہ سازش درحقیقت نوعِ انسان کے بہترین مفادات اور اس کی حقیقی آزادی کے خلاف سازش تھی۔ اور اس کا نقصان کسی خاص قوم یا مخصوص خطہ زمین کو ہی نہیں پہنچا بلکہ اس نے پورے کاروانِ انسانیت کو ان پڑتیج راہوں کی طرف موڑ دیا جن پر چلتے ہوئے وہ صدیوں تک کے لئے ان برکتوں اور سعادتوں سے محروم ہو گیا جو قرآن اُسے عطا کرنے آیا تھا۔ ہر نوعِ غلامی سے نجات اور عالمگیر انسانیت کا قیام قرآن کی دعوتِ انقلاب کا نقطہٴ ناسک تھا اور جب سازشِ عجم کی کرشمہ سازیوں نے اسے نگاہوں سے اوجھل کر دیا تو کاروانِ انسانیت ہر اس متاع سے بے نصیب ہو گیا جو قرآن کی عالمگیر اور عالم آراء دعوت کا شیریں ثمر قرار پاتی ہے۔ نوعِ انسان کی ساری حرماں نصیبیوں کا مرکز و محور آج یہی حادثہ عظیم ہے جو قرآن کے خلاف اس سازشِ عجم نے بپا کیا اور جب تک انسان کو اس کی گم گشتہ منزل سے متعارف نہیں کرایا جاتا اسے اس جہنم سے نجات نہیں مل سکتی۔

اسے انسانی سعادت کا حرفِ آغاز کہتے کہ اسی بیسویں صدی عیسوی میں بعض سعید روہیں اس مقصدِ عزیز کو لے کر اٹھیں کہ دبیز پردوں کو الٹ کر قرآن کی روشنی کے ایک بار پھر فردوسِ نگاہ بننے کا سامان پیدا کیا جائے۔ اور فریب خوردہ کاروانِ انسانیت کو پھر اس منزل کا ذوق سفر عطا کیا جائے جس کی راہ نمائی قرآنی تصورات کا منشاء و مقصد ہے۔ ان قابلِ قدر شخصیتوں میں علامہ اسلم جیراچپوری (علیہ الرحمۃ) اور علامہ اقبال کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔ علامہ جیراچپوری نے قدامت پرست مذہبی طبقہ کو بالخصوص مخاطب کیا اور

اس حقیقت کی نشاندہی کی کہ وہ کیوں قرآن کی بارگاہ سے دُور ہٹتے چلے گئے۔ علامہ اقبالؒ کی وقتِ نگاہ نے نئی نسل کے رجحانات و میلانات کا جائزہ لیا اور حسن بیان کی مخصوص دل کشی سے انہیں شمع قرآنی کے قریب لانے کی سعی فرمائی۔ شعر و ادب کے انوکھے اور دلاویز پیرائے میں انہوں نے اس حسن و خوبی سے قرآنی تصورات کو نشہ کیا جس کی مثال صدیوں سے ہماری تاریخ میں موجود نہیں تھی۔ اسلام کے ان مفکرین عظام کی یہ گراں قدر فکری کاوشیں ہماری تاریخ کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ اور آئندہ نسلیں انہیں ہمیشہ قدر و احترام اور فخر سے یاد کریں گی۔

ان بلند مرتبت حضرات کے بعد مفکرِ قرآن جناب پرویز مدظلہ کی جلیل القدر شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ قرآن کے اس شہرہ آفاق طالب علم نے سالہا سال تک ہر دو متذکرۃ الصدور زعماء کی بصیرت قرآنی سے کسبِ ضیاء کا شرف حاصل کیا۔ ان کی عقابانی نگاہ نے قدیم و جدید ہر دو مکاتبِ فکر کے لٹریچر کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ حق و باطل کے امتیاز میں خدا کی آخری کتاب (قرآن کریم) ہمیشہ ان کے نزدیک معیار قرار پائی۔ اسی میزان پر انہوں نے عہدِ رفتہ کے علمی سرمائے کا وزن کیا جو اس معیار پر پورا اُترا اُسے دین کے مطابق قرار دیا اور جسے اس آسمانی معیار نے غلط قرار دے دیا اُسے مسترد کر دیا۔ مذہبی اجارہ داری کے پیشوا اور قدامت پرستی کے دیوتا غیظ و غضب کے جوش میں آگ بگولہ ہوئے لیکن علم و بصیرت اور دلائل و براہین کے چیلنج کو قبول کرنے کی کبھی جرأت نہ کی۔

محترم پرویز صاحب آج دعوتِ قرآنی کے عظیم و جلیل نقیب ہیں۔ ان کی یہ دعوتِ انقلابِ مسلک تقلید کی قدامت پرستی اور بے لگام تجدید پسندی دونوں کے خلاف کھلا چیلنج ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک توازن بدوش نشان راہ بھی۔ قدیم و جدید کی معرکہ آرائی کے بین بین مستقل اقدار حیات کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے سنگِ میل اس دعوتِ قرآنی کے وہ حسین و جمیل شاہکار ہیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف فکر و بصیرت کی بارگاہوں میں لگایا جاسکتا ہے۔ مذہبی جذباتیت کی تندہی ان شہ پاروں کی ندرت کو کیونکر جانچ سکتی ہے! اس مختصر سے اقتناحیہ میں ان شہ پاروں کی تفصیل پیش کرنا ممکن نہیں، اجمالاً یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک جو کچھ زیور طباعت سے آراستہ ہو کر اشاعت پذیر ہوا ہے اس میں سلسلہ معارف القرآن کی مختلف جلدیں جوئے نور، برقی طور، شعلہ مستور، معراج انسانیت، ابلیس و آدم اور من و یزدال — سرفہرستیں — انسان نے کیا سوچا؟“ اسی سلسلہ کی ایک دوسری کڑی ہے اور علمی حلقوں میں خصوصی امتیاز کی حامل۔



# دنیا کی نجات

(جنوری ۱۹۴۲ء)

جاڑے کی کپکپاتی رات ہے۔ کرزن روڈ (نئی دہلی) پر وسیع پائیں باغ کے اندر ایک مہر میں قصر مزین کے بندر و سندان کے شیشے سے بجلی کے لیمپ کی شعاعیں، حسن بے پروا کی بیتابی نمائش کی غمازی کر رہی ہیں۔ کمرہ ایرانی قالینوں، افرنگی صوفوں اور حریر و اطلس کے زرنکار پردوں سے، دامن باغبان و کف گل فروش کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی اور مطرب بہ نغمہ بہزن تمکین و ہوش ہے۔ بلوری ساغروں کی کھنک اور آتش سیال کی دہک، یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے۔ آتش دانوں میں کوئلہ دہک رہا ہے، جس کے شعلے ابھرا بھر کر اس جہان رنگ و تعطر کو جھانکتے ہیں، لیکن سُرخئی غازہ اور ارغوانیت صہبا کے سامنے ماند پڑ کر آتش حسد سے جل بجھتے ہیں۔ کیف و سرور کی اس دنیا میں کسی کو کسی کا ہوش نہیں۔ اس لئے کہ یہ سب "انسان" ہیں، انہیں اس پر اختیار ہے کہ جب جی چاہے فطرت کے عطیہ عظمیٰ، امتیاز انسانیت، یعنی عقل و ہوش کو کھو دیں۔ لیکن جماد و نباتات کو یہ اختیار حاصل نہیں۔ پیقر کا کوئلہ اپنے فریضہ منصبی کی سر انجام دہی میں انتہائی جذب و انہماک سے سرگرم عمل ہے، وہ اس فضا کی ہوش رُبار نیکیوں سے متاثر نہیں۔ وہ اپنی گیس کو برابر فضا میں پھیلائے جا رہا ہے۔ دروازے کھڑکیاں، روشندان، سب بند ہیں۔ کمرے کی ہوا آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر مسموم ہوتی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ دم گھٹنے کی نوبت آپہنچی۔ ان میں سے جو دم ہوش و خود فراموش ہیں، انہیں تو فطرت کی یہ نندیر بھی نہیں چونکا سکی۔ لیکن جن میں ابھی کچھ ہوش باقی ہے، انہیں فضا کی سمیت کا احساس ہوا، کوئی بیتابانہ دروازے کی طرف لپکا، کوئی کھڑکی کی جانب بھاگا۔ اس وقت نہ ساقی کا خرام نازان کی راہ میں حائل ہوا، نہ نغمہ مطرب کی دلکشی دامن گیر۔ نہ کسی کو صراحی کے ٹوٹ جانے کی پرواہ ہے، نہ پیمانہ کے ٹڑھکنے کا احساس۔ اس وقت تمام تر توجہات دروازوں اور کھڑکیوں پر مرکوز ہیں۔ باہر کس قدر سردی ہے، اس کا بھی کسی کو خیال



نہیں۔ ہر ایک کی کوشش یہ ہے کہ کسی طرح وہ سب سے پہلے باہر نکل جائے۔ اس افراتفری میں چٹھنیاں بھی نہیں کھلتیں۔ اس نفسا نفسی میں ایک دوسرے کو روندنے اور مسلتے تک سے بھی گریز نہیں۔ یہ کیا ہوا، وہ محفل جو ابھی ایک ثانیہ پہلے عیش و طرب کی جنت دکھائی دے رہی تھی، کرب و الم کا جہنم کیوں بن گئی؟ کیف و سرور کے وہ جاں نواز نظارے جن کے متعلق جی چاہتا تھا کہ کسی ساحر کے ہاتھ کی ایک طلسمی جنبش سے ہمیشہ کے لئے اپنے اپنے مقام پر مہم جو کر رہ جائیں، تاکہ زمان و مکان کے حوادث ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ پیدا کر سکیں، انھیں خود اپنے ہاتھوں سے یوں پریشان کیوں کر دیا؟ اس لئے کہ خلافِ فطرت فضا کی کیف ہو ا میں سانس لینے سے جان پر بن گئی اور جان بچانے کے لئے پھر فطرت کی کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے ٹپ پیدا ہوئی۔ اپنے ہاتھوں سے بند کئے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں کو سہارا کر توڑنا پڑا۔ آئین فطرت کی خلاف ورزی کب تک کی جاسکتی تھی۔ بند کمرے میں کوئٹہ سگٹانے کا فطری نتیجہ تھا کہ دم گھٹنے لگ جائے۔

حذر لے چیرہ دستاں سخت میں فطرت کی تعزیریں

لیکن سانس کا مسئلہ تو انسان کی طبعی زندگی (PHISICAL LIFE) سے متعلق ہے۔ اس میں انسان اور حیوان سب برابر ہیں۔ جس کمرے میں ان تمام انسانوں نے اس طرح بھاگڑ مچائی وہاں ان کے ساتھ دو تین کتے بھی تھے انھوں نے بھی ان ہی کی طرح دروازوں سے ٹکریں ماریں۔ وہ بھی باہر نکلنے کے لئے ان ہی کی طرح، بلکہ ان سے

## انسان اور حیوان کی زندگی کا فرق

بھی زیادہ بے قرار و بیتاب تھے۔ لیکن کیا انسان اور کتے میں کوئی فرق نہیں؟ کیا دونوں کی زندگی بس یہی طبعی زندگی ہے؟ یہ تو غلط ہے۔ ابھی دم گھٹنے سے پہلے اس کمرے میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی کیف و مستی میں کتے کا کوئی حصہ نہ تھا، حالانکہ وہ بھی برابر کا شریک بزم تھا۔ سو ظاہر ہے کہ اس حصے کا تعلق زندگی کے کسی ایسے شعبے سے ہے جو حیوان اور انسان میں مشترک نہیں، بلکہ انسان کے لئے مختص ہے۔ اور اگر یہ انسان کے لئے مختص ہے تو لامحالہ اس کا اثر بھی (اچھا ہو یا بُرا) ”جوانی زندگی“ سے ماورا رہے۔ اور جب یہ کیفیت دنیائے لذت و طرب میں ہے تو ذمہ داریوں کی دنیا میں یہ اختصاص اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہ وہ اختصاص ہے جس کا تعلق ”انسانیت“ سے ہے۔ جس طرح طبعی زندگی کے لئے آئین و ضوابط متعین ہیں، اسی طرح دنیائے انسانیت کے لئے بھی دساتیر و قوانین مقرر ہیں۔ پھر جس طرح طبعی زندگی سے متعلق آئین و ضوابط کی خلاف ورزی سے مضر اثرات کا نمودار ہونا لازمی ہے، اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق قوانین سے سرکشی برتنے سے مضر رساں

نتائج کا مترتب ہونا تقاضائے فطرت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ طبعی زندگی سے متعلق اثرات کا احساس جلد اور بدیہی طور پر ہو جاتا ہے اور انسانی زندگی سے متعلق نتائج و عواقب کے لئے وقت بھی درکار ہوتا ہے اور دیدہ وری بھی۔ یہ اثرات سر کی آنکھوں کے بجائے دل کی آنکھوں سے جلدی اور متعین طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

اب ذرا کرزن روڈ کے مندرکہ صدر کمرے کی دیواروں کو پھیلانا شروع کیجئے۔ حتیٰ کہ یہ پھیلتے پھیلتے یورپ کے چاروں گوشے بن جائیں جو کچھ اس کمرے کے اندر ہو رہا تھا اس کا مجموعی نام تہذیبِ مغرب رکھ لیجئے۔ رنگِ چنگ کے سیلاب میں ڈوبے ہوئے مغرب کی نگاہیں حیوانی زندگی کے مقضیات **تہذیبِ مغرب** سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی تھیں۔ انھوں نے اشیائے فطرت کو مسخر کیا، لیکن کس لئے؟ صرف اس لئے کہ وہ ان کی حیوانی خواہشات کے برتنے کار لانے کا ذریعہ بن سکیں۔ وہ ساقی اور مطرب کی جلوہ ریزیوں اور عشوہ طرازیوں میں کچھ ایسے مدہوش ہوئے کہ انسانیت کے تقاضوں کی یاد ہی باقی نہ رہی۔ وہ اس طوفانِ کیف و مستی میں غرق تھے اور اس کا مطلقاً احساس نہ تھا کہ گرد و پیش کی فضا میں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن جنہیں اللہ نے دیدہ بینا عطا فرمایا تھا، ان کی نگاہیں کونلے کے اس مسموم گیس پر تھیں جو ہوا میں اس قدر کثافت پیدا کئے جا رہی تھی جس طرح ایک طبیبِ حاذق اسٹھیا کھانے والے کے انجام کے متعلق بہت پہلے آگاہ کر سکتا ہے، اسی طرح ایک مردِ مومن جسے اللہ تعالیٰ قرآنی بصیرت عطا فرمائے، قوموں کی روشِ زندگی سے ان کے مال کے متعلق اندازہ لگا لیتا ہے اور اس کے آئینہ ادراک میں وہ حوادثِ اپنی جھلک دکھا دیتے ہیں جو ابھی ضمیرِ فلک میں پہلو بدل رہے ہوں۔ اس لئے کہ جس طرح حیوانی زندگی سے متعلق فطرت کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں، اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق بھی اس کے دساتیر و ضوابط ناقابلِ تغیر ہیں۔ ولن تجد لسنة اللہ تبدیلاً۔ لہذا جس طرح ایک طبیبِ حاذق خواص الاستیاء کے علم کی بنا پر اس کا اندازہ لگا لیتا ہے کہ فلاں چیز کا طبعی نتیجہ کیا ہونا چاہیئے، اسی طرح ایک قرآنی مفکر اقوام و ملل کے امیال و عواطف کو قرآنی میزان میں رکھ کر پہچان لیتا ہے کہ ان کی فلاں روش انھیں کس منزل کی طرف لئے جا رہی ہے۔ ایک ایسا ہی مردِ مومن تھا جس نے اپنی فراستِ ایمانی سے آج سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ

لے ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ”مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے“ اللہ کا نور اس کی کتاب ہے۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو  
 اُسی کی بے تاب بھلیوں سے خطر میں ہے اسکا آشیانہ (اقبالؒ)  
 لیکن مادہ پرستی کے نشہ میں سرشار مغرب کو ہوش کہاں تھا کہ وہ ان تنبیہات پر کان دھرتا۔ وہ اپنی روش  
 میں مست رہا اور فضا کثیف سے کثیف تر ہوتی چلی گئی: ناآنکہ اس کی سمیت اس حد تک بڑھ گئی کہ اس میں دم  
 گھٹنے لگا۔ اور آج حالت یہ ہے کہ صرف یورپ ہی نہیں بلکہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں انسان اطمینان کا  
 سانس لے سکے۔

وَ اتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَ اعْلَمُوا  
 اَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ (۷/۲۵)

اور اس فتنہ سے بچتے رہو جو اگر اٹھا تو اس کی زد صرف ان ہی  
**عذابِ خداوندی** پر نہیں پڑے گی جو تم میں ظلم کرنے والے ہیں (بلکہ سبھی اس کی  
 پیٹ میں آجائیں گے) اور جان لو کہ اللہ کا قانون نتائج پیدا کرنے میں بڑا سخت گیر ہوا ہے۔

ان کے ساتھ دوسرے لوگ اس لئے زد میں آجاتے ہیں کہ ع

تائل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

اس زہر آلود تمدن کا سرچشمہ اگر یورپ تھا تو باقی دنیا بھی اس کی پرورش میں برابر کی مدد و معاون تھی۔ اس لئے  
 یورپ کی بھٹیوں سے ابھرنے والی آگ کے شعلوں کی پیٹ سے باقی دنیا کیسے محفوظ رہ سکتی؟ عذاب آیا اور اس  
 انداز سے کہ جو جو شکلیں ذہن انسانی میں متصور ہو سکتی تھیں سب آنکھوں کے سامنے آگئیں۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ  
 اَرْضِكُمْ اَوْ يَلْبَسَكُمْ سِتْرًا وَيَذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ط (۶/۶۵)

کہہ دو کہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے کوئی عذاب بھیج دے یا تمہارے پیروں تلے رینچے  
 سے کوئی عذاب پیدا کر دے۔ یا ایسا کرے کہ تم گرہ گرہ ہو کر آپس میں لڑ پڑو۔ اور ایک (گروہ)  
 دوسرے (گروہ) کی شدتِ قوت کا مزہ چکھے۔

غور فرمائیے! ان میں سے کونسی شکل ہے جو باقی رہ گئی ہے۔ آسمان سے عذاب زمین سے عذاب پانی میں  
 عذاب۔ ایک قوم دوسری قوم سے برسرِ پیکار۔ ایک ملک دوسرے ملک کے خون کا پیاسا۔ اور ایک دوسرے کی

شدتِ قوت کا شکار اور پھر ایسے ایسے مقامات سے عذاب جو اس سے بیشتر وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ کبھی کل تک آسٹریلیا اور بحر الکاہل کے دیگر جزائر محفوظ ترین مقامات خیال کئے جاتے تھے، لیکن آج یہ جگہیں سب سے زیادہ غیر محفوظ ہیں۔

فَأَتَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ۝ (۳۹/۲۵)

ان پر ایسے ایسے مقامات سے عذاب آیا جو ان کی عقل و شعور (اور

وہم و گمان میں بھی) نہ تھا۔

اس دم گھٹنے والی فضا میں جن اربابِ فکر کو کچھ ہوش باقی ہے، ان کے دل میں فطرت کی کھلی ہوئی سانس لینے کے لئے تڑپ پیدا ہوئی ہے۔ وہ ادھر ادھر دروازوں اور کھڑکیوں کی تلاش میں بیتا بانہ دوڑ رہے ہیں۔ ان ہی میں جریدہ اسٹینسین کے مدیر آرٹھر مور بھی ہیں۔ یہ صاحبِ قلم میدانِ صحافت و سیاست کے بالغ نظر شہسوار سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے سال گزشتہ متحارب ممالک کا دورہ کیا اور ان اسباب و علل کی تلاش میں سرگرداں رہے جو موجودہ خلفشار کا موجب ہیں۔ انھوں نے اپنی سمجھ کے مطابق ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنے اخبار میں

”ہماری موجودہ جنگ“

اخبار میں

کے عنوان سے ایک مسلسل مقالہ لکھنا شروع کیا، جو گزشتہ ماہ سے التراما شائع ہو رہا ہے۔ انھوں نے اس مقالہ میں زندگی کے موجودہ مسائل کو بے نقاب دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر چند یہ کوشش آرٹھر مور کا تبصرہ ایسی کامیاب نہیں، جیسی کہ ہونی چاہیے تھی (اس لئے کہ وہ حقائق کا مطالعہ تنہا عقل

کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں۔ علمِ خداوندی کی روشنی ان کے پاس نہیں۔ اور جب انسان کے پاس علمِ خداوندی کی روشنی نہ ہو تو اس کی حالت آسمان میں چمکنے والی بجلی کی روشنی میں چلنے والے کی سی ہوتی ہے کہ كَلَّمَآ أَصْنَآءَ لَهُمْ مَشَوْ فِيهِ قَا وَاِذَا آاَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۝ (۲۱/۲۰) جب فضا اس کی چمک سے روشن ہو جاتی ہے تو دو چار قدم چل لیتے ہیں اور جب اندھیرا اچھا جاتا ہے تو ٹھٹک کر رُک جاتے ہیں۔ بایں ہمہ مسٹر مور کی طلب جستجو اور تپش و غلش سے اتنا ضرور مترشح ہو رہا ہے کہ مغرب اپنے غیر فطری نظامِ زندگی کے باخفوں کس درجہ تنگ آچکا ہے اور نظامِ حیات کو آئینِ فطرت کے مطابق تشکیل کرنے کے لئے کس درجہ بیتاب ہے۔ مسٹر مور

لے وہ ممالک جو دوسری جنگِ عظیم میں اُلجھے ہوئے تھے۔

مختلف سیاسی نظریات و رجحانات کے تذکرہ کے بعد لکھتے ہیں کہ:-

”میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم ایک عالمگیر جنگ کی مصیبت میں مبتلا ہیں اور یہ وہ چاکِ داماں ہے جس کی تدبیرِ رُفوسے نہیں ہو سکتی۔ یہ آگ ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیل کر رہے گی۔ اور جب ہٹلر اور مسولینی ختم ہو جائیں گے تو ان کے بعد بھی صفحہ ارض کے ایک بڑے حصے پر اس

آگ کا سلسلہ جاری رہے گا۔۔۔ باہم خانہ جنگی یا مختلف طبقات کی لڑائی کی شکل میں۔۔۔ اس مصیبت کا حل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ آج ہٹلر کے انفرادی مقصد کے خلاف جنگ کر رہے ہیں ان میں خود ایک مشترکہ اجتماعی مقصد اور عقیدہ پیدا ہو جائے۔“ (۱۰ ستمبر ۱۹۴۱ء)

اس اجتماعی عقیدہ یا مقصد کی تصریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:-

”ساکنانِ ارض کو ہم اندازاً دو طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو کوئی نہ کوئی عقیدہ رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جن کا کوئی عقیدہ نہیں۔ وہ نظامِ جدید جسے ایک طرف ہٹلر اور دوسری طرف اشتراکین پیش کر رہے ہیں مستقبل کے متعلق ایک عقیدہ کی شکل لئے ہوئے ہے۔ ان کے نظامِ جدید یا عقیدہ میں ارتقار کا تصور ناگزیر ہے۔ لیکن کس قسم کا ارتقار؟ ایک اندھی قوت کا ارتقار ان کے ہاں عقل کو بڑا بلند درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن عقل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مادی تغلب اور اس کے لئے اجتماعی نظم و نسق پیدا کر دیتی ہے۔ یہ تو ان کی کیفیت ہے جن کے ہاں مقصدِ زندگی ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے برعکس دوسرے ممالک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ خدا کا عقیدہ رکھتے ہیں نہ ارتقار کا۔ وطن پرستی، فرضِ منصبی کا احساس، غصہ، نفرت یا محض مجبوری۔ ان کی قوتِ عمل کے محرکات میں..... ارتقار کی جدوجہد میں ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بندر سے انسان تک کی ارتقار کی کڑیاں تو تسلیم کر لیں گے لیکن یہ چیز ان کے تصور میں نہ آسکے گی کہ ارتقار کا سلسلہ لامتناہی ہے اور اسے انسان سے آگے بھی بڑھنا ہے۔“

(۱۰ ستمبر ۱۹۴۱ء، نومبر ۱۹۴۱ء)

یہ بے مسرّمور کے خیال کے مطابق دنیا کی موجودہ حالت۔ اب دیکھئے کہ وہ اس مصیبت کا حل کیا تجویز کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

”اس عالمگیر جنگ میں کامیابی حاصل کرنے اور ایک نظامِ جدید کو متماکن کرنے کے لئے مختلف مذاہب کے باہمی امتزاج سے ایک

**مصیبت کا حل**

جدید مذہب کی تشکیل ایسی ہی ضروری ہے جیسی آلات و سامانِ حرب کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنے کی۔  
(ایضاً)

مذہب کے امتزاج سے ان کی مراد یہ ہے کہ مختلف مذاہب کی صداقتوں کو حشو و زوائد سے پاک کر کے ایک ایسے مذہب کی تشکیل کی جائے جو حیوانی ارتقار کی بجائے لامہوتی ارتقار (DIVINE EVOLUTION) کا موجد ہو۔ وہ لکھتے ہیں :-

”ہم مذہبی ارتقار کے عقیدہ کا جواب لامہوتی عقیدہ سے دیں گے۔ بشرطیکہ یہ عقیدہ انسانیت کے مذہب کی حیثیت اختیار کر لے۔ ظاہر ہے کہ مذہب میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے۔ یعنی ان مختلف مذاہب، مثلاً عیسائیت، اسلام، ہندومت، بدھ مت، یہودیت وغیرہ میں۔“  
(ایضاً)

آپ سر دست مسٹر مور کی اس پریشانی فکر و نظر کا چنداں خیال نہ کیجئے جو ان کے تجویز کردہ علاج کے ایک ایک فقرہ سے نمایاں ہے۔ دیکھئے صرف یہ کہ حیوانیت کی زندگی کو فہمائے نگاہ سمجھنے والے خالص دہریت پسند مذہب گزیدہ، یورپ سے یہ کس قسم کی آواز اٹھ رہی ہے؟ اس کے بعد مسٹر آر تھر مور لکھتے ہیں :-  
بنیادی مشکل اس مسئلہ کے حل میں یہ ہے کہ کیا انسان ایک مختار بالارادہ ہستی ہے یا مجبور محض۔  
(ایضاً)

اس کے بعد تحریر ہے :-

دنیا کو آج اس چیز کی ضرورت ہے کہ اس سوال پر ارتقار کے مسئلہ نظریہ کی روشنی میں از سر نو غور کیا جائے۔

یہ غور و فکر کن خطوط پر ہونا چاہیئے۔ وہ اس کے متعلق رقمطراز ہیں :-

اس وقت جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اغلباً ہر ایک اس صداقت کو تبرکاً بطور یادگاد محفوظ رکھے ہوئے ہے جسے اس کے بانی نے سمجھا، لیکن یہ صدائیں زمانہ قدیم کے مذہبی معتقدات اور فروعات میں کچھ اس طرح گھڑ چکی ہیں کہ حقائق نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور وہ دورِ حاضرہ کے انسان کے لئے ناقابلِ اطمینان صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ہر ایک ملک میں روشن خیال طبقہ مذہب کو چیلنج دے رہا ہے۔ اور اس طرح مذہب

کی گرفت ہر جگہ ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نفس مذہب کو (نہ کہ اس مذہب اور اس مذہب کو) اس انداز میں پیش کیا جائے کہ انسان کی بصیرت اُسے تسلیم کر لے۔ مذہب پر ارتقار کے مسئلہ نظریہ کی روشنی میں از سر نو غور و فکر کی ضرورت ہے۔

(ایضاً ۱۱/۲۶)

اس کے بعد سر مور لکھتے ہیں کہ جامد مذہب نے (یعنی ایسے مذہب نے جو انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہ دے سکے) لوگوں میں بے حسی اور تعطل پیدا کر رکھا ہے۔ اس لئے اگر مذہب کو ارتقائی نظریہ کی روشنی میں پیش کیا جائے تو اس صورت میں۔

نسل انسانی کی تدریجی تکمیل اور زمین پر خدائی بادشاہت کا تصور ایک جوش انگیز امکانی شکل اختیار کر لے گا۔

(ایضاً)

اس کے بعد تحریر ہے:-

عروج و ارتقار (EVOLUTION) میں خدا کا تصور جامد نظریہ تقدیر اور ہر قسم کے تعطل اور بے حسی کا نقیض ہوگا۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اگر کسی طرح یہ معلوم کر سکیں کہ "خدا کی مرضی" کیا ہے تو اس کا علم ہمارے اندر سحر کھونک دے گا اور اس طرح ہماری مرضی خدا کی مرضی کا گویا عکس بن جائے گی اور ہم ایک جدید مفہوم میں ارتقار کے اس لائننا ہی ملکوتی ڈرامہ میں ایک با اختیار فعال ایگز کی حیثیت سے حصہ لے سکیں گے۔ (اسٹیشن ۲۶، نومبر ۱۹۴۱ء)

آج دنیا جس عدم اطمینان و فقدان سکون کے جہنم سے گزر رہی ہے اس کی علت بیان کرتے ہوئے

سر مور لکھتے ہیں:-

ایک ایسی دنیا جہاں مصنوعات نوع انسانی کی خدمت کی غرض سے نہیں بلکہ اس مقصد سے تیار کی جائیں کہ ان کی فروخت سے دوسروں کا روپیہ بٹورا جائے۔ دولت سب سے اہم مسئلہ بن جاتی ہے۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح روپیہ جمع کیا جائے، قوت اور حفاظت روپیہ کے اندر سمٹ کر آجاتی ہے۔ دولت کی ملکیت کامیابی کا نشان اور فخر و عزت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ آج کوئی پند و نصیحت اس جذبہ کو بدل نہیں سکتی..... اس کے لئے جو نبی ہمیں اس امر کا یقین ہو جائے کہ ہمارا موجودہ نظام معیشت ٹوٹ چکا ہے اور دوسرا

کوئی ایسا نظام موجود ہے جو اس کی جگہ لے سکتا ہے تو ہمیں اپنا موجودہ نظام بد بنا پڑے گا۔

(اسٹیشنرین، ۱۴/۲۸)

ان اقتباسات میں جہاں ایک طرف صاحب مضمون کی پریشانی، فکر و نظر، ان کی بیٹابنی، قلب کی غماز بن رہی ہے، دوسری طرف طلب و جستجو کی تڑپ بھی ایک ایک لفظ سے جھلک رہی ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ مسموم فضا کی کثیف ہوا سے دم گھٹ رہا ہے اور کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے دروازوں اور کھڑکیوں کی تلاش میں دیوانہ وار جدوجہد ہو رہی ہے۔ مسٹر مور نے جو کچھ اپنے مقالہ کی ان تین چار اقساط میں لکھا ہے، جن کے اقتباسات اوپر دیئے جا چکے ہیں، اس کا حاصل چند الفاظ میں یہ ہے کہ

(۱) دنیا کی موجودہ مشکلات و مصائب مغربی نظام تمدن کے ثمرات ہیں۔  
 (۲) وہ نظام تمدن جس میں منہائے نگاہ حیوانی مقتضیات زندگی سے آگے نہیں بڑھتا، جہاں انسان کو سلسلہ ارتقار کی آخری کڑی سمجھ کر مستقبل کی ذمہ داریوں سے آزاد کروایا جاتا ہے۔ اور جہاں کامیابی، قوت اور عزت کا معیار، دولت کا حصول و اکتنا ہے۔

(۳) ہٹلر اور مسولینی فقط اس غیر فطری نظام کے ماہر ہیں۔ اس لئے اگر انھیں مغلوب بھی کر لیا جائے تو بھی دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔

(۴) دنیا میں امن و سکون کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ایک جدید نظام تمدن و عمرانیت کی بنا ڈالی جائے۔  
 (۵) وہ نظام جدید جس میں

(۱) انسان کو سلسلہ ارتقار کی آخری کڑی نہ سمجھا جائے بلکہ اس سلسلہ کو لاتنا ہی خیال کیا جائے جس میں انسان کو اپنی تکمیل کے لئے عروج اور بندی کے کئی مراحل طے کرنے ہیں۔ یعنی ارتقائے انسانی کا نظریہ پیدا کیا جائے۔ اور

(ب) جس میں کامیابی، قوت اور عزت کا معیار، دولت نہ ہو بلکہ جذبہ خدمت ہو۔

(۶) اس نظام جدید کو بطور عالمگیر مذہب انسانیت پیش کیا جائے۔

لے جرمنی کی تحریک نازی ازم کا ڈکٹیٹر۔

لے اٹلی کی تحریک فاش ازم کا ڈکٹیٹر۔ یہ دونوں دوسری جنگ عظیم میں ختم ہو گئے تھے۔



- (۷) اس مذہب کی تشکیل کے لئے مختلف مذاہب کی صداقتوں کا امتزاج کیا جائے کیونکہ مذہب کے اصلی حقائق ازمینہ قدیم کی توہم پرستی اور فرعی مسائل میں چھپ چکے ہیں۔
- (۸) مذہب کا مقصد جمود و تعطل نہ ہو بلکہ وہ انسان میں قوتِ عمل پیدا کرنے کا ذریعہ ہو جس سے انسان عروج و ارتقار کے منازل طے کر سکے۔ نیز وہ بصیرتِ انسانی کو اپیل کر سکے۔
- (۹) انسانی جدوجہد کا حاصل یہ ہو کہ وہ کسی طرح مشیتِ خداوندی (خدا کی مرضی) معلوم کر سکے۔ اور پھر اپنی مرضی کو اس طرح خدا کی مرضی کے تابع کر دے کہ اس کی مرضی خدا کی مرضی بن جائے۔
- (۱۰) اس طرح اس زمین پر خدا کی بادشاہت کا قیام ہو سکتا ہے۔



خور فرمائیے! عہدِ حاضر کے نظامِ زندگی کے ستائے ہوئے انسان کو جس چشمہ سکون و راحت کی تلاش ہے۔ ہر چند وہ اس کا پتہ پریشان الفاظ اور بکھرے ہوئے نشانات سے دے رہا ہے، لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ وہ ٹھیک وہیں پہنچنا چاہتا ہے جہاں انسان کو قرآن پہنچاتا ہے۔ اسلام کے بنیادی خط و خال ہمارے سامنے ہیں۔ ان پر غور فرمائیے۔

**اسلام کے بنیادی خط و خال** | (۱) اسلام میں زندگی کی بنیاد عقیدہ توحید پر ہے جو ایک عبدِ مسلم کے فکر و نظر اور اعمال و احوال کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ توحید سے مفہوم یہ ہے کہ حاکمیت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ یعنی کسی انسان کو خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کا مجموعہ، دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وحدۃ خالق کے عقیدہ کا دوسرا فطری نتیجہ وحدتِ خلق ہے۔ یعنی یہ عقیدہ کہ دنیا میں تمام انسان ایک عالمگیر برادری ہیں۔ افراد ہیں۔ انھیں نسلوں یا قوموں میں تقسیم کر دینا، وحدتِ انسانیت کی جڑ کاٹ دینا ہے۔ اسی ایک عقیدہ سے وہ تمام اقتصادی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، عمرانی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں جو آج انسان کے گرد مار پیچاں کی طرح پلٹے ہوئے ہیں اور اس کی زندگی کو جہنم بنا رہے ہیں۔ آج ایک نسل دوسری نسل کے ساتھ برسرِ پیکار ہے ایک ملک دوسرے ملک خلاف فوج کشی کر رہا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ یہ سب اس لئے کہ وحدتِ خلق کے بجائے نوعِ انسانی کو غیر فطری حدود بندیوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہے۔ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کو کاٹ رہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ یہ اپنا ہی دست و بازو ہے کسی غیر کا نہیں۔ معدہ اس فکر میں ہے کہ جو خوراک اس میں جا پہنچی ہے اسے اپنی ہی چار دیواری میں محسوس کر لے۔ ادھر دل و جگر کی یہ کوشش ہے کہ خوراک کو معدہ تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔

بلکہ خلق سے نیچے اترتے ہی چھٹ لی جائے جس جسم کے نظام میں اس قسم کی نفسا نفسی پیدا ہو جائے اس کا انجام معلوم! (۲) پھر جیسا کہ ارتقا سے متعلق مضامین میں وضاحت سے بیان کیا جائے گا 'اسلام کے نزدیک موجودہ انسان سلسلہ ارتقا کی آخری کڑی نہیں بلکہ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا۔ اس سے پہلے صرف حیوانیت کا ارتقا تھا۔ اب انسانیت کا ارتقا شروع ہوگا۔ انسانیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس پیکر حیوانی میں صفات خداوندی کا کرشمہ نمودار ہوتا ہے۔ انسان جس قدر ان صفات کو نشوونما دیتا چلا جائے گا اسی قدر اس کی انسانیت مستحکم ہوتی جائے گی۔

(۳) اسلام بتاتا ہے کہ انسانیت کا نشوونما ارتقا زندگی کو ان قوانین کے ماتحت بسر کرنے سے ہوتا ہے جو خدا رب العالمین کی طرف سے ملے ہیں۔ ان قوانین کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ یہی حکومت الہیہ کا ضابطہ آئین ہے۔ فطرت کے دیگر قوانین کی طرح اس ضابطہ کے قوانین بھی غیر تبدیل اور ناقابل ترمیم و تنسیخ ہیں اور بلا لحاظ زمان و مکان تمام نوع انسانی کے لئے ہیں۔ ان اصولی ضوابط کی روشنی میں ہر زمانے کے اقتضات کے مطابق فرعی قوانین مرتب کئے جائیں گے اور اس طرح یہ نظام زندگی ایک جاہد اور ساکن مذہب کے بجائے انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے ساتھ ساتھ ہر مقام پر راہنمائی کرتا جائے گا۔ قرآن انسانی عقل و بصیرت کو اپیل کرتا ہے اور اس کے علم و شعور کی پرورش چاہتا ہے۔ اس لئے اس میں توہم پرستی یا اندھی تقلید کو کوئی دخل نہیں۔

(۴) اسلام چند افراد کا نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کا عروج و ارتقا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کا نظام زندگی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ اس کی ہیئت اجتماعیہ کامرکز خدا کی حاکمیت کا اقرار ہے جس جماعت میں یہ قرآن محسوس طور پر منبجھل ہوتا ہے۔ اس کا نام ملت اسلامیہ ہے جس کی شیرازہ بندی ختم نبوت کے عقیدہ سے وابستہ ہے۔ یعنی یہ ملت، ملت واحدہ ہوگی۔ مختلف پارٹیوں میں منقسم نہیں ہوگی۔ ختم نبوت کا عقیدہ انسانی عقل و شعور اور فکر و تدبیر کے نشوونما کا بھی حامل ہے۔ وحی کے ذریعے نظام زندگی کے اصول متعین ہو گئے۔ ان اصولوں کے ماتحت جزئیات کی تشکیل انسانی تفقہ و تدبیر کی رُو سے ہوگی۔

(۵) اسلامی ہیئت اجتماعیہ میں کامیابی قوت اور عزت کا مدار دولت نہیں بلکہ شرف انسانیت ہے۔ جس میں یہ شرف (استحکام خودی) زیادہ ہوگی وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہوگا۔ دولت اور قوت انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کی جائے گی، افراد یا کسی خاص گروہ کے استیلا و تغلب کا ذریعہ نہیں بن جائے گی۔ اس لئے اسلامی نظام زندگی میں اکنناز کی بھی اجازت نہیں۔ نہ ہی اس امر کی کہ دولت صرف بالائی طبقہ میں ہی گردش

کرتی رہے، نیچے کے طبقہ میں آئے ہی نہیں۔ قرآن کریم کی نصوص صریحہ ان امور پر دلالت کرتی ہیں۔  
 (۶) یہ ہیئت اجتماعیہ جس کی وسعتیں زمان و مکان کی حدود سے محصور نہیں ہوں گی، نظام انسانیت کو ضابطہ خداوندی کے مطابق چلانے کی ذمہ دار ہوگی اور اس طرح خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو جائے گی۔ انسان کو خدا کی مرضی "اس کے قوانین کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ سو جب انسان اپنی مرضی کو خدا کے قوانین کے تابع لے آئے تو اس کی مرضی عین خدا کی مرضی ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسان ایک طرف مختار بالارادہ اور دوسری طرف مجبور ہوگا۔ مجبور اس لئے کہ یہ اپنے آپ کو ایک آفاقی نظام کے اصولوں کے تابع رکھے گا۔ اور مختار اس لئے کہ یہ اپنے آپ کو ضابطہ خداوندی کے تابع اپنے فیصلے سے لائے گا۔ نیز اس لئے کہ اس جبر سے جو اختیار پیدا ہوگا وہ اسے اس قابل بنادے گا کہ تمام کائنات کو مسخر کر لے۔ استحکام خودی اور جوش کردار سے یہ اس مقام بلند پر پہنچے گا کہ خدا کے سوا کوئی اور قوت اس پر غالب نہ ہوگی۔

(۷) اس ہیئت اجتماعیہ میں ہر فرد اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھے گا اس لئے معاملات کی دنیا میں جاہ عدل و انصاف سے ادھر ادھر نہیں ہٹ سکے گا۔ یہ جواب وہی اس خدا کے سامنے ہوگی جو دل کی لغزشوں اور نگاہ کی خیانتوں تک سے واقف ہے۔ اس لئے خدا کے اس بندے کے اعمال و افعال حاضر و غائب یکساں ہوں گے کیونکہ تمام افعال قانون مکافاتِ عمل کے تابع رہیں گے۔ یہی جوابدہی سے مقصود ہے۔ اس نظام میں ہر شخص کو اس کا حق ملتا چلا جائے گا اور کوئی دوسرے کا محتاج نہیں ہوگا۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس  
 نکتہ شرع مہیں ایں است و بس (اقبال)



یہ ہے مختصر اودہ "مذہب" جس کی آج مسٹر آرنہمور اور ساری دنیا کو تلاش ہے لیکن مسٹر مور سچا ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ اس قسم کا مذہب مختلف مذاہب کے امتزاج سے پیدا کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ اسے اس قسم کا مذہب کہیں نظر نہیں آتا۔ آپ کہیں گے کہ جب اس قسم کا مذہب (اسلام) موجود ہے تو پھر مسٹر مور کو نظر کیوں نہیں آتا؟ لیکن میں پوچھنا ہوں کہ اسے اسلام نظر کہاں سے آئے؟ موجودہ مسلمانوں کی زندگی میں تو اسلام نظر نہیں آ سکتا۔ باقی رہے اس کے مآخذ، سودہ اندھی تقلید اور روایات کی چادروں میں اس طرح لپٹے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کے لئے بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اب اسلام نام ہے چند رسومات کا جن سے مدت ہوئی روح نکل چکی ہے۔ یا نام

ہے باہمی سرچھٹوئل کا، جس کا نتیجہ ہماری موجودہ زندگی ہے جس سے ہم خود مالاں ہیں۔ کہتے کہ یہ مذہب تسکین و عروج کے متلاشیوں کے لئے کس طرح جاذبِ نگاہ بن جائے؟ آج اسلام کے لئے دنیا بے قرار ہے، لیکن باللہجب، کہ تمام عالمِ اسلامی میں خدا کا ایک بندہ ایسا نہیں جو اسلام کو اس کے صحیح خط و خال میں دنیا کے سامنے ہمیشہ کر سکے۔ مسلمانوں میں جو لوگ مغرب کے کرب و دالم اور اس کے اسباب و علل سے واقف ہیں، وہ اسلام سے بیگانہ ہیں۔ اور جو مذہب کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں، ان بیچاروں کو اپنے آپ کی بھی خبر نہیں۔ اس لئے ظہر الفساد فی البرِّ و البحر (خشکی اور تری میں ہر جگہ فساد ہی فساد ہے) اب جو یانِ حقیقت تک اسلام کا پیغام کون پہنچائے؟ صدیوں کے بعد مبدار فیض کی کرم گسٹری سے ایک مرد و اتا پیدا ہوا تھا، جو ایمان و حکمت، ذکر و فکر، عشق و عقل، یعنی مشرق و مغرب کا مقامِ اتصال تھا۔ لیکن اسے دنیا کی بد قسمتی کہتے کہ وہ ابھی مغرب کو اس کے نظامِ تمدن کے انجام و عواقب سے آگاہ ہی کر رہا تھا کہ وہ دنیا سے چل بسا۔ اُس وقت چونکہ مغرب کے سامنے اس کے نظام کے اثرات محسوس طور پر بے نقاب نہیں ہوئے تھے، اس لئے اس مرد و اتا کی باتوں کو پرانے زمانے کے پسند و نصائح سمجھ کر ناں دیا گیا۔ آج جب وہ آتشِ فشاں پہاڑ پھٹا، اور سارا یورپ (بلکہ تمام دنیا) اس کی پیٹ میں آ گیا ہے، اگر وہ مفکرِ قرآنی زندہ ہوتا تو وہ اس پوزیشن میں تھا کہ مفکرینِ مغرب کو مخاطب کر کے اسلام کا پیغام دیتا، اور وہ اُس کی سننے بھی، اور سننے کے بعد اس پر غور بھی کرتے۔ اُس نے آج سے بہت پہلے یورپ کے نام پر پیغام بھیجا تھا۔

از من لے باد صبا گوئے بدانائے فرنگ	عقل تا بال کشتود است گرفتار تر است
برق را این بجگر می زنداں رام کند	عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگ گل و لاله نہ بیند ورنہ	آنچہ در پردہ رنگ است پدیدار تر است
عجب آل نیست کہ اعجاب از مسیحا واری	عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است
دانش اندوخته دل ز کف انداختہ	آہ ازال لفق گراں مایہ کہ در باختہ

عقل خود میں دگر و عقل جہاں ہیں دگر است      بالِ بیل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

دگر است آنکہ بردوانہ افتادہ ز خاک  
دگر است آنکہ زند سیر چمن مثل نسیم  
دگر است آنکہ دوشد بہ ضمیر گل و نسیم  
دگر است آنسوئے نہ پر وہ کشادن نظرے  
دگر است آنسوئے پردہ گمان وطن و تخمین دگر است  
لے خوش آن عقل کہ پہناتے دو عالم با دوست  
نور افرشتہ ز سوز دل آدم با دوست

اور اس کے بعد کہا ہے

وقت آن است کہ آئین دگر تازہ کنسیم  
روح دل پاک بشوئیم دگر تازہ کنسیم  
بہی آئین دگر ہے جسے آج ساری دنیا (NEW ORDER) کے نام سے پکار پکار کر ڈھونڈ رہی ہے۔  
اس آئین دگر کی وجہ ہوازیہ تھی کہ

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است  
زندگی در پئے تعمیر جہان دگر است

اُس وقت دنیا کی نگاہیں تہذیب نو کی ناپندگی سے خیرہ ہو رہی تھیں، اس لئے وہ جہان دگر کو کس طرح دیکھ  
سکتی تھیں؟ یہ جہان نو اسے نظر آسکتا تھا جس کی آنکھیں قرآنی فراست سے منور تھیں۔ اُس نے اس جہان کو دیکھا  
اور بر ملا کہہ دیا کہ

من دریں خاک کہن گو بر جہاں می بینم  
داندہ را کہ باغوشش زمین است، منور  
چشم ہر قرہ چو آنجسم نگران می بینم  
کوہ را مثل پر کاہ سبک می یابم  
شاخ در شاخ برومند و جواں می بینم  
انقلابے کہ ننگجد بہ ضمیر افلاک  
پر کاہے صفت کوہ گراں می بینم  
خرم آنکس کہ دریں گرد سوارے بیند  
بینم و بیچ ندانم کہ چہاں می بینم  
جو ہر نغمہ ز لرزیدن تارے بیند

یہ ہے وہ بصیرت و فراست جو قرآن کریم عبد مسلم کو عطا کرتا ہے۔ کس قدر حسرت انگیز ہے یہ تصور کہ اس مرد حق شناس  
کو عمر بھر یہ آرزو رہی کہ

اگر ہوتا وہ مجدد فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اُس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے  
لیکن آج پورے کاپورا جنوں کدہ فرنگ "مقام کبریا کی تلاش میں ہے لیکن وہ مرد مؤمن موجود نہیں، جو اسے بتا سکے کہ

مقام کبریا کیا ہے؟

ہاں ہمہ ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، خدائے حقیقہ کی زندہ و پائندہ کتاب دنیا میں موجود ہے۔ چونکہ یہ کتاب قیامت تک کے لئے نوحِ انسانی کا نصاب ہے، اس لئے اس نورِ بصیرت کے عام ہونے کی تدبیر ہو کر رہے گی، یہیں تو صرف اتنا افسوس ہے کہ مسلمانوں کے سامنے سعادت و خوش بختی کا ایسا نادر موقعہ آیا اور یہ اس سے یوں محروم رہ گئے، شاید ان کے جرائم کی یاد اش ایسی ہلکی نہیں جو اتنی جلدی ختم ہو جائے۔

لیکن ہم لاکھ خطا کار سہی، کیا اس کے سحابِ کرم کی گہر باری سے اتنی بھی امید نہ رکھیں کہ اس دانہ کو جو ہنوز آسمانِ زمین میں پیوست ہے، اپنی آنکھوں سے "شاخِ درشاخ و برومند و جوان" دیکھ لیں۔ وہ گرد جو آج ساری دنیا کے مطلع کو مکدر کئے ہوئے ہے چھٹ جائے اور اس کے اندر سے "سوارِ اشہبِ دوراں" جسے دیکھنے کے لئے آسمان کی آنکھیں ترس گئی ہیں، باہمہ جبروت و ملکوت، ہمارے سامنے وجہ شادابی عالم ہو جائے، اور ایک بار پھر اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھ جائے، لے وہ کہ جس کی رحمت تمام کائنات پر چھائی ہوئی ہے، کیا تیری درگاہ سے یہ فناک آنکھیں مایوس لوٹ آئیں گی؟

الہی تو توریتِ العلمین ہے!

لے اس سے مراد کوئی "آسمان سے آنے والا" نہیں، اس سے مراد قرآنی نظامِ ملت اور اس کا مرکز ہے۔  
۱۹۴۶ء میں، انہی حسین آرزوں کے تصدیق حاصل ہوا تھا۔

# جنگ؟

(ستمبر ۱۹۵۱ء)

انسان بھی ایک طرفہ تماشا ہے!

اسے عبادت گاہوں میں سر جھکائے دیکھو تو آسمان کے فرشتے اس کی شانِ عبودیت پر نثار ہوتے ہیں۔ اس کی خاک آلود پیشانی پر سطوت و ثروت کے ہزار طرے ہائے کہکشاں گیر قربان ہوتے ہیں۔ اس کے ذوقِ جہیں سائی پر جاہ و جلال کی لاکھوں غلغلہ اندازیاں، اور شوکت و حشمت کی کروڑوں طنطنہ خیزیاں تصدق ہوتی ہیں۔ اس کی جھکی ہوئی نگاہوں کے سامنے حوروں کی معصومیت ہیچ اور اس کے فطرتِ انفعال کے مقابل کوثر و تسنیم کی گہریاں ناقابلِ التفات ہیں۔ اس کا ایک ایک سجدہ زمین و آسمان کو وجد میں لاتا ہے، اور اس کے جذبہٴ تعبد و تذلل کی شانِ رعنائی پیکار پیکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ

ترے سنگِ در نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں

کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں مری جہیں نیاز میں

اور اگر اسے محبت کے حرمِ قدس میں دیکھو تو کسی کی یاد میں ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بلوریں کٹورے میں بھرتا ہے کہ وہ ظلمتِ کدہٴ عالم میں شمعِ کافوری کا کام دیں۔ آفتاب اس کی آتشیں پنہاں سے حرارتِ مستعار لیتا ہے کہ اس سے نبضِ ہستی میں تموج پیدا کرے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی تپش و خلش اور سوز و گداز سے اپنے اندر زندگی محسوس کرتا ہے اس کی آہِ سحر گاہی اور نازِ نیم شبی اس حقیقت کے آئینہ دار ہوتے ہیں کہ

عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات

عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات

اور اگر اسے حیرت خانہٴ علوم و فنون میں جلوہ بار دیکھو تو اس کا فکرِ فلک پیمایا زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں

تک کے راز فاش کرتا ہے۔ بہر وہ دستارہ سب اس کی کمند تخیل کے اسیر ہوتے ہیں۔ یہ زہر سے تریاق بناتا ہے۔ جو نوع انسانی کے ہلاکت انگیز ناسور کے لئے مرہم جاں بخش کا کام دیتا ہے۔ اس کے فنون لطیفہ کی اختراعات جیلہ اس عار و یابس مجلس آب و گل کو جذبات و احساسات کی حسین جنت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اس کی صنعتی گلکاریاں تہذیب و تمدن کے قصر بلند میں نور و نہکت کے سامان ارزاں کرتی ہیں۔ یہ ان نوادرات کی متاع گراں بہا کے پیش نظر خالق کائنات کے سامنے بجا طور پر فخر کرتا ہے کہ

توشب آفریدی پیراغ آفریدم      سفال آفریدی ایباغ آفریدم  
بیابان و کھسار و راغ آفریدی      خیابان و گلزار و باغ آفریدم  
من آغم کہ از سنگ آئینہ سازم  
من آغم کہ از زہر نوشینہ سازم

## لیٹن

یہی انسان جب جذبہ انتقام و ہوس خون آشامی سے مغلوب ہو کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف غم و غصہ میں بھرا ہوا اٹھتا ہے، تو عبودیت کا عجز و انکسار، محبت کا سوز و گداز اور علم و حکمت کا نور بصیرت، سب ایک ایک کر کے الگ ہو جاتے ہیں اور اسکی خوفناک سبعیت و بربریت، وحشی درندوں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ ایک آتش بار اژدھے کی طرح پھنکارتا اور ایک ہیبت ناک شیر کی طرح گرجتا اٹھتا ہے۔ اور تہذیب و تمدن، عقل و ہوش، علم و بصیرت، عدل و انصاف، رحم و کرم، غرضیکہ جو بہر انسانیت کی ایک ایک خصوصیت کو کچلتا، روندتا، طوفانِ بلا کی طرح آگے بڑھتا اور ایک بھیا ناک عفریت کی طرح اپنا آہنی پنجرہ استبداد فریقِ مقابل کے سینے میں گاڑ دیتا ہے اور اپنے دندانِ حرص و آزار اس کی رگِ جاں میں پیوست کر کے اس کے چشمہ حیات سے اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس غیظ و غضب کے عالم میں وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ وہ اپنی قوت کے نشہ میں اس قدر مست ہو جاتا ہے کہ کوئی معقول بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ دلیل و برہان کا جواب تیغ و سنان سے دینا چاہتا ہے۔ وہ باہمی افہام و تفہیم سے معاملات سلجھانے کی بجائے، فریقِ مقابل کو توپ و تفلنگ سے دھمکا کر اپنی بات منوانے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔ وہ کسی کے مشورہ کو خاطر میں نہیں لانا۔ کسی کی ناشی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کی ان حرکات پر عقل ہنستی ہے، خود ماتم کرتی ہے، شرافت شرماتی ہے، انسانیت مارے ندامت کے ڈوبتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اسے ان میں سے کسی کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ یا یوں کہیے کہ وہ جذبات، قوت کی بدستیوں کے نیچے اس طرح دب جاتے ہیں



جس طرح شراب کے نشہ سے انسان کے ہوش و حواس پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ (کہ خمر کے معنی ہی ڈھانپنے والی شے کے ہیں)۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسے انسان کو ان حالات میں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جو اس کے جی میں آئے کرے؟ ہمارا خیال ہے کہ دنیا کا بد سے بدتر انسان بھی یہ نہیں کہے گا کہ ہاں! ایسے انسان نمادِ ندے کو کھلا چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ نیکان ہستی میں اپنے فتنہ و فساد کی چنگاریاں پھینکتا پھرے اور اس طرح امنِ عالم اور فلاحِ انسانیت کو بھونک کر رکھ کا ڈھیر بنا دے۔ انسانی معاشرے کے آئین و ضوابط نے ایسے انسان کے لئے انتظام کر رکھا ہے۔ اگر وہ طبعی طور پر فائزِ العقل ہو چکا ہے تو اُسے پاگل خانے میں بھیج دیا جاتا ہے اور اگر اس کی عقل و خود ہی اُسے ان فساد انگیزیوں پر ابھارتی ہے تو اسے لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جاتا ہے تاکہ انسانیت اس کے دندانِ حرص و آزار ناخن جو رواستبہاد سے محفوظ رہ سکے۔ پولیس اور عدالت اسی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ایک فرد کے بجائے ایک قوم یا مملکت، اسی طرح عقلی توازن کھو بیٹھے اور اپنی حقیقی یا مزعومہ قوت کے نشہ میں کسی دوسری قوم یا مملکت کے جائز حقوق کو غصب کرنا چاہے، اور اسے جینے تک کا حق نہ دے تو اس کا کیا علاج کیا جائے؟

اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس سے وہ قوت چھین لی جائے جو اس کی ان بدستیوں اور فتنہ انگیزیوں کا باعث بن رہی ہے۔ لیکن قوت بغیر قوت کے چھینی نہیں جاسکتی۔ ان حالات میں قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ دونوں قوتوں کے اس تضادم کا نام جنگ ہے۔ تو ہمیں دونوں طرف میں۔ لیکن غور کیجئے کہ ایک قوت کس مقصد میں ضرور ہی ہے اور دوسری قوت کس مطلب کے لئے!

یہی ہے وہ مقام جہاں قرآن جنگ کی اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ حکم دیتا ہے۔



قرآن کے نزدیک انسانی زندگی بیش بہا مناع ہے جس کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ وہ اس حفاظت کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

..... مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ

جَمِيعًا \* (۵/۳۲)

جس نے کسی جان کو قتل کر ڈالا، بجز اس کے کہ اس سے مقصود قصاص لینا ہو، ملک میں فساد برپا کرنے والوں کو سزا دینا، تو یوں سمجھو گویا اُس نے تمام نوعِ انسانی کو قتل کر ڈالا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرتا کہ جب کوئی انسان یا انسانوں کا گروہ (جسے قوم یا مملکت کہا جاتا ہے) وحشت اور زندگی کے اس مقام تک جا پہنچے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اور اس کی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو نوع انسانی کی بہبود کلی کے لئے اس انسانیت کے مجرم انسان یا قوم کے خلاف قوت استعمال کرنا اسی طرح (طوعاً و کرہاً) ناگزیر ہو جاتا ہے جس طرح جب کسی انگلی کا ناسور یکسر لاعلاج ہو جائے اور اس کا زہر باقی حصّہ جسم کو بھی موت کی طرف لے جا رہا ہو، تو باقی جسم کو اس زہر سے بچانے کے لئے اس زہر آلود انگلی کو کاٹ کر الگ کر دینا نہ صرف جائز بلکہ جسم کی بہبود کلی کے لئے لاینفک ہو جاتا ہے۔ اگر اس وقت ایسا نہ کیا جائے تو کچھ وقت کے بعد پورے کا پورا جسم زہر آلود ہو کر قبر میں جا پہنچے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ انگلی بھی ختم ہو جائے گی جسے کاٹ کر الگ کیا گیا تھا۔ یعنی پہلے تو صرف ناکارہ انگلی ہی نے ختم ہونا تھا، لیکن اب انگلی کے ساتھ پورا جسم بھی تباہ ہو گیا۔

انسانی معاشرے کو اس قسم کے زہر سے متاثر کرنے کا نام 'قرآن کی اصطلاح میں' فتنہ و فساد ہے جسے وہ (انگلی اور جسم والی مثال کے مطابق) قتل سے بھی زیادہ نقصان رساں اور تباہ کن قرار دیتا ہے۔ اس لئے اس کا ارشاد ہے کہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ یعنی "فتنہ و فساد جنگ سے بھی زیادہ تباہ کن ہوتا ہے" لہذا وہ فتنہ و فساد کے استیصال کے لئے قوت کا استعمال ناگزیر سمجھتا ہے۔ یعنی فتنہ برپا کر دینے والی قوت کو زیر کرنے کے لئے قوت کا استعمال، تاکہ انسانی معاشرہ اس کی شرانگیزیوں سے محفوظ رہے۔ غور کیجئے، قرآن نے اس حقیقت کو کیسے جامع اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ قوت صرف اُس وقت تک استعمال کرنی چاہیے جب تک وہ شرانگیز اور فتنہ پرور قوت سپر انداز نہ ہو جائے۔ حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۱۶) "یہاں تک خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے" یعنی جس مقصد کے لئے یہ جنگ ناگزیر ہو گئی تھی وہ مقصد حاصل ہو جائے، اور انسانی معاشرہ سرکش قوتوں کی فساد انگیزیوں سے محفوظ ہو جائے۔ چونکہ اس تادیبی عمل میں کسی انتقام یا غصے کو دخل نہیں ہوتا، بلکہ یہ کارروائی ایک ڈاکٹر کے آپریشن کی سی ہوتی ہے، اس لئے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ جو نہی اس سرکش قوت کے متعلق دیکھو کہ وہ اپنی تہرمانیت و فرعونیت کو چھوڑ کر آمادہ تسلیم و رضا ہو رہی ہے، اُسے فوراً اپنے دامن عافیت میں لے لو۔ وَاِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا اس تادیبی کارروائی کے دوران میں بھی نگاہ اس مقصد کی طرف رہے جس کی خاطر یہ ناگزیر قدم اٹھایا گیا ہے۔ یعنی انہی قوت کی سرکشی کو درست کرنے کی طرف۔ اسی لئے نبی اکرمؐ ایسے مواقع پر ہمیشہ ناکید فرمایا کرتے تھے کہ کسی بوڑھے

کو بچے کو اور عورت کو قتل نہ کرو (الودادۃ) اسی طرح غیر محارب آبادی کو بھی ناحق تنگ کرنے کی بھی ممانعت فرمادی۔  
 الودادۃ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں کسی غزوہ میں حضورؐ کے ساتھ تھا۔ لشکریوں نے فریق مقابل کے پڑاؤ پر جا کر انھیں تنگ کیا، لوٹا، مارا۔ حضورؐ نے فوراً منادی کرادی کہ جو شخص غیر محارب آبادی کے گھروں میں گھس کر انھیں تنگ کرے یا لوٹ مار کرے اس کا جہاد قبول نہیں۔ اس طرح کی لوٹ کھسوٹ کا مال بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے۔  
 الودادۃ میں ایک انصاری کا بیان ہے کہ ہم حضورؐ کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے۔ لوگوں کو بھوک نے ستایا تو انھوں نے کچھ بکریاں لوٹ کر انھیں ذبح کر لیا اور گوشت کی ہانڈیاں چڑھا دیں۔ حضورؐ کو خبر ملی تو آپ تشریف لائے اور جو کمان ہاتھ میں تھی اُس سے سب ہانڈیاں اُلٹ دیں اور فرمایا کہ ٹوٹ کی چیز مزار سے بھی بڑھ کر حرام ہے۔ اسی طرح دشمن کے قاصدوں سے کبھی بدسلوکی نہیں کی جاتی تھی۔ اسیران جنگ سے اپنے مہمانوں کا ساسلوک کیا جاتا تھا۔ جب حضورؐ نے اسیران بدر کو صحابہؓ کے حوالے کیا ہے تو تاکید فرمادی کہ انھیں کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ صحابہؓ خود تو کھجوروں پر گزارا کرتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ اسیران جنگ کے علاوہ دشمن کا جو آدمی مسلمانوں سے پناہ طلب کر لے اُس کی پوری پوری حفاظت کی جاتی تھی۔ یہ اس لئے کہ جنگ سے مقصود انتقام جوئی یا ہوس خون آشامی یا جوع الارض کی تسکین نہ تھی، بلکہ انسانی معاشرے میں آئین عدل و احسان کا قیام تھا۔ اس حقیقت کو حضورؐ نے نہایت جامع الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ جب حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ کوئی شخص غنیمت کے لئے، کوئی نام کے لئے، کوئی اظہارِ شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے۔ کس کا جہاد راہِ خدا میں سمجھا جائے گا؟ حضورؐ نے فرمایا کہ من قاتل لتکون کلمۃ اللہ العلیا جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا قانون غالب رہے، اس کا لڑنا جہاد ہے۔ اسی کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَ یَکُوْنُ الَّذِیْنَ کَلَّمَهُ اللّٰهُ " تاکہ دین سب خدا کے لئے ہو جائے۔"

○  
 ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قوت کے استعمال کی نوبت اُس وقت آئے گی جب باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے، تصفیہ معاملات اور اصلاح حال کی تمام کوششیں ناکام رہ جائیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ جب دو افراد کے درمیان جھگڑا یا اختلاف ہو تو عدالت ایک حکم (ثالث) کی حیثیت سے فیصلہ دے دیتی ہے جس سے وہ جھگڑا طے ہو جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ جھگڑا یا اختلاف دو قوموں کے درمیان ہو تو اُس وقت کیا کیا جائے؟  
 قرآن نے اس ہنردرت کو بھی سامنے رکھ لیا تھا، اس لئے اس کا حل بتا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ دنیا میں

کسی ایسی جماعت کا وجود نہایت ضروری ہے جو تمام اقوامِ عالم کی نقل و حرکت اور اعمال و کردار کا محاسبہ کرتی رہے اور اختلافی مواقع پر باہمی طے شدہ آئین و ضوابط کے مطابق فیصلے کرے اور ان کی خلاف ورزی کے اقدامات کو روکے (تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ) قرآن نے اس جماعت کا نام اُمتِ مسلمہ رکھا تھا۔ یعنی دنیا میں امن و سلامتی کی ضمانت جماعت اور اس کی خصوصیت یہ بتائی تھی کہ وہ اپنے اس فریضہِ محاسبہ اعمالِ اُمم میں اس انداز سے جاہدِ حق و عدل پر قائم رہے گی کہ دنیا کی ہر قوم اس سے برابر کے فاصلے پر ہوگی۔ اس خصوصیت کی حامل قوم کو "اُمتِ وسطیٰ" کہتے ہیں۔ چنانچہ اس جماعت کو مخاطب

کرتے ہوئے قرآن نے کہا تھا کہ

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ  
الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳)

اس طرح ہم نے تمہیں "اُمتِ وسطیٰ" بنایا ہے تاکہ تمام نوعِ انسانی کے اعمال و کردار کے نگران رہو اور تمہارے اعمال و کردار کا نگران تمہارا مرکز نظامِ خداوندی ہو۔

ظاہر ہے کہ اس فریضہ کو سرانجام دینے والی جماعت کے پاس اتنی قوت ہونی چاہیے کہ وہ نہ صرف اپنے آپ ہی کو محفوظ و مصنون رکھ سکے بلکہ دیگر اقوام سے بھی اپنے فیصلوں کو منوا سکے جس عدالت کی پشت پر قوتِ نافذ نہ ہو اس کے فیصلے قانون کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے محض وعظ بن کر رہ جاتے ہیں۔ دین اور مذہب میں ہی فرق ہے۔ مسلمان صدیوں سے دین سے محروم ہو چکا ہے اور مذہب کے فریب میں مبتلا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نہ صرف یہ خود ہی نجبت و زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور دنیا کی ہر متغلب قوت کے سامنے سپر انداز ہے بلکہ اس کی وجہ سے دنیا "اُمتِ وسطیٰ" سے بھی محروم ہو چکی ہے جس کا فریضہ "شُھَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" (تمام نوعِ انسانی کی نگران) تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری دنیا فتنہ و فساد کا جہنم بن چکی ہے۔ سرکش اور میباک قوتیں جو چاہتی ہیں وہی ہوتا ہے اور کمزور کے لئے رونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا چونکہ دنیا میں اُمتِ وسطیٰ کا وجود نہیں رہا اس لئے شُھَدَاءَ عَلَى النَّاسِ کا فریضہ "کفنِ چوروں" کے سپرد ہو چکا ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ جہاں خدا کا قانون عمل پیرا نہیں ہوتا وہاں ابلیسی نظام کی بساط بچھ جاتی ہے کیونکہ

ظلامِ حال ہے فطرت کے کارخانے میں

یہ وجہ ہے کہ وہ اُمتِ جسے اُمتِ وسطیٰ بنانا تھا اپنے فریضہ کو فراموش کر کے نہ صرف اپنے جرائم ہی کی سزا

بھگت رہی ہے بلکہ دنیا بھر کے جرائم کی یاد اش میں بھی بالواسطہ شریک ہے۔ رات کو سو جانے والے چوکیدار کے نہ صرف پنے کپڑے ہی چوری ہو جاتے ہیں بلکہ وہ صبح اٹھ کر محلہ والوں سے پتا بھی ہے۔ لیکن اگر وہ صرف سویا ہوا ہی ہے، مزہ نہیں چکا، تو اس کی بھی اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ چوروں کی آہٹ پا کر اٹھ بیٹھے اور اس طرح اپنی متاع بھی محفوظ کر لے اور جن کی حفاظت اس کے سپرد تھی ان کی متاع حیات بھی محفوظ رہے۔ خدا کرے کہ ہم زمانے کے پھیٹروں سے جاگ اٹھیں اور ہمارے جاگنے سے چور بھاگ جائیں اور شریف انسان اطمینان کی نیند سو جائیں۔

# فردوسِ گم گشتہ

(اپریل ۱۹۴۱ء)

۲۲/۲۳ فروری ۱۹۴۱ء کو مجلس تاریخ و تمدن کی دعوت پر دارالعلوم علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ وقت بہت کم تھا اور مشاغل بہت زیادہ۔ بایں ہمہ ایک تیرتی ہوئی نگاہ سے جو کچھ وہاں دیکھ سکا اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ قوم کے نوجوانوں میں قرآن کریم کی طرف ایک خاص رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ اور اگر انہیں قرآن کی صحیح تعلیم سے روشناس کرا دیا جائے تو ان کے ساتھ بہت سی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ زیر نظر مقالہ طلباء اور حضراتِ اساتذہ کے اجتماع میں پڑھا گیا۔ (پرویز)

کائنات کی ہر شے ایک لگے بندھے قانون کے ماتحت سرگرم عمل ہے۔ چھوٹے چھوٹے ریت کے ذرے سے لے کر عظیم الشان کرۂ ارض تک۔ اس کرۂ سے کئی لاکھ گنا بڑا سورج مع اپنے مجیر العقول نظام کے۔ اور پھر اس نظام شمسی جیسے لاتعداد اور نظام اجرام سماوی، سب ایک متعینہ قاعدہ کے مطابق اپنے اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں ہیں۔ اگر زمین اپنے راستہ سے کبھی ایک انچہ بھی اُدھر اُدھر ہٹ جائے۔ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی بھی تبدیلی کر لے۔ اگر ہوا میں اپنے رخ کو طرفۃ العین کے لئے خلاف قاعدہ بدل لیں۔ اگر پانی اپنی فطرت کے خلاف نشیب کی بجائے فراز کی طرف بہنے لگ جائے۔ غرضیکہ اس مشینری کا کوئی ایک پُرزہ اپنے نظام سے سرتابی اختیار کر لے، تو یہ عظیم الشان کائنات ایک سیکنڈ میں درہم برہم ہو جائے اور یہ تھجرتیگز کار کہ حیات مٹی کا گھروندہ بن کر رہ جائے۔ زندگی اور اس کی تمام رنگینیاں، دنیا اور اس کی تمام ندرت آفرینیاں، محض اس بنا پر قائم ہیں کہ فطرت کی ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے۔ سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اس حیرت خانہ امروز و فردا کا ہر ایک پُرزہ اپنے دائرہ عمل میں پوری مستعدی سے سرگرم عمل ہے۔ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا

فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۖ هَرِثْتُمْ خُدَاكَ أَحْكَامَ كَسَا مَنِّ سَجْدَةٍ رِزْبَةً ۚ كُلُّ لَهٗ قَانُونٌ .

ذَرَّةٗ ذَرَّةٗ دَهْرًا كَا زَنْدَانِي تَقْدِيرِهِ

جب عالم موجودات کی ہر شے اس محکم اور غیر متبدل قانون پر عمل پیرا ہے تو کیا انسان جو اس خطہٴ ارض پر سلسلہٴ ارتقا کی آخری کڑی ہے جو نظم کائنات کا حسین مقطع ہے، وہ اس قانون سے مستثنیٰ ہوگا؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بزمِ سخن میں ہر شعر، عروض و قوافی کی حدود سے گھرا ہوا ہو، لیکن حاصلِ مشاعرہ ربط و ضبط کی ان پابندیوں سے آزاد ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ بیج سے لے کر کونپل تک درخت کا ایک ایک حصہ اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں قاعدے اور قانون کا پابند ہو، لیکن پھل ہر اصول سے بے نیاز ہو؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔

## قانون کی اطاعت

جب کائنات کی ہر شے ایک خاص بیج اور اسلوب کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے، تو انسان کے لئے بھی ضروری ہے کہ ایک خاص قانون کے مطابق زندگی بسر کرے۔ وہ قانونِ حیات جس کے مطابق انسان کے لئے زندگی بسر کرنا تقاضائے شرفِ انسانیت ہے، اسلام کہلاتا ہے۔

فَطَرَتِ اللَّهُ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ

الدِّينُ الْقَيِّمُ ۗ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۗ (۳۰/۳۰)

خدا کا وہ قانونِ تخلیق جس کے مطابق اُس نے نوعِ انسانی کو پیدا کیا، اللہ کی خلق میں کوئی

تبدیلی نہیں ہو سکتی، یہی دینِ محکم ہے، لیکن اکثر لوگ اس (حقیقت) کو نہیں جانتے۔

لیکن انسان اور فطرت کی دوسری چیزوں میں ایک تین فرق ہے۔ دیگر اشیائے فطرت اس قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جو ان کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ انہیں اس قانون کی تعمیل و عدم تعمیل میں کوئی اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ انہیں جو حکم دیا گیا ہے اس میں انہیں مجالِ سزناہی نہیں، یا رائے سرکشی نہیں، وَبَفَعْلَانٍ مَّا كَانُوا مَعْرُوفِينَ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ، لیکن برعکس اس کے انسان کو اس معاملہ میں اختیار و ارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اسے آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرے جو اس کے لئے متعین کیا گیا ہے، اور چاہے اس کی خلاف ورزی کرے۔

## انسانی اختیار و ارادہ

اسے زندگی کے دوراں پر کھڑا کر دیا گیا ہے جہاں نہایت جلی حروف میں سائن پوسٹ نصب ہیں، سامنے عقل و فکر اور شعور و ادراک کی شمعیں فروزاں ہیں، جن کی روشنی میں سائن پوسٹ پڑھ کر یہ دونوں راستوں میں تمیز کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اسے اختیار دے دیا گیا ہے کہ جس راہ پر چلے گا مزین ہو جائے۔ اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ

إِنَّمَا شَأْنُ كَرَأْدٍ (مَا كَفُورًا) اختیار و ارادہ کا یہی امتیاز ہے جس سے انسان دیگر مخلوق کائنات کے مقابلہ میں اشرافی و اعلیٰ ہے۔ یہی قوت تیز اس کی سرفرازی و سر بلندی کا باعث ہے۔ اسی سے یہ سجدِ ملائک و مخدومِ خلایق ہے۔ کشمکشِ حیات میں پُر کیف جاذبیتیں ہیں تو اسی سے اور کشاکشِ زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ بربطِ ہستی کے تاروں میں خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں تو اسی مضراب سے۔ اور جامِ زندگی کے ساوہ پانی میں کیفِ رنگ و لعطر کی ارغوانی موجیں اٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے۔ سینہ کائنات میں ایک دھڑکنے والا دل ہے تو اسی کے متوج سے، اور اس دل میں مچلنے والی آرزوؤں کی رسیلی جلیاں ہیں تو اسی کے تحریک سے۔ غرضیکہ انسان انسان ہے تو اسی کی بدولت۔ اور یہ دنیا، دنیا ہے تو اسی کے صدقے۔ اگر اختیار و ارادہ نہ ہوتا تو انسان پتھر کا بُت ہوتا۔ یا زیادہ سے زیادہ فرشتہ۔ سجدِ ملائک اور مسخر کائنات کبھی نہ ہوتا۔ قصہ آدم کا پہلا باب اسی اختیار و ارادہ کے مظاہر سے شروع ہوتا ہے جو معصیتِ آدم کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھتے ہوئے عمل میں آئے۔ اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود سرزد نہ ہو۔ نیاز مندی اُسی کی قابلِ ستائش ہے جو سراپا ناز ہو۔ اسی سر کے ٹھکنے میں لذت ہے جس کی پیشانی میں دنیا بھر کی سرفرازیاں جھلک رہی ہیں، جس میں انتقام کی قوت نہیں اس کے عفو میں کیا خوبی ہے۔ جس میں ہمسری کی ہمت نہیں اس کا جھک کر سلام کرنا خوئے غلامی ہے۔ جس کے پاؤں کے نیچے تختِ حکومت نہیں، اس کا بوریہ نشین ہونا گداگری ہے۔ اختیار میں جبر ہی وجہ شرفِ انسانیت ہے۔ اسی سے اس کی خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور استحکام خودی ہی انسانیت کی معراج ہے۔ لیکن اگر یہی اختیار و ارادہ آئین و ضوابط کے ساحلوں میں پابند نہ ہو جن کے اندر رہتے ہوئے زندگی بسر کرنا تقاضائے انسانیت ہے تو اس دیوبلے زنجیر کی حدود فراموش طوفانِ خیزیوں اور قیود نا آشنا سیلابِ انگیزیوں کا کیا ٹھکانا! بھلا سوچئے کہ جو انسان کائنات کی ہر شے کو تابع فرمان کر لینے کی امکانی قوتیں اپنے اندر رکھتا ہو اگر وہ اپنی قوتوں کو آزاد چھوڑ دے تو دنیا کن ہولناک بربادیوں کا عبرت انگیز مرقع نہ بن جائے گی؟

یہی وہ خلافتِ انسانیتِ آزادی تھی جس نے یورپ کے ان میدانوں کو جن کا ہر گوشہ دامنِ باغبان و کفِ گل فروش کا حسین نظارہ درآغوش تھا، آگ اور خون کا ایسا جہنم بنا دیا ہے، جس میں انسانیت تڑپتی، پھرکتی، جھلستی، بلبلائی، سکراتِ موت کی چکیاں لے رہی ہے۔ یہ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ

**یورپ کی سرکشی** | یورپ نے اختیار و ارادہ کو ابلیمانہ سرکشی تو سکھادی لیکن



## عقل کو تابع فرمانِ نظر نہ کرنے کا

جس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا  
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے کا  
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا  
زندگی کی شبِ تاریک سحر کرنے کا

یہ آئین و ضوابط جن کے ماتحت زندگی بسر کرنا باعثِ شرفِ انسانی ہے وحیِ خداوندی کے باہر کہیں نہیں مل سکتے۔ کہا جاسکتا ہے کہ جب یہ آئین و ضوابط انسانی ذات کی بالیدگی کا باعث ہیں تو انہیں کسی خارجی ذریعے سے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ انہیں خود انسان کے اندر ہی کیوں نہ رکھ دیا گیا؟ یہ درست ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان کا دل پتھر کا بنا ہوا نہیں جس پر کوئی خارجی شے اثر انداز نہ ہو سکے۔ جس چیز کو عام طور سے "انسانی فطرت" کہا جاتا ہے ذرا پوچھتے علمِ تجزیہ نفس (PSYCHO ANALYSIS) کے ماہرین سے کہ اس کی کیفیت کیا ہے اور یہ کن خارجی اثرات و رجحانات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ وراثت کے اثرات، ماحول کے اثرات، بچپن کی تعلیم و تربیت کے اثرات، قومی روایات کے اثرات، اور آگے بڑھتے تو ان اخلاط کے اثرات جن سے جسم انسانی ترکیب پاتا ہے۔ ان تمام اثرات کے بعد اندازہ فرمائیے کہ انسان کے اندر غیر ملوث آواز کہاں باقی رہ سکتی ہے۔ ان اثرات کا تو یہ عالم ہے کہ طبیعی ضروریات میں بھی "انسان کی فطرت" صحیح راہ نمائی نہیں کر سکتی۔ مثلاً بکری کا بچہ بھوکوں مر جائے گا لیکن کبھی گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گا۔ مرغی کے بچے پر ہزار آفت آرہی ہو وہ پناہ جوئی کے لئے پانی کے حوض کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھائے گا۔ لیکن انسان کا بچہ سنکھیا کے ٹکڑے کو بھی اسی طرح بلا تکلف منہ میں ڈال لے گا جس طرح شکر کی ڈلی کو وہ بلا تامل آگ میں ہاتھ ڈال دے گا۔ پانی کے حوض کی طرف لپک کر جائے گا۔ آپ کو قدم قدم پر اس کی حفاظت کرنی پڑے گی۔ سو جس متاثرہ "فطرت" کی آواز کا یہ عالم ہو کہ وہ حیوانی ضروریات میں بھی صحیح راہ نمائی نہ کر سکے اُسے انسانی ضروریات کے لئے کافی سمجھ لینا وہی نتائج پیدا کرے گا جو آج یورپ میں پیدا ہو رہے ہیں۔ انسان کی راہ نمائی صرف اس مقام سے ہو سکتی ہے جو ان تمام خارجی اثرات سے بلند و بالا ہو اور اس کا تعین وہی ذات کر سکتی ہے جو انسانی جذبات و رجحانات اور امیال و عواطف سے منزہ و متبرک ہو۔ یہ مقام، مقامِ وحی اور یہ ذات، ذاتِ خداوندی ہے۔ وہ ذات جسے انسانی

مقامِ وحی

لہ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ اس کے لئے دیکھئے "سلیم کے نام خطوط" جلد سوم۔ (پریز)

ذات کے خالق ہونے کی حیثیت سے خوب معلوم ہے کہ کس قسم کے آئین و ضوابط شرفِ انسانیت کی بالیدگی کے موجب ہیں اور کون سے اس کے خلاف۔ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ. اس لئے جب انسان کو اس عالمِ اثرات و جذبات میں بھیجا گیا۔ کشمکشِ حیات اس کے لئے مقدر کی گئی، تو ساتھ ہی یہ انتظام بھی کر دیا کہ اس کی صحیح راہ نمائی کے لئے اسے آسمانی ہدایت بھی ملتی رہے۔ اس کے بعد اس سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ اگر اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے رہو گے تو تمہیں کسی قسم کا خوف و خطر نہیں ہوگا۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ.

علاوہ ازیں انسان اور دیگر مخلوق کے اسلوبِ زندگی میں ایک نمایاں فرق اور بھی ہے۔ باقی مخلوق کی زندگی انفرادی ہے۔ ایک کے اعمال کا دوسرے پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ایک کو دوسرے سے کچھ لمبا چوڑا واسطہ نہیں ہوتا لیکن انسان مدنی بطبع واقع ہوا ہے۔ اسے مل جل کر زندگی بسر کرنا ہے۔ اس لئے انسانوں کے مقاصد مشترک ہیں۔ ان کے معاملات باہم گروہی ہوتے ہیں۔ یہاں ایک کے اعمال سے قوم کی قوم اثر پذیر ہو جاتی ہے۔ اگر ایک مستبد قوت برسرِ اقتدار آجائے تو کروڑوں انسانوں پر جہنم کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ان کے مقدرات کسی صاحبِ عدل و انصاف کے ہاتھ میں آجائیں تو یہی جہنم جنت سے بدل جاتی ہے۔ یہاں ایک بد اخلاق، دق کے جراثیم کی طرح پوری کی پوری سوسائٹی کو ہلاکت و بربادی کے ہیب غار میں دھکیل سکتا ہے اور ایک خوش اطوار، نرگس و لالہ کی طرح، ساری محفل کو جہاں رنگ و بو میں تبدیل کر سکتا ہے۔ یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہزاروں زبردست انسانوں کے خون کی رنگینی کسی ایک بالادست کے عشرت کدہ کی زیبائش و آرائش کے کام میں لائی جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک کی قوت بازو لاکھوں کی روزی کی کیفیل ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ایک کی ہوس بستم رانی سے ہزاروں بے گناہ سینے گویوں کا نشا بن جائیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک کی سپر لاکھوں مظلوموں کے لئے کاشانہ امن بن جائے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت انسانوں کے لئے صرف وہی ضابطہ حیات و جہان امن و سکون اور باعث کامیابی و کامرانی ہو سکتا ہے جس کا دائرہ عمل افراد تک محدود نہ ہو، بلکہ اس کے پیش نظر حیاتِ اجتماعیہ انسانیت کی اصلاح ہو۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ افراد کی اصلاح بھی اس لئے کرے کہ جو سوسائٹی ان کے مجموعہ سے متشکل ہوگی وہ از خود اصلاح یافتہ ہو جائے گی۔ وہ مختلف پُرزوں کا جائزہ لے اور ان کے نقائص کو دور کرے تاکہ جو مشین ان کے نظم و نسق اور تدوین و ترتیب سے تیار ہو وہ از خود اصلاح و اعلیٰ ہو۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب انسان کے راستہ میں اس قدر خارجی اثرات اور اتنی متخالف قوتیں حاصل ہیں، تو انسانوں کی ہدایت کے لئے محض ایک ضابطہ قوانین ہی کافی نہیں ہوگا۔ اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے قوت بھی درکار ہوگی۔ کیونکہ قانون بلا قوت نافذ ایک کتاب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تعزیرات ہند، ہندوستان کے اندر ایک زندہ قانون ہے اس لئے کہ اس کے پیچھے ایک قوت نافذ موجود ہے۔ لیکن یہی ضابطہ قوانین سرحد کے آزاد قبائل میں ایک عام کتاب سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ وہ علاقہ اس قوت نافذ کے احاطہ سے باہر ہے۔ اس لئے قانون وہی زندہ کہلا سکتا ہے جس کے ساتھ قوت نافذ بھی موجود ہو۔

عصا نہ ہو تو کلہی ہے کارِ بے بنیاد

لہذا جس خلاق فطرت نے انسانی رشد و ہدایت کے لئے ضابطہ قوانین عطا فرمایا اس نے یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ اس قانون کی تنفیذ و ترویج کے لئے قوت کی بھی ضرورت ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ  
النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ  
لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ (۵۷/۲۵)

یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ضابطہ قوانین (کتاب) اور  
میزانِ عدل نازل کی تاکہ نوعِ انسانی توازن پر قائم رہے اور ہم نے (ان چیزوں کی محافظت کے  
لئے) فولاد کی شمشیر بھی نازل کی جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے منفعت تاکہ اللہ  
یہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی فائزہ مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ صاحبِ قدرت  
و تدبیر ہے۔

اس ضابطہ قوانین کا نام ہے ہدایت خداوندی اور اس قوت نافذ کا حکومتِ الہی۔ اس ضابطہ حیاتِ اجتماعیہ کی  
کی رُو سے انسان دو جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ جو اس سوسائٹی کے ممبر بن جائیں جو دنیا میں  
قوانین خداوندی کے نفاذ کی ذمہ دار ہے۔ اور دوسرے وہ جو اُس کے ممبر نہ ہوں۔ آپ ایک سوسائٹی بناتے ہیں۔ اس  
کے قوانین و ضوابط مرتب کرتے ہیں۔ اب ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے قواعد و ضوابط  
دو جماعتیں | کا بغور مطالعہ کرے۔ اس کے بعد جی چاہے تو اس سوسائٹی کی ممبری (رکنیت) قبول کر لے

اور جی چاہے تو نہ کرے۔ اس پر کوئی جبر نہیں۔ لیکن جب آپ اُس کی رکنیت قبول کر لیتے ہیں تو اس کے بعد آپ پر لازم آجاتا ہے کہ اس سوسائٹی کے تمام قواعد و ضوابط کا اتباع کریں۔ آپ کو یہ اختیار کبھی نہیں دیا جاسکتا کہ جس قاعدے کا جی چاہے اتباع کریں اور جس کی جی چاہے مخالفت کریں۔ جب تک آپ اس سوسائٹی کے ممبر ہیں آپ کو تمام و کمال قواعد و ضوابط کی اطاعت کرنی ہوگی۔ اگر آپ ایسا نہیں کرنا چاہتے تو رکنیت سے مستعفی ہو جائیے۔ اب سب سے وہ جو اس سوسائٹی کے ممبر نہیں۔ سو اُن پر ان قواعد و ضوابط کا تمام و کمال اطلاق نہیں ہوگا۔ لیکن چونکہ یہ مجموعہ قوانین، حیاتِ اجتماعیہ انسانیت کی اصلاح کے لئے مرتب کیا گیا ہے اس لئے جن امور کا تعلق عام انسانیت سے ہے اُن سے متعلقہ قوانین کا اطلاق اُن پر بھی ہوگا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک سوسائٹی تب دق کی روک تھام کے لئے متشکل ہوتی ہے۔ کچھ قواعد و ضوابط تو ایسے ہوں گے جن کا اطلاق صرف اس سوسائٹی کے اراکین پر ہوگا۔ لیکن اس مرض سے متعلقہ امور کے حصہ قوانین کا اطلاق ممبر اور غیر ممبر دونوں پر ہوگا۔ دق کے جراثیم جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے اُن کے استیصال کے لئے ان ضوابط کے ماتحت ضروری کارروائی کی جائے گی اور ان قوانین

کا نفاذ کبھی جبر نہیں کہلائے گا۔ یہ ایسا ہی جبر ہے جیسا ایک ڈاکٹر کسی مریض پر اپریشن کرنے میں "زبردستی" کرتا ہے۔ اسے پھر کوئی صحیح العقل زبردستی

## قانون کا نفاذ

نہیں کہہ سکتا۔ اگر کسی اندھے کو کنوئیں میں گرنے سے روک لینا اُس پر زیادتی نہیں۔ کسی بچے کے ہاتھ سے بھجہ چا تو چھین لینا اس پر ظلم نہیں۔ کسی خودکشی کرنے والے کو گرفتار کر کے اُس سے اُس کے اس اختیار کو سلب کر لینا نا انصافی نہیں۔ تو مفاد پرست گروہ کی مسخ شدہ ذہنیت کو راہِ راست پر لانے کے لئے قوانین صحیحہ کا نفاذ بھی جو روتعدی نہیں کہلا سکتا۔ بالخصوص اس لئے کہ اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کے نتائج، قوانینِ طبیعی کی طرح ایسے محسوس اور بدیہی نہیں ہوتے کہ انسان اس سے از خود اجتناب کرنے لگ جائے۔ مثلاً انسان کی زندگی کا مدار سانس پر ہے۔ ذرا اس قاعدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے منہ اور ناک بند کر لیجئے۔ خود بخود کچھ میں آجائے گا کہ اس معصیت کو شکی کا نتیجہ کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو حالانکہ یہ بھی اسی طرح باعثِ ہلاکت ہے جس طرح سانس روک لینا، لیکن اس معصیت کا نتیجہ محسوس طور پر اس کے سامنے نہیں آتا۔ وہ اس سے کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ بایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ وہ محسوس کرے یا نہ کرے اس کا نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا۔ یہی وہ نتائج ہیں جن کا مجموعی اثر غیر محسوس طور پر انسان کی تمدنی، عمرانی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی، سیاسی غرضیکہ ہر شعبہ زندگی کو متاثر کر دیتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کی حیاتِ اجتماعیہ کو اسی قالب میں ڈھال

دیتا ہے۔ اس لئے تقاضائے عدل و انصاف یہی ہے کہ انسانوں کو اس معصیت کو شہی سے روکا جائے، جس کے اثرات اس قدر دُور رس اور عالمگیر ہوں۔ یہ انسان کے اختیارات کو کچل دینا نہیں ہوگا، فقط اُن کی تحدید ہوگی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نظامِ معاشرہ تحدید ہی سے قائم رہ سکتا ہے۔ اگر کسی کا پاؤں زہر آلود ہو جائے تو اس کی پنڈلی کو ایسا کس کر باندھ دیا جاتا ہے جس سے اوپر کا حصہ زہر کے اثر سے فی الجملہ محفوظ ہو جائے۔ اور اگر ڈاکٹر دیکھے کہ زہر کا اثر اس سے بھی نہیں رکتا اور اندیشہ ہے کہ اس سے رفتہ رفتہ باقی حصہ جسم بھی متاثر ہو جائیگا تو وہ جسمِ انسانی کے کئی مفاد کی خاطر پاؤں کاٹ ڈالتا ہے۔ یہی وہ تحدید و تادیب ہے جس سے حیاتِ اجتماعیہ انسانیہ خلافِ انسانیت اعمال کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ اور یہ تحدید اسی صورت میں ممکن ہے کہ قانون کے ساتھ قوتِ نافذہ بھی موجود ہو۔ اس قوتِ نافذہ کی اطاعت کسی غیر کی غلامی نہیں بلکہ نفسِ انسانی کے اعلیٰ ترین رجحانات کی اطاعت ہوگی۔ یہ کسی انسان کے سامنے جھکنے نہیں ہوگا جس سے انسانی خودی کا آئینہ چکنا چور ہو جاتا ہے، بلکہ قوانینِ الہیہ کی اطاعت ہوگی جس سے خودی کا استحکام ہوتا ہے۔

جبر و اطاعت کی اس لم کو پیش نظر رکھئے اور اس کے بعد دیکھئے کہ اصلاحِ انسانیت کا یہ نظام کس انداز سے قائم کیا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رشد و ہدایت کا سلسلہ قائم کیا تو اس کے ساتھ ہی یہ التزام بھی کر دیا کہ جس جماعت کے ہاتھوں اس کے قوانین کا نفاذ ہو، اسے خلافتِ قرآن اور قوتِ رضی سے بھی سرفراز کیا جائے تاکہ اس ضابطہِ الہی کو ایک زندہ قوت کی حیثیت حاصل ہو۔ یہ محض نظری مسائل کا مجموعہ بن کر نہ رہ جائے۔ قوتِ اس قانون کی محافظ ہو اور قانونِ خداوندی اس قوت پر ایسا ضبط اور (CONTROL) رکھے کہ یہ کہیں ناجائز استعمال نہ ہو سکے۔ قرآن اور قوت نہ صرف لازم و ملزوم ہیں بلکہ ایک دوسرے کے محافظ بھی۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند

کائناتِ زندگی را محور اند

اگر آپ قرآنی حقائق پر غور فرمائیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ خدائے جی و قیوم کا وہ ازلی پیغام جو حضراتِ انبیائے کرام کی وساطت سے دنیا میں آنا رہا، اس باب میں اس کا شروع سے ایک ہی اسلوب اور ایک ہی لم رہی۔ یعنی وہ ان عیوب و نقائص کو دُور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو انسانوں میں دولتِ قوت کی زیادتی اور ان کے غلط استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوسری طرف ضعیف و ناتواں لوگوں کو

اُبھار کر انسانیت کی بلند ترین سطح پر لاتے رہے اور اس کے ساتھ ہی انہیں ایسی حیات پر در تعلیم کی طرف متوجہ کرتے رہے جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں یہ عیوب پیدا نہ ہوں جو قوت کے غلط استعمال سے لازمی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ قوانینِ الہیہ سے مُنہ موڑنے والے انسانوں سے قوت چھین کر ان لوگوں کو دے دیتے تھے جو اس کا استعمال قوانینِ خداوندی کے مطابق کریں اور اس طرح دنیا میں نوعِ انسانی کی رُبوبیتِ عامہ کا نظام قائم ہو جائے۔ بس یہ ہے خلاصہ اس آسمانی تعلیم کا جو انسانوں کی ہدایت کے لئے زمین پر بھیجی جاتی رہی اور جس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ دنیا کی فلاح اور عاقبت کی سُرخروئی ہے۔ یہ میزانِ خداوندی کے دو پلڑے ہیں جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہیے۔ نظامِ انسانیت کی گاڑی کے دو پہیے ہیں جو ہمیشہ ہموار اور استوار ہونے چاہئیں۔ آزادیوں کی فضا کے بیٹے میں اُڑنے والے شاہین کے دو بازو ہیں کہ جن میں سے اگر ایک بھی مکڑ ہو گیا تو وہ زمین سے اُبھر نہیں سکتا اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی فضا میں وہ ہیں جہاں پہنچنے سے قدوسیوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں حضراتِ انبیاءِ کرام اور ائمہ سابقہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالئے یہ حقیقت اُبھر کر آپ کے سامنے آجائے گی۔ زیادہ نہیں تو ایک سورہ اعراف ہی کو دیکھئے۔ حضرت

**سابقہ انبیائے کرام** | نوح کے بعد جہاں حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام کے سلسلہٴ رشد و ہدایت کا ذکر ہے وہاں اُن کی اقوام کے متعلق بہ صراحت

موجود ہے کہ انہیں سطوت و اقتدار اور حکومت و قوت کی نعمتوں سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ سلسلہٴ انبیاءِ کرام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا گھرانہ خاص طور پر ممتاز ہے۔ اس مقدس گھرانہ کے متعلق صریحاً فرمایا کہ انہیں کتاب و حکمت کے ساتھ "ملکِ عظیم" بھی عطا فرمایا گیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے ممکن فی الارض کا حیات پروردگار نے احسن القصص کے تابندہ عنوان سے قرآنِ کریم کے صفحات پر جگہ گاتا نظر آتا ہے۔ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستانِ اسی قوت و حشمت اور ممکن و تسلط کی مسلسل تاریخ ہے۔ لیکن یہ تمام سلسلہ کچھ اس انداز سے جاری تھا کہ حضراتِ انبیائے کرام خاص وقت اور خاص اقوام کے لئے تشریف لاتے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کا پیغام یا تو بجلا دیا جاتا یا اس میں الحاق و تخریف کر دی جاتی۔ اس کے بعد پھر ایک نئے ایڈیشن کی ضرورت پیش آ جاتی۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا آتا کہ دنیا اپنے عہدِ شعور کو پہنچ گئی۔ انسانیت پر شباب آ گیا۔ اب وہ وقت تھا کہ انسانوں کو ایک مکمل ضابطہٴ حیات دے دیا جاتا جو ان کی قیامت تک کی ضروریات کے لئے کافی ہو جاتا اور اس ضابطہٴ قوانین کو محفوظ و مصون رکھا جاتا۔ یہ ضابطہٴ قوانین ملا اور اس کے ساتھ ہی

اس کی حامل جماعت کو ایسی سطوت و اقتدار کی زندگی عطا ہوئی جس کی مثال اہم سابقہ میں کہیں نہیں ملتی۔  
 قدوسیوں کی اس جماعت کے ہاتھوں، خدا کی حکومت کا تختِ اجلال اس زمین پر بچھایا گیا اور ان تمام  
**قرآن** بندشوں کے طوق و سلاسل توڑ دیئے گئے، جن کے نیچے انسانیت صدیوں سے دبی چلی آتی تھی۔  
 یہی مشیت کا انشاء تھا۔ یہی پیغامِ خداوندی کا مقصود تھا۔ یہی انسانیت کی معراج تھی۔ اس تکمیل  
 نعمت اور اتمامِ دین کے بعد نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبوت ختم ہو جانے کے بعد اس نظام کو آگے چلانے  
**رسول اللہ کے بعد** کی کیا صورت اختیار کی گئی جو اس سے پہلے حضراتِ انبیاء کرامؑ کی وساطت سے  
 چلایا جا رہا تھا۔ فرمایا۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (۳۵/۳۲)

پھر ہم نے اس کتاب کی وراثت کے لئے اپنے بندوں میں سے ایک جماعت کو منتخب کر لیا۔

اور وراثتِ کتاب کے ساتھ ساتھ انہیں حکومت و مملکت کا بھی وارث بنا دیا۔ سورۃ احزاب میں ہے کہ اس  
 نے تمہیں (حق کے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا۔ اور ان زمینوں کا بھی  
 جہاں ابھی تمہارے قدم نہ پہنچے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تصریح کر دی کہ یہ محض اتفاقی حادثہ نہ تھا  
 جس سے تمہیں شوکت و سطوت مل گئی بلکہ یہ ہمارا ٹھہرایا ہوا قانون ہے۔ سورۃ نور میں ہے کہ ”جو لوگ تم میں سے  
 ایمان لائیں اور اعمالِ صالح کریں اللہ نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں اس زمین کی حکومت عطا فرمائے گا جس  
 طرح ان سے پیشتر اس نے (ان شرائط کو پورا کرنے والوں کو) حکومت عطا فرمائی تھی۔ وہ ان کے اس دین کو جو  
 ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے، متمکن کر دے گا اور ان کا خوف، امن سے بدل دے گا، تاکہ وہ صرف اللہ ہی کے  
 محکوم ہوں اور اس کی حکومت میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔“ وراثتِ کتاب کی جماعت کا فریضہ حیات کیا  
 ہوگا؟ فرمایا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ

عَنِ الْمُنْكَرِ

”تم وہ بہترین قوم ہو جو نوحِ انسانی کے فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہو۔ تمہارا فریضہ زندگی یہ

ہے کہ تم قوانینِ الہیہ کا حکم عام کرو اور لوگوں کو اس کی خلاف ورزی سے روکو۔“



تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ اسلام کے تین عناصر تریکیبی لاینفک ہیں۔

اول۔ ضابطہ قوانینِ الہیہ

دوم۔ قوتِ نافذہ۔ اور

سوم۔ ان دونوں کی حامل جماعتِ مؤمنین یا حزبِ اللہ۔

اس قدسی دور کے بعد جس کا ذکر ابھی ابھی کیا جا چکا ہے، قوتِ نافذہ کس طرح پہلے مسخ اور پھر معدوم ہو گئی، یہ داستان بڑی الم انگیز ہے اور اس کا دہرانا بڑا دل خراش۔ لیکن قوتِ کاملہ جانا اتنا درد انگیز نہیں تھا جتنا قلب و دماغ سے حیاتِ اجتماعیہ کے اسلامی تختیل کا محو ہو جانا۔ آج جب حقیقت میں آنکھیں اس محدودی پر نگاہ ڈالتی ہیں تو فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہ پیکرِ اسلام کا یہ بنیادی عنصر کس طرح عجمی

تصویرات کے رنگین پردوں میں چھپ گیا جس کی وجہ سے اسلام

## حیاتِ انگیز انقلابِ معکوس

اپنے مقامِ بلند سے اتر کر عام انسانی مذاہب کی طرح انفرادی نجات اور ذاتی تزکیہ نفس کا ذریعہ بن کے رہ گیا، اور یوں مسلمانوں کے رگ و پے میں وہ رہبانیت عملاً سرایت کر گئی جس کے خلاف اسلام ایک کھلی ہوئی بغاوت تھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اسلام نفوس کا تزکیہ اور افراد کی اصلاح اس لئے چاہتا ہے کہ ان کے مجموعہ سے جو جماعت تیار ہو وہ از خود اصلاح یافتہ ہو۔ اس کے نزدیک ایک پُرزہ خواہ کتنا ہی پختہ اور درست کیوں نہ ہو، اگر کہیں اکیلا پڑا ہے تو اس کی کوئی قیمت نہیں، اس کی قیمت صرف اس وقت ہے جب وہ مشین میں اپنے صحیح مقام پر فٹ ہو اور اس کی ہر حرکت دوسرے پرزوں پر بائیں منط اثر انداز ہو کہ ان تمام پرزوں کی حرکت کا مجموعی نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آجائے۔ اگر آپ کتاب و سنت اور تاریخ و آثار پر نگاہ ڈالیں تو اس حقیقتِ باہرہ کے ثبوت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت ہی نہ پڑے کہ اسلام نام ہی جماعتی زندگی کا ہے۔ اجتماعی زندگی کے بغیر اسلام کا تصور ہی غلط ہے۔ لہذا ایک دیدہ بینا کے لئے خون کے آنسو رونے کا مقام وہ نہیں جہاں اسے مسلمانوں کی کٹی ہوئی عظمت اور چھپنی ہوئی شوکت یاد آئے۔ بلکہ وہ مقام ہے جہاں اُسے یہ نظر آئے کہ اسلام جیسا حیاتِ اجتماعیہ کا دین کس طرح محض انفرادی اصلاح کا نظریہ تصور کر لیا گیا۔





جب ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام نام ہی اجتماعی زندگی کا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن نامساعد حالات میں ہم گرفتار ہیں ان کے پیش نظر کیا ہم مایوس ہو جائیں اور سمجھ بیٹھیں کہ اب کوئی فرشتہ ہی آسمان سے اترے تو اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو سکے؟ یہ خیال بڑا غلط اور حقائق سے چٹم پوشی پر **پاس چہ باید کرد** بنی ہوگا۔ اسلام جن تین عناصر خصوصی سے مرکب ہے ان میں سے ایک اور سب سے اہم عنصر ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ یعنی ضابطہ خداوندی جسے قرآن کریم کہا جاتا ہے ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کے ساتھ اسی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے جس میں اُسے اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا تھا اس ضابطہ الہی کی موجودگی میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسری قومیں اس لئے گر کر نہ اُبھر سکیں کہ ان سے ہدایت خداوندی گم ہو چکی تھی۔ ہماری حالت ان سے اس باب میں مختلف ہے جس حالت میں ہم آج گرفتار ہیں قرآن کریم اس کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وراثتِ کتاب کی وہ آیہ جلیلہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پوری آیت یوں ہے:-

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ  
وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بإِذْنِ اللَّهِ (۳۲/۳۵)

پھر ہم نے وراثتِ کتاب کے لئے اپنے بندوں میں سے (ایک جماعت کو) منتخب کر لیا (ان کے تین مدارج ہو گئے) ایک اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ایک درمیانی روش والے اور ایک اللہ کے حکم سے نیکیوں میں سبقت کرنے والے۔

یہ ظالم لِنَفْسِهِ کا درجہ وہی ہے جس سے ہم آج گزر رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کیا وہ لوگ جو اپنے آپ پر ظلم کر لیتے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندہ درگاہ ہو جاتے ہیں؟ کیا وہ زندگی سے ابدی طور پر محروم کر دیئے جاتے ہیں؟ کیا ان کے لئے مایوسیوں کی ظلمت ناک گھٹاؤں میں اُمید کی کوئی کرن باقی نہیں رہتی؟ قرآن سے ان سوالات کا مایوس کن جواب نہیں ملتا۔ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اس جنتِ ارضی سے نکال دیئے گئے جو ایمان و اعمالِ صالح کا فطری نتیجہ تھی۔ اس کیفیت کو قرآن کریم قصہ آدم میں اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے۔ ”آدم“ اپنی لغزش کی وجہ سے جنت کے مقام بلند سے نیچے گر گیا۔ جب اُسے اس پستی کا احساس ہوا تو عرض کیا کہ:-

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ  
(۲۳/۷۷)

”اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اگر تو ہماری حفاظت کا سامان ہم نہیں پہنچائے گا تو ہم خاسر و نامراد رہ جائیں گے۔“

یہ وہی ”اپنے آپ پر ظلم کرنا“ ہے جس کا ذکر ابھی ابھی آیہ وراثت کتاب میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ ہاں! یہ چھنی ہوئی جنت دوبارہ مل سکتی ہے۔ اور اس کی بازیابی کا طریقہ یہ ہے کہ

فَاِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۲/۳۸﴾

”جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کا اتباع کرے گا اُسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔“

یہ ہدایت ہمارے پاس موجود ہے، اس لئے ہم اس جہنم کی پستی سے اُبھر کر پھر اسی جنت کی بلندی پر پہنچ سکتے ہیں جہاں سے ہم گرے تھے۔ آدم کی لغزش، ابلیس کی لغزش نہیں جس میں گر کر پھر اُبھرنا نہیں۔ ٹوٹ کر پھر بننا نہیں۔ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ لیکن

آخر گناہ گار ہیں کافر نہیں ہیں ہم

جب اہدیٰ مایوسی نہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کی کیا سبیل ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا جواب بھی کچھ مشکل نہیں۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے، ہماری نشاۃ ثانیہ کے دو اجزاء لاینفک ہیں۔ قرآن کریم سے تمسک اور جماعتی زندگی کے تحیق کا احیاء۔ قرآن کریم ہمارے پاس موجود ہے لیکن ہماری عملی زندگی میں اس کا حصہ اتنا ہی رہ گیا ہے کہ

از نسیین او آساں بمیری

حالانکہ خدائے زندہ کی یہ کتاب زندہ یکسر زندگی بخش ہے۔ ایسا ضابطہ قوانین ہے جس کا ایک ایک لفظ سر تا پا حق و یقین ہے وَ اِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ۔ جس میں کہیں کسی جگہ شک و شبہ اور قیاس و تخمین کی کوئی گنجائش۔ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ ایسا حق کہ باطل اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ حق کہتے ہی اُسے ہیں جو ثابت ہو، اٹل ہو، اُمٹ ہو، اپنی جگہ پر قائم ہو، حقیقت کے ہر معیار پر پورا اُترے، علم و بصیرت کی ہر کسوٹی پر کھرا ثابت ہو۔ اس کے برعکس باطل وہ ہے جو مٹ جانے والا ہو، جو باقی نہ رہ سکے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ حق ہے، باطل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ علم و دانش ہے، تو ہم پرسی کا اس میں کوئی شائبہ نہیں۔ کسی خاص قوم اور خاص عجمت

کی ہدایت کے لئے نہیں بلکہ نسلی، لسانی، طبقاتی، وطنی، قبائلی، غرضیکہ انسانوں کی خود ساختہ تمام حدود و قیود کو توڑ کر، تمام دنیا کے لئے یکساں طور پر آئین حیات ہے۔ عدالتِ خداوندی کے مہر پر آج قرآن کے علاوہ اور کوئی ضابطہ نہیں، جس کے مطابق اقوامِ عالم کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہوں۔ پھر جس طرح یہ صحیفہ خداوندی مکانی حدود سے بلند ہے، اسی طرح زمانی قیود سے بھی نا آشنا ہے۔ یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانے میں بھی یہ کہہ دے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی، اسی طرح قرآن کریم کبھی یہ کہہ نہیں کہے گا کہ میں اب میں تھک گیا، اب کسی اور راہبر کی تلاش کرو۔

صد جہان تازہ در آیاتِ اوست

عصر ہا پچھیدہ در آنا ت اوست

زمانہ، علم و عقل کی جن بلندیوں تک چاہے اڑتا چلا جائے، قرآن کریم اس سے بھی دس قدم آگے نظر آئے گا۔ اس لئے کہ یہ اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ اور جس کے علم سے کوئی شے باہر نہیں۔ نیز قرآن کریم محض چند نظری عقیدوں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ضابطہ قوانین ہے۔ مذہب، سیاست، تمدن، تہذیب، معاشرت، معاشیات، غرضیکہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق اس کے اندر اصول ہدایت ہو جو نہ ہوں۔ وہ اصول ہدایت جن پر عمل کر کے ایک اونٹ چرانے والی، کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارا کرنے والی، قوم دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف قیصر و کسریٰ کی دولت و سلطنت کی وارث بن گئی اور دوسری طرف دنیا کے جہاں داری و جہاں بانی میں مکارمِ اخلاق کے اس مقام بلند تک پہنچ گئی جسے چشمِ فلک نے ایک مرتبہ دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کے لئے آج تک سرگرداں ہے۔ قرآن کریم کے متعلق میں نے جو کچھ کہا ہے، محض خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں کہا۔ بلکہ بتوفیقِ ایزدی علیٰ وجہ البصیرت کہا ہے۔ آج کے مسلمان نے بہت کم سمجھا ہے کہ قرآن ہے کیا!

فانش گویم آنچه در دل مضمراست      این کتابے نیست چیزے دیگر است

چو بجاں در رفت جہاں دیگر شود      جہاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

لہذا آج ہمارے لئے سب سے پہلا مرحلہ قرآن کریم کو اپنی عملی زندگی میں راہنما بنانا ہے۔ اور دوسری چیز اجتماعی زندگی کا تخیل ہے۔ ان دونوں کے امتزاج (یعنی ایمان و اعمالِ صالح) کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ لیکن یہ کیفیت ایک دن میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ آدم کو دوبارہ جنت حاصل کرنے کے لئے جن تدریجی مراحل سے گزرنا

پڑا ہے۔ ان ہی منازل کو ہمیں بھی طے کرنا ہوگا۔ ہم پہلی ہی جست میں اس مقام بلند تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انقلاباتِ زمانہ کی برق رفتاری کو دیکھتے ہوئے جی یہی چاہتا ہے کہ ہم میں یہ تبدیلی کسی طرح آج ہی پیدا ہو جائے۔ ہم رات کو موجودہ حالت میں سوئیں اور صبح اُٹھیں تو ہمارے گرد و پیش عہدِ فاروقی کا ماحول گہرا ہو۔ یہ آرزوئیں بڑی مقدّس ہیں، لیکن ان کا تعلق عملی دنیا کے بجائے عالمِ تصور سے ہے۔ آپ کی بیٹائی متناہجا اور درست، لیکن عملی دنیا میں آپ کو ان تمام ارتقائی مدارج سے گزرنا ہوگا جن سے قطرہ کو گوہر بننے تک گزرنا پڑتا ہے۔ ہماری اصلاح کے ابتدائی مراحل ایسے غیر محسوس ہوں گے کہ بظاہر ان میں اصلاح کا شانہ بمشکل نظر آئے گا۔ لیکن اگر ہم یہ خیال کر کے کہ اصلاح تو وہی قابلِ اعتناء ہے جس میں پہلا قدم آخری زینہ پر ہو، زینہ چھوڑ کر بیٹھ جائیں، تو اس سے ہم اپنی موجودہ سطح سے ایک انچ بھی اوپر نہیں اُٹھ سکیں گے۔ لہذا آج جو قدم مسلمانوں میں انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی پیدا کرنے کے لئے اٹھے، اور جو آواز انہیں نظامِ قرآنی کی طرف دعوت دے، مبارک ہے۔ اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کا ساتھ دینا باعثِ سعادت۔ اور یوں ساتھ رہ کر اصلاح و ارشاد کے پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنا موجبِ رحمت۔ اگر آج مسلمانوں نے اس نقطہ کو سمجھ لیا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے تو رفتہ رفتہ ان کی لٹی ہوئی ٹردتیں، پھنی ہوئی دولتیں اور مٹی ہوئی عظمتیں ایک ایک کر کے ان سے ہم کنار ہو جائیں گی اور خاک کے ذرے پھر ایک دوسرے سے کہیں گے کہ

بخسبز کہ آدم را ہنگام نمود آمد  
 این مشیتِ خبارے را انجم بہ سجود آمد

لے یہ مقالہ اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب تحریکِ پاکستان کا ابتدائی دور تھا اور ہندوستان کے مسلمانوں میں اجتماعی زندگی کے احساس کو بیدار کرنا وقت کی اہم ضرورت۔ ویسے یہ ضرورت آج بھی کچھ کم نہیں۔

# ایمان بلا عمل

(جولائی ۱۹۴۱ء)

قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں بھی اپنے اندر عجیب سامانِ موعظت رکھتی ہیں۔ ان کے بڑھنے اور اُبھرنے کے زمانہ کو دیکھتے، نصب العین کی صداقت پر یقین محکم (ایمان) اور اس کے حصول کی خاطر تگ و تازِ مسلسل (عمل) زندگی کی ساری کہانی دو لفظوں میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ دلوں میں ولولے، خون میں حرارت، آنکھوں میں چمک، سارا ماحول زندگی سے بھرپور خاک کے ایک ایک ذرے میں نویدِ حیات درخشندہ، مصائب میں مسرت، مشکلات میں راحت، موت میں حیات کے سامانِ خوابیدہ! فتح و ظفر مندی پاؤں چومتی، سعادت و کامرانی رکاب تھامتی۔ اللہ کی نصرت کے فرشتے جلوں میں، منزل کی تابناکی شمع راہ، دل، یقین کی دولت سے معمور، قدم، لذتِ جاہدہ پیمائی سے محو خرام، غرضیکہ تمام عمر دریا کی طرح ایک مسلسل روانی، غیر منقطع جدوجہد یعنی ایمان و عمل کی زندہ تفسیر۔ یہ تھی مسلمانوں کے دورِ عروج کی ابتداء۔ نبی اکرمؐ سے دریافت کیا گیا کہ مسلمان کی زندگی کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ سارا فلسفہ ایک جملہ میں مرکوز۔ یہ سپاہیانہ دور، سَابِقُونَ بِالْخَيْرَاتِ (۳۵/۳۲) کا تھا۔

**مسلمانوں کی تاریخ** | یعنی حسن عمل میں آگے بڑھنے کا دور۔ اس کے بعد ایک درمیانی دور (مقتصدین کا) آیا۔ جو کچھ بزرگوں سے ترکہ میں ملا، اُس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ مجاہدانہ اعمالِ حیات کی طوفانِ انگیزیاں، درباری تکلفات کی بزمِ خیز یوں میں بدل گئیں۔ دینِ خداوندی کو تمام انسانی ضوابطِ زندگی (ادیانِ عالم) پر عملاً غالب دیکھنے کی بجائے، نظری مباحث اور منطقیانہ دلائل سے اس کی نوعیت و برتری ثابت کرنے ہی کو مقصدِ حیات سمجھ لیا۔ تو انہیں خداوندی جن کی تفسیر اعمالِ زندگی سے ہونی تھی،

حروف و نقوش کے پیکروں میں سجا کر رکھ دیئے گئے۔ رفتہ رفتہ قوائے عملیہ مفلوج ہو گئے۔ بہمتیں پست ہو گئیں، دلوں نے سرد پڑ گئے۔ بایں ہمہ اس دور میں بھی کہیں کہیں برسے ہوئے بادلوں میں بجلی کی چمک اور جلے ہوئے نیستاں میں تبسمِ شہد نظر آتا رہا۔ اس کے بعد تیسرا دور (ظالمین کا) آیا۔ دورِ عمل پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ باقی رہا ایمان، سو اس کے متعلق انھیں اسلاف سے کتابوں کے ذخائر ملے، جو نظری مسائل کے بیچ در بیچ مباحث سے بھری پڑی تھیں، اور یہ مسائل بھی یونان کے فلسفے اور عجم کے تصورات سے مستعار لئے گئے تھے۔ اب ان کے نزدیک ایمان چند الفاظ کو ایک خاص طریق سے دہرائینے کا نام رہ گیا۔ اور اعمال چند رسوم کی میکانکی انداز سے ادائیگی! حالانکہ ایمان سے مفہوم تھا اللہ تعالیٰ کے متعین فرمودہ نصب العین کی صداقت پر غیر متزلزل یقین اور اعمال سے مقصد اس نصب العین کے حصول کے لئے جدوجہد۔ لیکن اس آخری دور میں سارا دین سمٹ سمٹ کر چند الفاظ کی ادائیگی کا نام رہ گیا۔ اور چونکہ ضابطہ خداوندی میں نجات و سعادت ایمان سے مشروط تھی، اس لئے سمجھ لیا گیا کہ جو شخص ایک خاص انداز سے چند خاص الفاظ کو دہراوے گا، اس کی کامرانیوں اور شادمانیوں کا اللہ ذمہ دار ہو جائے گا، کیونکہ ایمان کے صدقہ میں سعادت و نصرت کا عطا ہونا فرمودہ خداوندی ہے۔ اس کے بعد یہ بحثیں چھڑیں کہ کیا اعمال کے بغیر خالی ایمان سے بھی نجات ہو سکتی ہے یا نہیں؟ حالانکہ اگر ایمان اور اعمال کا قرآنی مفہوم سامنے ہو تو اس بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ایمان، وہ جذبہ صادقہ ہے جو اعمال کا محرک ہوتا ہے۔ یہ وہ بیج ہے جس سے شجر حیات، شاخ طوبیٰ کی طرح بڑھتا، پھولتا اور پھلتا ہے۔ اس لئے جس بیج سے درخت پیدا نہیں ہوتا وہ بیج ناقص ہے۔

مردہ آلِ ایماں کہ ناید در عمل

قرآن کی رو سے جس طرح وہ اعمال زندگی، جن کی بنیادیں ایمان پر نہیں ہوتیں، ایسی بجلیاں بن جاتے ہیں جو انسانیت کے امن و سلامتی کے خرمینوں کو جلا کر رکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہیں، اس طرح وہ ایمان جو خالی ایمان و عمل | الفاظ کا مجموعہ سمجھ لیا جائے اور جس کی تصدیق اعمال حیات نہ کریں، برف کا ایسا تودہ بن جاتا ہے جو رگوں میں دوڑنے والے خونِ گرم کے ہر قطرہ کو منجمد کر کے رکھ دیتا ہے اس لئے فلاح و سعادت اس قسم کے ایمان سے کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ آج بدبختی سے مسلمانوں میں ایک طرف ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جس نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اصل مقصد عمل ہے۔ ایمان کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خیال ایسی کھلی ہوئی گمراہی پر مبنی ہے کہ اس کی تغلیط اور تکذیب کے لئے کسی زیادہ

کاوش کی ضرورت نہیں۔ لیکن دوسری طرف صدیوں سے یہ عقیدہ عام مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے کہ تنہا ایمان (یعنی چند الفاظ کا دہرا دینا) نجات کے لئے کافی ہے۔ ان کے نزدیک من قال لا اله الا الله فدخل الجنة کا مفہوم ہی یہ ہے کہ جس نے ان الفاظ کو زبان سے دہرا دیا جنت کا وارث بن گیا۔ قریب قریب تمام مسلمان کچھ اسی قسم کی خوش فہمی میں مگن ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس غلط عقیدہ نے انہیں کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ آج مسلمانوں پر جس قدر غربت و افلاس طاری ہے، یہ قوم محتاجی و بے کسی، ذلت اور رسوائیوں کے جن عمیق گڑھوں میں گر چکی ہے، نکتہ و افلاس کی ہولناک گھٹائیں ان پر چھائی جا رہی ہیں۔ ہلاکت و بربادی کے جو بے پناہ سیلاب ان کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں، ذلت و مسکنت کی جو شرر بار بجلیاں ان کے سر میں حمیت و غیرت اور عزت و ناموس کو جلاتے جا رہی ہیں، اگر بہ نگاہِ تعمق دیکھا جائے تو ان کا ذمہ دار ہی غلط عقیدہ ہے جو ان کی جڑوں کو کھن کی طرح کھوکھلا کر گیا ہے اور جس نے انہیں کہیں کا نہیں رہنے دیا۔ بنی اسرائیل کی طرح ان کا بھی ایمان ہے کہ ہم خدا کے چینیئے بیٹے ہیں۔ یہ بھی ان کی طرح ہی سمجھتے ہیں کہ ہم بہر حال جنت میں جائیں گے خواہ ہم کچھ ہی کیوں نہ کریں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ قوم بھی خدا کی اس م غضوب و معتوب قوم کی طرح ضریبت علیہم الذلۃ و المسکنۃ کے عذاب الیم میں گرفتار ہے، لیکن نہیں سمجھتی۔ عا د و ثمود کی طرح بتدیر کج اتہا ہیوں اور بربادیوں کے جہنم کی طرف کھینچی چلی جا رہی ہے، لیکن نہیں محسوس کرتی۔ قوم لوط اور اصحابِ ایکہ کی طرح ان کی شوکت و عظمت کے تختے اُلٹ چکے ہیں، ان کی تہذیب و تمدن کی فلک لوس عمارتیں کھنڈرات بن چکی ہیں، جو ہر صاحبِ بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ فریب خوردہ قوم دل رکھتی ہے اور اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتی۔ آنکھیں رکھتی اور دیکھتی نہیں۔ کان رکھتی ہے مگر سنتی نہیں۔ اسے زمانہ کے پھیرے جھنجھوڑتے ہیں۔ لیکن انہیں خواب اور لوریاں سمجھ کر اور گہری نیند میں چلی جا رہی ہے، دنیا علم و عمل میں ترقی کرتے کرتے آسمانوں کو چھو آنے کی ٹھانے بیٹھی ہے۔ لیکن یہ اول تو ان کی طرف دیکھتے ہی نہیں۔ اور اگر کبھی کبھار چشمِ نیم باز سے دیکھتے ہیں تو ایک حقارت آمیز تبسم سے اتنا کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہاں! اس چند روزہ متاعِ حیات سے فائدہ اٹھا لو، اس کے بعد دنیا میں کبھی ہمیں غالب رہنے والے ہیں اور آخرت تو بالکل ہے ہی ہماری۔

پھر قیامت یہ ہے کہ یہ عقیدہ جہلا تک ہی محدود نہیں، بلکہ ان کے واعظ اور عالم روز بروز اس عقیدہ کو پختہ تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک جید "مولوی" صاحب اکثر وعظ میں فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانو! کون کہتا ہے کہ گناہ نہ کرو۔ خوب کرو۔ جی بھر کر کرو۔ لیکن ایک درود شریف اول اور ایک درود شریف آخر پڑھ لو مَسْرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ۔ اللہ کی رحمت کے یہ دو سمندر موجیں مارتے ہوئے ان کو بہا کر لے جائیں گے۔ حتیٰ کہ ابوالکلام آزاد جیسا شخص اپنی تفسیر میں یہ وضعی حدیث نقل کرتا ہے کہ

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْلَمْ تَذُنُّوْا الذَّهَبَ اِللّٰهُ بِكُمْ وَلِجَارِ بِقَوْمِ

يَذُنُّوْنَ فَيَسْتَغْفِرُوْنَ۔ (مسلم عن ابی ہریرہ)

رسول اللہ نے فرمایا! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ

تم سے سرزد ہی نہ ہو، تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے اور تمہاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کر دے

جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلبگاری کرے۔

(ترجمان القرآن، جلد اول، صفحہ ۱۰۹، مطبوعہ زمزم پبلیشرز)

یہ اس قوم کے اجبار اور مہمان کے مواعظِ حسنہ میں جن کے خدا کا فیصلہ ہے کہ

مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

شَرًّا يَرَهُ (۹۹/۸)

جو شخص رانی کے ذرے کے برابر نیکی کرے گا وہ بھی اس کے سامنے آجائے گی۔ اور جو رانی کے

ذرے کے برابر بُرائی کرے گا وہ بھی اس کے سامنے آجائے گی۔

قرآن کریم کے کسی صفحہ پر نگاہ ڈالنے، نجات و سعادت اور فلاح و بہبود کے لئے

ایمان بلا عمل جہاں اٰمَنُوْا اٰیٰتِہٖ اَسْمٰوٰتِہٖ اَلصّٰلِحٰتِہٖی موجود ہے۔ پھر سبھ

میں نہیں آتا کہ اگر صرف دوسرے ٹکڑے کو ماننے والے یٰؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَ یُکْفِرُوْنَ بِبَعْضِہٖ

قرآن کریم کے ایک حصّہ پر ایمان لانے اور دوسرے پر ایمان نہ لانے کے جرم کے مرتکب قرار دیئے جاتے ہیں تو

دوسرے ٹکڑے کو چھوڑ کر صرف پہلے ٹکڑے پر ایمان لانے والے اس جرم سے کس طرح بچ سکتے ہیں؛ حالانکہ

قرآن کریم کا صاف صاف فیصلہ موجود ہے۔

اَحْسَبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ ۝ (۲۹/۲)



کیا لوگ یہ گمان کئے بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دینے جائیں گے اور ان پر کوئی آزمائش نہیں ڈالی جائے گی۔

دوسری جگہ ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ۝ (۳/۱۴۱)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ اللہ ابھی تک اس بات کو ابھار کر سامنے نہیں لایا کہ تم میں سے کون جہاد کرتا ہے اور ثابت قدم ہے۔

کیا آپ نے سورہ توبہ میں نہیں دیکھا کہ جب منافق اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتے تھے تو ان کے ایمان کی شناخت کے لئے کونسا معیار مقرر کیا گیا تھا؟ یہی کہ

قُلْ أَعْمَلُوا فَسَيَرَهُ اللَّهُ وَعَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ (۹/۱۰۵)

ان سے کہہ دو کہ ان کچھ کر کے دکھاؤ تاکہ تمہارے اعمال، لو خدا اس کا رسول اور مومنین دیکھیں۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ سورہ انعام میں ہے کہ جب خدا کا عذاب سامنے آجائے گا تو اس وقت نہ تو اس شخص کو نفع پہنچے گا جو عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے گا اور نہ ہی اُس شخص کو جس نے ایمان کے ساتھ نیک عمل نہ کیا ہوگا۔ اَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا (۶/۱۵۹) سمجھ نہیں آتا کہ ان سے زیادہ اور کون سے واضح الفاظ ہو سکتے ہیں جن میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا جاتا؟ یاد رکھئے جس ایمان کے ساتھ اعمال شامل نہ ہوں گے وہ ایمان کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے محبوب ہیں، اس واسطے کہ ہم ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن جس کے تم محبوب بنتے ہو، وہ تو اعلانیہ کہہ رہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ وہ ایک مسلم کا اس کے اعمال کی وجہ سے ”دوست“ ہے نہ کہ اس کے زبانی دعووں کی بنا پر۔

وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۶/۱۲۸)

اللہ ان کا دوست ہے، بوجہ ان کے اعمال کے۔

کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بُرے اعمال کی سزائیں تجویز کی ہیں وہاں مسلم اور غیر مسلم مومن و کافر میں کوئی تمیز کوئی تفریق نہیں کی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ

لَيْسَ بِأَمَانَتِكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا

بُحْرَانِ يَه ۶ (۳/۱۲۳)

نہ تہاری آرزوؤں کے مطابق ہو گا نہ اہل کتاب کی، جو بھی بڑا کام کرے گا اس کی سزا پائے گا۔

کے ہاں بڑا جو بھی بڑائی کرے گا اُس کے جرم اُسے گھیر لیں گے، وہ جہنم میں جائے گا اور وہیں رہے گا (۲/۸۱)۔  
مثلاً حکم دیا جاتا ہے کہ ایمان والو سود نہ کھانا، اللہ سے ڈرتے رہنا، تاکہ تم تقویٰ شعار بن سکو، لیکن اگر تم اس حکم کی خلاف ورزی کرو گے تو اُس آگ سے ڈرو جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے۔

وَالْفُؤَادَ النَّارِ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ

اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ کے ٹکڑے پر نگاہ ڈالنے، خطاب یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا سے تھا، ظاہر ہے کہ ایک مسلمان سود خوار، ایمان کا مدعی ہے، لیکن جب اُسے اُس کے جرم کی سزا میں جہنم رسید کیا جاتا ہے تو وہ جہنم کوئی الگ نہیں، وہی ہے جو کافرین کے لئے تیار کی گئی ہے، فرمائیے اس شخص کے دعویٰ ایمان نے اس میں کیا امتیاز پیدا کر دیا؟ اس سے بھی آگے بڑھتے! بدر کا میدان ہے، مسلمانوں کی گُل کائنات میں سو تیرہ نفوس، کچھ ہاجرین، کچھ انصار، گھر بار، بیوی بچے، عزیز و اقارب، مال و دولت، سب کچھ چھوڑ کر ہتھیلیوں پر سر لئے خدا کے راستے میں جان جیسی گراں بہا چیز قربان کر دینے کے لئے تیار ہیں، یہ وہ ایمان والے ہیں جنہیں اَلْسَابِقُونَ اَلْاَوَّلُونَ کہا گیا ہے، وہ ہیں جن کے متعلق رسول خدا نے ابھی ابھی دعائیں فرمایا

**بدر کا میدان**

ہے کہ اے اللہ یہ تمہیں بھر جماعت تیری نام لیوا، تیرے نام کی حفاظت کے لئے، جانیں قربان کرنے کے لئے، میدان میں آتی ہے، اگر یہ مٹ گئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔ فرمائیے، ان کے ایمان میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ لیکن اسی مقام پر ان کا خدا ان سے کہتا ہے کہ یاد رکھو جو آج کے دن میدان جنگ سے منہ موڑے گا، سوائے اس کے کہ وہ لڑائی کے لئے پینتر بدلے یا اپنی جماعت سے ملنے کی خاطر پہلو بدلے، تو وہ خدا کے غضب کا مستوجب ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہو گا، اور یہ بڑی جگہ ہے رہنے کی (۸/۱۶)۔

زبانی اقرار پر جنت میں جانے کے متمنی ذرا آنکھیں کھول کر اس ارشادِ مقدسہ کو دیکھیں! جہاد تو عمل کی آخری منزل ہے، جو لوگ ایمان لائے تھے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی تھی، ان کے متعلق سنئے کہ فیصلہ کیا ہے۔

اور جو لوگ ایمان لائے، لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی، تو جب تک یہ لوگ ہجرت نہ کر آئیں

ان کے ساتھ مسلمانوں کا دستاورد تعلق نہیں ہوگا۔ (۸/۷۲)

دیکھتے ان لوگوں کے ایمان کی شہادت تو خود خدا سے رہا ہے کیونکہ انہیں وَالَّذِينَ آمَنُوا کہہ کر پکارا ہے لیکن یہ صرف ایمان کے دعویٰ دار ہیں۔ اصلی مومن اپنے ایمان دار، مَوْمِنُونَ حَقًّا تو صرف وہ ہیں۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَآلِيَهُمْ  
نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَآلِيَهُمْ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَّهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ

(۸/۷۳)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی یہ لوگ اصل مومن ہیں۔ ان ہی کے لئے مغفرت اور ان ہی کے لئے عزت کا رزق ہے۔

ان کے برعکس۔

لٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ  
وَآلِيَتِهِمْ لِيُحْيُوا لِيَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَالَّذِينَ آمَنُوا هُمْ الْمُفْلِحُونَ ۝ أَعَدَّ اللَّهُ  
لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ الْفَوْزُ  
الْعَظِيمُ ۝ (۹/۸۸-۸۹)

لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے اور جہاد کیا اپنے اموال اور جانوں کے  
یہی لوگ ہیں جن کے لئے (سب) خوبیاں ہیں۔ اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔ ان کے لئے  
اللہ نے ایسی جنات تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ ان میں رہیں گے اور یہ بہت  
بڑی کامیابی ہے۔

دیکھئے! سب خوبیاں، کامیابی و کامرانی کی تمام نعمتیں، دنیا کی سُرخروئی اور عاقبت کے انعام، سب  
انہی کے لئے ہیں جو ایمان کے ساتھ عمل میں پورے اترتے ہیں۔

یہی نہیں کہ آخرت کی فلاح و بہبود ہی عمل کے ساتھ متعلق ہو، اس دنیا کی عزت و وقار کی زندگی،  
خوشحالی و خوش بختی کی زندگی، سرفرازی و سر بلندی کی زندگی، یعنی وہ زندگی جو فی الحقیقت ایک مومن کی  
زندگی ہونی چاہیے۔ وہ بھی عمل کے ساتھ ساتھ مشروط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکومت اس لئے دی تھی

کہ ان کے کام دیکھے نہ زبانی دعویٰ۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۝

پھر ہم نے تمہیں دنیا میں حکومت دی پہلی قوموں کے بعد تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو

اگر تم عمل کی دنیا میں پورے نہیں اترو گے تو تمہارے ایمان کے الفاظ کوئی قیمت نہیں رکھیں گے۔ وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا۔ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۝ (۹/۳۹) اس لئے کہ جہاں اس کا ارشاد ہے کہ:-

وَنُودُوا أَنَّ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُوَدُوا بِهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (۴/۴۳)

ان سے پکار کر کہہ دیا جائے کہ یہ جنت ہے جس کے تم اعمال کے باعث وارث قرار دیئے جلتے ہو۔

وہیں اس دنیا کی جنت کے متعلق بھی اس کا فیصلہ ہے کہ:-

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

فِي الْأَرْضِ (۲۳/۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا کہ جو تم میں سے ایمان لائیں اور عمل صالح کریں تو اللہ ان کو زمین کی بادشاہت

عطا فرمائے گا۔

پس اگر تم چاہتے ہو کہ اس دنیا میں تمہاری ہستی قائم رہے تو ایمانِ محکم کے ساتھ عملِ بہیم بھی پیدا کرو کہ یہی سچے مومنوں کی نشانی ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا

بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ

یقیناً مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر ان کے ایمان میں ذہن نشین

نہ ہوئی اور انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے اموال و نفوس سے جہاد کیا یہی لوگ سچے ہیں۔

درنہ یاد رکھو کہ خدا کے فیصلے، فطرت کی تعزیریں، اٹل ہیں، غیر جانبدار ہیں۔ ہر چیز کی بقا عمل سے ہے۔ انسان کا تمام تر سرمایہ عمل ہے۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ یہ خدا کا اٹل فیصلہ ہے۔ نتائجِ عمل سے پیدا ہوتے ہیں اور سے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی ہستم بھی

یہ خالی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ تاری ہے

وہ قول وہ زبانی دعویٰ، وہ اقرار وہ اصطلاحی ایمان جس کی تائید اعمال سے نہیں ہوتی جس کی تصدیق آپ کے قلوب اور جوارح نہیں کرتے قرآن کی میزان میں ایک پرکھ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا۔ بلکہ ایسا زبانی دعوے ایک جرمِ عظیم ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ

اللہ کے نزدیک یہ بہت بُری بات ہے کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جو کر کے نہ دکھاؤ۔

اور اگر خدا کے ان کھلے کھلے فیصلوں کے بعد بھی آپ اس زعمِ باطل میں رہیں کہ چونکہ آپ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں، صبح سویرے منہ پر ہاتھ پھیرتے وقت زبان سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ بھی نکل جاتا ہے اس لئے آپ ضرور جنت کے وارث بن جائیں گے اور ساری دنیا پر غلبہ آپ ہی کا ہو جائے گا۔ اور محض اس لئے ہو جائے گا کہ آپ مسلمان کہلاتے ہیں۔ تو یاد رکھئے یہ سراسر دھوکا ہے، فریب ہے۔ اور فریبِ خدا کے ساتھ نہیں، دوسروں کے ساتھ نہیں، بلکہ خود اپنے ساتھ ہے۔ وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ۔ یاد رکھئے، آج دنیا میں جہدِ للبقا (زندہ رہنے کی کشمکش) بڑی سخت ہو گئی ہے۔ قوموں میں باہمی منافست ہے، مقابلہ کی دوڑ ہے۔ جو قوم جو ملک جو شخص اس دوڑ میں پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لئے ٹھہر گیا، ہلاک ہو گیا۔ پیچھے سے آنے والی توپ اُسے بے رحمی سے کچلتی ہوئی آگے نکل جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے قَاعِدِينَ (بیٹھنے والے) اور مُجَاهِدِينَ (دوڑنے والے) کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ کیا یہ قانون آپ پر نافذ نہیں ہوگا۔ کیا اربابِ قضا و قدر آپ کو اس لئے چھوڑ دیں گے کہ آپ خاص قسم کے نام رکھتے ہیں، یا یہ عقیدہ دل میں جمائے بیٹھے ہیں کہ ہمارا زبانی اقرار ہماری کامیابیوں کے لئے کافی ہے، یاد رکھئے! فطرت کسی کی سوتیلی ماں نہیں۔ اگر اس نے پہلی قوموں کو تباہ کر دیا تو اس لئے کہ ان میں قوتِ عمل مفقود ہو چکی تھی، نہ اس لئے کہ ان سے اُسے کوئی ضد تھی۔ اور اب اگر آپ بھی وہی کچھ کریں گے جو ان قوموں نے کیا تھا تو وہ آپ کو اس لئے نہیں بخش دے گی کہ آپ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ ایسا سمجھنا خدا کے قانون کے متعلق بڑا غلط اندازہ لگانا ہے۔ مَا قَدَرُوا اللَّهَ

حَقَّ قَدْرًا ۝

# اسلام اور سائنس

(۱۹۳۵ء میں شملہ کے ایک جلسہ کی تقریر)

برادران عزیز! جیسا کہ آپ کو اس جلسہ کے پروگرام سے معلوم ہو گیا ہو گا، مجھے جس موضوع پر آپ کی خدمت میں عرض کرنا ہے اس کا عنوان ہے "اسلام اور سائنس"۔ سائنس سے یہاں مراد علم کیمیا اور طبیعیات (CHEMISTRY AND PHYSICS) ہی نہیں جن کی طرف اس لفظ کے اطلاق سے بالعموم ذہن منقل ہو جاتا ہے، بلکہ یہ لفظ اپنی جامعیت کے اعتبار سے ان تمام علوم و فنون پر حاوی ہے جن کا تعلق مشاہدات حسی و عقلی سے ہے۔ خواہ وہ جمادات سے متعلق ہوں یا نباتات سے، عام حیوانات سے ان کا علاقہ بھی خود نفس انسانی سے۔ وہ اس کرۂ ارض کے خواص و طبائع کا تجزیہ کریں یا "کار زمین رانکو ساختہ" اجرام فلکی کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ یہ علوم اور ان علوم کے تمام شعبے سائنس ہی کہلائیں گے۔ دوسری بات یہ کہ اسلام اور علم دینی کے عنوان پر عام طور پر جو کہا یا لکھا جاتا ہے اس سے مقصد صرف اس قدر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درخشندہ عہد ترقی کے چند خوشگوار مناظر سامنے لا کر یہ نظر فریب اطمینان دلا دیا جائے کہ خیر اگر آج اور قومیں تحصیل علوم و فنون میں ترقی کر رہی ہیں تو کبھی تم بھی اس میدان کے مرد رہ چکے ہو۔ یہ داستان سنادی جائے اور اس کے خواب اور اثر سے قوم کو تھپک تھپک کر سلا دیا جائے۔ اگرچہ میں کبھی ایسی ہی تفصیلات پیش کروں گا جو عام طور پر پیش کی جاتی ہیں اور مجھے کبھی ایسے ہی سحر کار مناظر سامنے لانے ہوں گے جو تاریخ کے اوراق پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں، لیکن میں ان کیفیات و مناظر کو کسی اور زاویہ سے دکھانا چاہتا ہوں۔ اور میرے نتائج مستخرجہ افسوس خواب آور ہونے کی بجائے اہل بصیرت کے لئے عبرت و

موعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھیں گے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

برادران! یوں تو دنیا کی جس چیز پر نگاہ ڈالتے وہ تغیر و تبدل کے ایک لامتناہی سلسلہ کی جولان گاہ نظر آئے گی۔ مثلاً سائنس کی تحقیقات اور اثری اکتشافات نے اب یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے کہ مہیب عمیق سمندر کبھی فلک بوس پہاڑ بنے اور ہالیوے کی یخ بستہ چوٹیاں بحیرہ اطلانتک کی سی گہرائیاں تھیں۔ آبادی کی جگہ دیرانے اور ویرانوں کی جگہ آبادیاں تھیں۔ اور یہی سلسلہ غیر محسوس طور پر آج بھی جاری و ساری ہے۔ لیکن ان انقلابات ارضی و سماوی کا انسان کی عمرانی زندگی پر کچھ ایسا گہرا اثر **داخلی تغیرات** نہیں پڑتا جیسا کہ ان تغیرات کا جو زمین کی بجائے خود اہل زمین کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور جن سے سطح ارض کے نقشے بدلنے کی بجائے انسانی تہذیب و تمدن کے آثار بنتے اور بگڑتے ہیں۔ آج ایک قوم اپنی ترقی کی معراج کمال پر ہوتی ہے اور کل ہی آثار قدیمہ کے کھنڈرات اس کے اجڑے ہوئے کاشانوں اور لٹے ہوئے خزانوں کے مرثیہ خواں ہو جاتے ہیں۔ دَتِلْكَ الْاَيَّامُ نَدَاوْلَهَا بَيْنَ النَّاسِ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوتی ہے کہ دور مہبوط میں سے گزرنے والی قوم اپنی دولت و ثروت ہی نہیں کھو بیٹھتی، بلکہ اس کی ذہنیت بھی ایسی پستی کے گڑھے میں گر جاتی ہے کہ اسے اپنے ہاں کی ہر چیز مذموم نظر آتی ہے اور وہ بڑی ترقی اقوام کی ہر ادا محبوب۔ وہ سعادت و نجات کا راستہ ڈھونڈتی ہے تو انہی کے نقوش قدم میں۔ اور اُسے فلاح و بہبود کی راہیں کھلتی نظر آتی ہیں تو انہی کی کورانہ تقلید میں بغرضیکہ وہ دیکھتی ہے تو انہی کی آنکھوں سے سنتی ہے انہی کے کے کانوں سے اور سمجھتی ہے تو انہی کے دلوں سے۔ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ:-

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا نَوْ لِيَهُمْ اَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُوْنَ بِهَا نَوْ لَهُمْ اُذَانٌ لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا نَوْ اُولَئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولَئِكَ هُمُ الْعُقُلُوْنَ ۝ (۷۱/۷۹)

اُن کے دل ہوتے ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں۔ آنکھیں ہوتی ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ کان ہوتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ وہ ڈھور ڈنکر کی طرح سے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہی لوگ غفلت شعار ہیں۔

یہی حالت آج امتِ مسلمہ کی ہے جس کی طرف توجہ مبذول کرنا میرا مقصود ہے۔  
حضرات! زمانہ ترقی کر رہا ہے اور نہایت برق رفتاری کے ساتھ۔ زمانہ سے مراد آج اقوامِ یورپ ہی ہیں۔

جو ترقی کی لامحدود فضاؤں میں بجلیوں کی سرعت کے ساتھ اُڑتی چلی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی اسس  
میح العقول ترقی کا پس ماندہ اقوام پر جتنا بھی مرعوب کن اثر ہو کم ہے۔ لیکن اس کا مسلمانوں کی ذہنیت پر خاص  
طور پر بڑا ہلاکت آفریں اثر پڑا ہے اور اگر اس زہر کو جو ملتِ اسلامیہ کی رگ و پے میں اس سرعت سے سرایت  
کرتا چلا جا رہا ہے، جلدی زائل نہ کیا گیا تو بعید نہیں کہ مسلمان اپنی بستی کے جوہرِ خاص ہی کو کھو بیٹھیں۔ یورپ  
کو جب علمی ترقی کا خیال آیا تو مذہب ان کے راستے میں سب سے بڑا  
**اہل مغرب اور سائنس** روزانہ مسیحیت نے علمی ترقی کی کس قدر مخالفت کی ہے اس کا اندازہ لگا

ہو تو یورپ میں علم و کلیسا کی جنگ کی داستانیں پڑھئے۔ معلوم ہو جائے گا جس دردنگی کا سلوک جناب مسیح  
کی معصوم بھیڑوں نے ہر جوئے علم و حقیقت کے ساتھ (جو غیر نہیں بلکہ اپنے تھے) کیا ہے، قتل و خونریزی کی بڑی  
سے بڑی خونچکاں داستانیں بھی اس کے سامنے شرمندہ ہیں۔ گلیلیو (GALILEO) کا کیا قصور تھا؟ یہی ناکہ  
اس نے کہہ دیا کہ میری آنکھیں مجھے دکھا رہی ہیں کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے اور اس نے دُورین کے ذریعے  
کوپرنیکس (COPERNICUS) کے نظریہ کی تائید کر دی۔ زمین کلیسا اس کے خلاف جوشِ غیظ و غضب میں دیوانہ  
ہو گیا۔ اس مقام پر یہ بتا دینا بھی خلافِ عمل نہ ہو گا کہ مسیحیت کو پرنیکس یا گلیلیو کے اس نظریہ کے خلاف کیوں تھی؟  
یونان میں فلکیات کے متعلق ارسطو کا نظریہ نہایت قابلِ اعتماد سمجھا جاتا تھا، اس نظریہ کی رُو سے زمین اس کا تار  
کام کرنا اور ساکن تصور کی گئی تھی اور جملہ اجرام سماوی اس کے گرد چکر لگاتے تھے۔ اگرچہ فیثا غورث وغیرہ نے اس  
نظریہ کی اسی زمانہ میں تردید کر دی تھی لیکن بائیں ہمہ اسے خاص اہمیت حاصل رہی اور نظامِ بطلیموسی نظامِ فلکی  
کے نام سے یورپ میں رائج ہو گیا۔ مسیحیت کے عقیدے کی رُو سے جملہ کائنات میں زمین کو خاص اہمیت حاصل  
ہونی چاہیے تھی جس پر خود خدا یا خدا کے بیٹے کی قربانی ہوئی۔ چونکہ بطلیموسی نظام کی رُو سے زمین کو عالمِ موجودات  
میں ایک مرکزی اور خصوصی حیثیت حاصل تھی اس لئے مسیحیت نے اس نظام کو اپنے اعتقادات میں داخل کر لیا۔  
ازاں بعد جب علم و تحقیق کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ زمین بھی دیگر اجرامِ فلکی کی طرح متحرک ہے اور اسے کائنات میں  
کوئی امتیازی شان حاصل نہیں، تو اس سے مسیحیت کے بنیادی عقیدے پر زد پڑتی تھی۔ اس لئے کلیسا نے اس  
نظریہ کی مخالفت کی۔ یورپ میں اس جدید نظامِ فلکی کو کوپرنیکس کا نظام کہتے ہیں۔ چونکہ گلیلیو نے علیٰ وجہ البصیرت  
اس جدید نظام کی تائید کر دی اس لئے اربابِ کلیسا اس کی جان کے دشمن ہو گئے۔ علم و تحقیق کے خلاف یہ اندھیر  
صرف قدامت پسند کلیسا کی طرف سے ہی نہ تھا بلکہ ان کے روشن خیال اور تجدد پسند طبقہ پرائسٹنٹ نے بھی



اس کے خلاف کافی زہرا گلا ہے۔ اس پر خود لو تھر (LUTHER) پولاک اور میلانکھنٹون (MELANCHTHON) وغیرہ کی تصنیفات شاہد ہیں۔

یورپ اگر ایسے مذہب کو چھوڑتا تو اور کہا کرتا؟

**ہندوستان میں** ادھر ہندوستان میں جب علمی ترقی کا خیال پیدا ہوا تو وہی مظاہر فطرت جن سے کوڑوں کا مہینے تھے دیوی اور دیوتاؤں کی شکل میں سامنے موجود تھے۔ اندر آگنی اور وائیو (پانی، آگ اور ہوا) جنہیں تابع فرمان بنا کر یورپ نے زمین و آسمان کو مستحضر کر رکھا تھا ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت سجالانا پڑتا تھا۔ جس آزادی پسند طبقہ نے علمی ترقیوں کو ضروری سمجھا وہ قدامت پسند طبقہ کے احتجاج کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے مستانہ وار آگے بڑھ گیا اور اس طرح قدیم مذہب تباہ کیا گیا۔

**مسلمان بھی** مسلمانوں نے جب دیکھا کہ دنیا میں جس قوم کو علمی ترقی کا خیال آتا ہے اسے سب سے پہلے مذہب کو چھوڑنا پڑتا ہے تو انہوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی کہنا شروع کر دیا کہ صحابہ ہونہ ہوا ہمارے موجودہ نکتہ و افلاس، مہبوط و تنزل، پس روی و تہی ماندگی کا ذمہ دار اسلام ہے۔ اور جب تک ہم اسلام کو نہیں چھوڑتے دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مذہبی منافرت کے ذمہ دار وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے ان کے سامنے اسلام کا غلط مفہوم پیش کیا، لیکن اسلام ایسا دین نہیں جس کی حقیقی تعلیم کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکے۔ ایسے لوگوں کو چاہیے تھا کہ ایک طرف ڈگری صادر کر دینے سے پہلے اسلام کو موقع دیتے کہ وہ اپنی صفائی پیش کرتا۔ وہ قرآن کریم کو اٹھا کر دیکھتے اور پھر اس باب میں اپنی رائے قائم کرتے اور اس کے بعد اس کا اظہار بھی کرتے۔ اگر وہ اتنی تکلیف گوارا کر لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ دنیا کی اور قوموں نے اگر مذہب کو چھوڑا ہے تو اس لئے کہ ان کا مذہب ان کی علمی ترقیوں کے راستے میں حائل ہو رہا تھا۔ برعکس اس کے مسلمانوں کا حقیقی دین، علم و بصیرت کا سب سے بڑا حامی ہے اور ان کی علمی ترقیوں کا دور ہی وہ تھا جس میں ہنوز دین کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی تھے۔ دوسروں کو اگر ترقی کرنے کے لئے مذہب چھوڑنا پڑتا ہے تو ان کے برعکس مسلمان ترقی کر ہی نہیں سکیں گے۔ جب تک کہ حقیقی دین کو اپنا رہبر و ہادی نہیں بنائیں گے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے نہ تو خوش عقیدگی ہے اور نہ ہی صنمیات یونان کے افسانے بلکہ یہ قرآن کریم کی واضح تعلیم ہے اور تاریخ کی ٹھوس حقیقتیں جو کچھ میں آج عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ سائنس کی ترقیوں کے باوجود اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ اور جب مسلمانوں نے اس تعلیم پر عمل کر کے دکھایا تو کیا کیا نتائج مرتب ہوئے تاریخ کا یہ حصہ مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم مصنفین کی شہادت

پر مبنی ہوگا تاکہ اس میں جانبداری کا احتمال نہ ہو۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ انسان کو جس چیز نے "انسان" بنایا اور اسے اس قدر شرف بخشا ہے وہ امتیازی خصوصیت کون سی ہے؟

## قرآن اور علم الفطرت

قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں نہایت لطیف و حسین پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے کہا کہ اب میں دنیا میں ایک نئی مخلوق کو متمکن کرنے والا ہوں۔ جب فرشتوں کی مہصوم نگاہوں نے اس پیچڑ کو دیکھا تو اس کے آب و گل میں خون کے پھینٹے اور آگ کی چوگاریاں بھی نظر آئیں۔ عرض کیا کہ بار الہا! کیا دنیا اب اس کے سپرد کی جائے گی جو وہاں فساد برپا کرے گا اور قتل و خون ریزی کا مرتکب ہوگا؛ حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ ہم بہتر جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری سمجھا کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہ پیکرِ خاکی خلافتِ ارضی کے قابل سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: **وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا**۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر حقائقِ اشیاء کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی اور اسی فضیلت کی بنا پر اسے سجدہ ملائکہ قرار دیا۔ لہذا یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ شرف و مجد جس کی بنا پر انسان کو سابقہ آبادیوں کا جانشین بنایا گیا تھا، وہی علم الاشیاء ہے جس کے ایک حصہ کو یورپ علم الفطرت (NATURAL SCIENCE) سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے علم کی فضیلت کے متعلق کہا کہ:

**عِلْمٌ أَوْ شَرٌّ** | **قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ** (۳۹/۹)

کہو کہ جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

چنانچہ تحصیلِ علم کی تحریک و تحریر کے لئے نبی اکرمؐ کی متعدد احادیث مروی ہیں مثلاً حضورؐ نے فرمایا کہ "جو

شخص طلبِ علم کے لئے گھر سے نکلتا ہے اس کے ایک ایک قدم کے ساتھ دس دس نیکیاں شامل ہوتی ہیں۔"

کتاب و سنت کی ان تصریحات کے بعد اب ہمیں مسلمانوں کی علمی تاریخ کو دیکھنا ہے کہ وہ کس حد تک

اس تعلیم پر کار بند ہوئے۔ اگرچہ مسلمانوں میں علمی ترقیوں کی طرف رجحان "بنی اُمیہ" کے وقت ہی سے شروع ہو چکا تھا

لیکن یہ ترقیاں اپنی معراج پر بغداد کی عباسی سلطنت اور اندلس کی اموی سلطنت میں پہنچیں اور قرطبہ اور بغداد

نے واضح رہے کہ ان علوم کا تعلق طبیعی کائنات سے تھا۔ دین سے نہیں تھا۔ دین اس زمانہ میں اپنی اصل سے ہٹا جا رہا تھا۔ انھیں کے لئے دیکھئے "اسلم کے نام خطوط"۔

وہ مرکز تھے جہاں سے آفتابِ علم و فضل اقصائے عالم میں ضیاء پاشی کرتا تھا۔ اس عہد کی علمی تاریخ پر بالاستیعاب نگاہ ڈالنے کے لئے بہت بڑی فرصت درکار ہے۔ اس لئے اس مختصر سی صحبت میں مختلف علوم و فنون کی چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔ یہاں اتنا ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہر زمانہ کی ترقی کا موازنہ اس زمانہ کی مجموعی ہیئت سے کرنا چاہیئے۔ علومِ فطرت میں دنیا آج من حیث الکل بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ میں جس زمانہ کا ذکر کر رہا ہوں اس وقت یورپ کا بیشتر حصہ پتوں اور رکھالوں سے ستر ڈھانپا کرتا تھا۔

سب سے پہلے علم الارض کو لیجئے۔

## علم الارض

(۱) زمین کی پیمائش اور طبقات الارض کی تقسیم کا کام سب سے پہلے مسلمانوں نے شروع کیا۔ خلیفہ مامون الرشید نے شام کے علاقہ سے مساحت شروع کرائی۔ محمد ابن موسیٰ اس (SURVEY PARTY) کے انچارج تھے۔ نیز اس نے (سٹر) علماء (SCHOLARS) کی مدد سے کرۂ ارض کا ایک نقشہ بنوایا۔ ان میں انخوارزمی بھی تھے جنہوں نے اپنی کتاب میں تمام روئے زمین کو سات مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ اس سے قبل بطلمیوسی جغرافیہ میں اس تقسیم کا کوئی وجود نہ تھا۔

(۲) مسعودی اس زمانہ کا جہاں گرد (GLOBE TROTTER) تھا جس نے تمام آباد دنیا کا سفر پایادہ کیا اور اپنے مشاہدات قلمبند کرتا چلا گیا۔

(۳) مشہور اندلسی حکیم ابو بکر نے تمام روئے زمین کی آبادی کے حالات متعدد ضخیم جلدوں میں لکھے ہیں۔ (۴) ادریسی بھی اسی زمانہ کا مشہور جغرافیہ دان ہے جس کی علمی شہرت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ عقلیہ (سلی) کے عیسائی بادشاہ (راجرز دوم) نے اسے اپنے دربار میں بلا لیا۔ اُس نے وہاں بادشاہ کے لئے ایک چاندی کا کرۂ تیار کیا جس پر تمام دنیا کا نقشہ کندہ کرایا گیا تھا۔

(۵) اسی زمانہ میں حکیم ناصر خسرو ابن بطوطہ اور ابن جبیر جیسے سیاح پیدا ہوئے جن کی علمی کاوشیں آج تک اہل علم و تحقیق کے لئے نایاب ہیں۔

(۶) مقدسی نے جغرافیہ پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) لکھا جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ اپنے مشاہدات پر دوسرا ثقہ روایات پر اور تیسرا مطالعہ پر مبنی ہے۔

(۷) انخوارزمی نے اُس زمانہ میں جب کہ امریکہ کا خیال تک بھی کسی کو نہ تھا ایک نظریہ ایجاد کیا جسے یورپ میں نظریہ (ARIM) کہتے ہیں۔ اس کی رو سے اس نے ایک نئی دنیا کے وجود کے امکان کا پتہ دیا۔ لیکن اس نظریہ

سے استفادہ کیا اور اسی کی روشنی میں کولمبس نے نئی دنیا کو دریافت کیا۔

۲۔ جغرافیہ کے ساتھ ہی جہاز رانی منسلک ہے۔

## جہاز رانی

(۱) دسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے جہاز چین کے شہر کائنٹن تک جا پہنچے تھے اور وہیں سے کچھ مسلمان تاجر جاپان اور کوریا تک بھی گئے۔ ان علاقوں میں اسلام زیادہ تر ان ہی تجارتی بدولت پھیلا، کیونکہ اس زمانہ میں تبلیغ کا کام کسی خاص طبقہ سے مخصوص نہیں تھا بلکہ ہر مسلمان کا پیشہ جداگانہ اور فریضہ تبلیغ ہوتا تھا۔

(۲) واسکو ڈے گاما جس زمانہ میں افریقہ کا چکر کاٹ رہا تھا تاکہ اسے کسی طرح ہندوستان کا راستہ مل جائے تو جس شخص نے اس راہ گم کردہ منزل کو ٹھکانے لگایا، وہ ایک عرب جہاز ران احمد ابن مجید تھا۔

(۳) نہر سوئز کھودنے کا خیال حضرت عمرو ابن العاص (عہدِ فاروقی) کے حجلہ دماغ کارین منت ہے۔

(۴) یورپ کی عام منڈیوں میں عرب تجارت جس کثرت سے پھیل چکے تھے اس کا خلیفہ سا اندازہ اس سے لگایا

کہ عربوں کی تجارتی اور جنسی اصطلاحات آج تک یورپ میں رائج ہیں۔ مثلاً (TRAFFIC) وہی لفظ ہے جو عربوں کے ہاں طریق (یعنی راستہ) تھا۔ (TARIFF) اُن کے رسم الطریق سے نکلا ہے۔ (MAGAZINE)

عربوں کا مخزن (بمعنی اسٹور) ہے۔ (CHEQUE) جس پر آج تمام کاروباری دنیا کا انحصار ہے، صلح کا تفریح ہے۔ اسی طرح (COTTON) اُن کے یہاں کی قطن (کپاس) ہے۔ (ORANGE) وہاں کا نارنج۔

(LEMON) لیموں اور (SAFFARON) ان کے یہاں زعفران ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔ چنانچہ مشہور عیسائی

جغرافیہ داں مسٹر سلطرون لکھتا ہے کہ کولمبس سے پہلے عرب کی جماعتیں بحرِ اطلال نطک میں مختلف مقالات اور زمینوں کی تلاش کرتی پھرتی تھیں۔

(۲) زمین کے بعد اہل زمین کے حالات، یعنی علمِ تاریخ کو دیکھئے۔ امام طبری کی تاریخ بارہ مجلدات میں تاریخ

ہے۔ ابن خلدون کا مقدمہ تاریخ، 'فنِ تاریخ' میں جسے (FROUDE) نے تاریخ کی سائنس کہا ہے، آخری تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اور اسے آج تک یورپ عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتا ہے۔ حاجی خلیفہ نے خاص عہدِ عباسیہ کی تاریخ میں قریب چودہ سو تصانیف شمار کی ہیں۔ مسعودی نے تاریخ کا انسائیکلو پیڈیا لکھا ہے

اس وقت اس سے بحث نہیں کہ دینی نقطہ نگاہ سے اس تاریخ کی حیثیت کیا ہے۔ اس کے لئے دیکھئے ہماری تاریخ (سیتم کے امام خطوط، جلد سوم)۔

جس طرح مقدسی نے جغرافیہ کا لکھا تھا۔

**فلسفہ** (۴) اب فلسفہ اور لٹریچر کو لیجئے جو ایک مہذب قوم کے نظامتِ حیات میں بمنزلہ روح کے ہیں۔ الفریڈ گیلا مشہور مستشرق لکھتا ہے کہ یورپ میں جس قدر یونانی فلسفہ کی ترویج و اشاعت ہوئی مسلمانوں کے تراجم کی رہین منت ہے۔ فارابی، ابن سینا، ابن رشد وغیرہ حکمائے اسلام نے یونانی فیلسوفوں کی تصانیف یورپ کے آگے کھول کے رکھ دیں۔ حتیٰ کہ لاطینی زبان میں بھی، جو یورپ کے جملہ علوم و فنون کی سرچشمہ سمجھی جاتی ہے، جس قدر فلسفہ منتقل ہوا سب اندلس کے مسلمانوں کی تصانیف کے راستے سے آیا۔ شاہنشاہ الفانسو (ALFANSO THE WISE) نے مشہور فلاسفر ابو بکر کو اپنے دربار میں دعوت دی کہ وہ یہودی اور عیسائی فلاسفر کو درس دیا کریں۔ پروفیسر گیب کا بیان ہے کہ جس طرح یورپ مذہب کے معاملہ میں یہودیت کا شرمندہ احسان ہے اسی طرح فلسفہ اور روان کے مسئلہ میں عربوں کا زیر بار کریم ہے۔ قریب قریب ہی الفاظ ہسٹوری آف وی ورلڈ میں مسٹر ہائینڈ نے لکھے ہیں۔ (LEWES) ہسٹری آف فلاسفی میں لکھتا ہے کہ اگر ڈیکارٹ کے زمانہ میں احیاء العلوم (امام غزالی) کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہو گیا ہوتا تو لوگ ڈیکارٹ پر ادبی سرقہ کا الزام لگا دیتے۔

**طب اور طبیعیات** (۵) اب طب اور طبیعیات کو لیجئے۔ سر تھاہس آرنلڈ کا بیان ہے کہ انکشافاتِ طبیعی کے متعلق ابھی مسلمانوں کی تصانیف بہ تمام و کمال یورپ کے سامنے نہیں آئیں۔ صرف قسطنطنیہ کی قریب شقر لائبریریوں میں اس موضوع پر ایسی نادر تصانیف رکھی ہیں جن سے یورپ آشنا نہیں ہوا۔ پھر یہ تصانیف کس کد و کاوش سے بہم پہنچائی گئیں اور کس تفحص و تجسس سے لکھی گئی تھیں، اس کا اندازہ مامون الرشید کے عہد کے مشہور سائنس دان، حنین بن اسحق کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے جالینوس کی ایک کتاب کی تصحیح کے لئے عراق، شام، فلسطین اور مصر کا پیادہ سفر کیا۔ اسی طرح فارابی نے ارسطو کی ایک کتاب پر تنقید لکھنے کے لئے اسے دو سو مرتبہ پڑھا۔

علم طب اور طبیعیات میں الکندی کی قریب ۶۶۵ تصانیف گنائی جاتی ہیں جن میں اکثر جزئیات، مدو جزر و روشنی، آب و ہوا، فلکیات، معدنیات اور نباتات پر ہیں۔

الرازی کی کتاب الحاوی، ایک مدت تک یورپ کی طبی درسگاہوں میں داخل نصاب رہی ہے۔ الرازی نے سب سے پہلے چیچک کو متعدی مرض ثابت کیا۔ چنانچہ اس موضوع پر اس کا مقالہ یورپ میں عام مقبولیت

حاصل کر چکا ہے۔

ابن سینا کے قانون کی شہرت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ تیس برس کے عرصہ میں صرف ایک لاطینی زبان میں اس کے پندرہ ایڈیشن چھپ گئے تھے۔ ابن سینا نے پہاڑوں کی تخلیق، جہادیات کی تحقیق، زلزلوں کے اسباب، اصولِ آلات، ٹمپرچر (مقیاسِ حرارت) اور دیگر عناصرِ طبیعی کے خواص پر بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو یورپ کے سامنے موجود ہیں۔

اخوان الصفا نے جو دسویں صدی میں ایک نجیبہ انجمن تحقیقاتِ علمی کے لئے قائم ہوئی تھی سائنس کا انسائیکلو پیڈیا لکھا ہے جو ۵۲ مقالات پر مشتمل ہے اور جن میں سے ۱۷ مقالات علمِ الفطرت (NATURALE SCIENCE) سے متعلق ہیں۔

ابن خلیب اندلسی نے طاعون کے اسباب دریافت کئے اور تعدیہ کے لئے حفظِ مائتہم کے اصول متعین کئے۔ ابن زہر اندلسی کی کتاب التاثر، خواص الادویۃ اور طریق علاج میں لاطینی میں سند مانی جاتی ہے۔ اسی طرح زہراوی اندلسی کی جراحات پر کتاب، علم تشریح الابدان کی بنیادی تصانیف میں سے ہے۔

**میکانکس** | عملی میکانکس کے متعلق حکیم جزری نے تیرہویں صدی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا۔ ڈاکٹر لیبان نے لکھا ہے کہ عربوں نے عملی میکانکس کے آلات ایجاد کر کے یورپ کو ان کا استعمال سکھایا۔ اسلامی ممالک میں کاغذ آٹھویں صدی میں رائج ہو چکا تھا۔ پانی کی گھڑیاں خلفائے عباسیہ کے وقت استعمال میں آئی تھیں۔ چنانچہ ہارون الرشید نے ایک عجیب و غریب گھڑی تحفہ شاہ شارلمین کو بھیجی تھی۔

مشہور مؤرخ گبن لکھتا ہے کہ الیکیمیا (CHEMISTRY) اپنی اصل کے اعتبار سے عربوں کی ایجاد ہے انہوں نے سب سے پہلے آتشیں مرکب ایجاد کئے۔ تیزاب، مثل، نائٹرک ایسڈ، ہائیڈروکلورک ایسڈ، پوٹاسس، ایونیا، کلورائیڈ آف مرکری وغیرہ کیمیاوی مادے نکالے۔ زہروں کو دوائیوں میں تبدیل کیا اور (GASSES) کی

خصوصیات دریافت کیں۔ ملاحظہ ہو (INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE)

**فلکیات** | فلکیات کو دیکھئے۔ خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں بغداد کے شمسہ دروازے کے باہر ایک عظیم الشان رصد گاہ (OBSERVATORY) قائم ہو چکی تھی، جہاں اجرام سماوی کی گردش کے متعلق تحقیقات بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ یحییٰ ابن منصور اس رصد گاہ کا انچارج تھا۔ اس کی کتاب الاعمال، علم ہیئت پر ایک مستند تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ یورپ ابھی کل تک بطلیموسی نظام کا قائل تھا جس کی رو سے زمین ساکن

بتائی جاتی تھی لیکن فارابی نے بہت عرصہ پیشتر اس نظریہ کی سوچیاں تو جہاں کی وجہاں اڑائیں اور اس کی جگہ اس نظامِ فلکی کی بنا ڈالی جو یورپ میں کوپرنیکس کے نظام کے نام سے مشہور ہے اور جس پر آج یورپ کی تمام فلکی تحقیقات کی بنیاد قائم ہے۔

علاوہ بریں مختلف علوم و فنون کے متعلق مسٹرٹی، ایل، و سوانی ایم اے لکھتے ہیں کہ یورپ جس زمانے میں جہالت کی عمیق گہرائیوں میں پڑا ہوا تھا اسپین کے حکماء اسلام سائنس اور ادب کی شمعیں لے کر آئے۔ اور یورپ کو طب، ریاضی، فلسفہ اور دیگر علوم میں درس دینے لگے۔ وہ لوگ جہازوں کی ساخت، باغوں کی پرورش، پھولوں کے تحفظ، لوہے اور پتیل کے ظروف، روئی اور ریشم کے کپڑے، طباعت و مریخ کاری وغیرہ صنعتوں میں بھی بہت ماہر تھے۔

لیکن یہ علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات علمائے اسلام کی ذہنی افتاد یا طبعی رجحان کا نتیجہ نہ تھے بلکہ ایک خاص جذبہ تھا جس کے ماتحت یہ امور سرانجام پاتے تھے۔ وہ جذبہ کیا تھا؟ وہ جذبہ محرمہ کونسی قوت تھی جو انہیں علمی کاوشوں پر آمادہ کر دیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ مخصوص جذبہ وہ قوت محرمہ ان کے دین کی تعلیم تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے نظامِ حیات میں دین ہمیشہ بمنزلہ دماغ کے رہا ہے۔ جب تک دماغ رو بہ اصلاح اور قوی ہوتا ہے تمام اعضاء و جوارح اپنی اپنی جگہ بحسن و خوبی کام کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب اس سرچشمہ قوت و اصلاح میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اگرچہ اعضاء و جوارح بظاہر صحیح و سالم نظر آتے ہیں، لیکن ان کی قوتِ عمل سلب ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں حرارتِ دینی نظامِ حیات میں کسی نہ کسی حد تک موجود تھی اس لئے ہر شعبہ زندگی اپنی اپنی جگہ نشو و ارتقا کے منازل طے کرتا چلا جاتا تھا۔ یہی رہی دلولہ تھا جس سے وہ اتنی مصیبتیں پھیلتے مگر علمی تحقیقات میں ان کا قدم پیچھے نہ ہوتا تھا۔ جب علمی ریسرچ کے لئے اس قدر آسانیاں موجود ہیں۔ آج کسی سکار کے دل میں کسی علمی تحقیق کا خیال پیدا ہو، اس کی مدد کے لئے فوراً بڑی بڑی سوسائٹیاں تیار ہو جاتی ہیں۔ فنڈ جمع کئے جاتے ہیں۔ رفقاءے کار سر جفت پا بہ رکاب ہوتے ہیں۔ اگر وہ افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اپنا کیمپ نصب کریں تو ہالینڈ کا مکھن، لندن کے بسکٹ، کشمیر کے سید اور کینیڈا کی روئی، غرض انہیں سب کچھ وہاں پہنچتا رہتا ہے۔ لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ ابن جریر لکھتے ہیں کہ جب تحصیل علم کے لئے گھر سے نکلا تو والدہ نے دو سو کلمے چادر میں باندھ دیئے تھے۔ معمول یہ تھا کہ ہر روز ایک کلمہ وضو کے پانی میں بھگو کر

کھا لیتا۔ چنانچہ جب یہ کلمے ختم ہو گئے تو دارالعلوم کا دروازہ چھوڑنا پڑا اور جب تک پھر روٹی کا انتظام نہیں ہوا تحصیل علم کا سلسلہ جاری نہ ہو سکا۔ ابن حاتم رازی نے لکھا ہے کہ انہوں نے تحصیل علم کے لئے نو ہزار میل پیادہ سفر کیا۔ ضیاء الدین ابن عاصم نے نباتات کی تحقیق کے لئے روم، یونان اور اسپین کے ممالک کا سفر کیا اور اکثر ان حالات میں کہ نہ کھانے کو روٹی ملتی نہ سونے کو چھت میسر آتی۔ غرضیکہ حالت یہ تھی کہ باؤں میں چھلے پڑے ہوئے ہیں، پنڈلیاں گرد و غبار سے آٹ رہی ہیں، لباس چیتھڑے ہو رہا ہے، چہرے پر ضعف و نقاہت سے مُردنی چھا رہی ہے، لیکن سر میں ایک سودا ہے کہ ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دیتا اور ان کی یہ ہیئت زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ ے

بے دست و پانیم کہ ہنوز از وفورِ عشق

سوداست در سرم کہ ہر سالماں برابر است

تہذیب اخلاق و تزکیہ نفس ہو، یا تدبیر مملکت و تنظیم جوش، علوم و فنون کی تحقیق ہو یا تمدن و تہذیب کی

کاوش، سب منزلیں اسی جوش کے جذبہ میں طے ہو جاتیں۔ ان کے نزدیک ے

ولایت، پادشاہی، علم اسفیاری کی جہانگیری

یہ سب کیا تھیں، فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیر ہے

اس لئے کہ قرآن کریم گونا گوں طریقوں سے تدبر و تفکر کی تائید کر رہا ہے۔ کہیں حکم ہے،

**قرآنی تحریک**

کہیں ترغیب و ترمیب، کہیں عدم تفکر پر مذمت۔ وہ لوگ اس کتاب کو ہماری

طرح محض ثواب کی غرض سے نہیں پڑھتے تھے بلکہ یہ ان کے نزدیک دنیا میں زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل دستور

اور ضابطہ تھا۔ ہم میں سے کون ہے جس نے اس آیت کو نہیں پڑھا:-

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

(۴۴/۱۰)

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے گزر چکی ہیں ان کا کیا انجام ہوا؟

ہم اس آیت مقدسہ کو پڑھتے ہیں اور پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن وہ دورِ عمل تھا جس کے متعلق

حضرت عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا:-

”ہم میں سے جب کوئی قرآن کی دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو جب تک ان کی حقیقت سے آگاہ



نہ ہو جاتا اور ان پر عمل نہ کر لیتا آگے نہ بڑھتا۔  
 (تفسیر ابن جریر)  
 انہوں نے اس آیت کے رموز و معارف پر غور کیا۔ سَيُرَوُّوا فِي الْأَرْضِ سے سیاحت کا نکتہ پایا اور اس سیاحت اور مساحتِ ارضی سے علمِ جغرافیہ کی بنا پر پڑی۔ انجامِ گذشتہ کے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالی جائے تو علمِ تاریخ مرتب ہو گیا۔ اور ان کے اُجڑے ہوئے کاشانوں کو چشمِ عبرت سے دیکھا تو آثارِ قدیمہ کا علم وجود میں آ گیا۔ غرضیکہ ایک ہی آیت قرآنی پر تدبیر و تفکر اور عمل سے علم کے تین مختلف شعبوں کا قیام عمل میں آیا۔ انہوں نے اس آیت کو دیکھا:

الْمُرَوِّا إِلَى الظُّمُرِ مُسْحَرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ يُمَسِّكُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (۱۶/۷۹)

کیا انہوں نے برندوں کو نہیں دیکھا جو سما میں مسخر کئے گئے ہیں اور ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں سمجھتا اس میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

اس پر غور کیا کہ اس میں ایمان والوں کے لئے جو نشانیاں بتائی گئی ہیں وہ کیا ہیں؟ اب ایمان کا تقاضا تھا کہ وہ اس کی کنہ و حقیقت تک پہنچتے۔ انہوں نے کوشش کی اور جرثقیل، مرکز ثقل، کششِ ارضی کے سے نظریہ دریافت کئے۔ یہی وہ نظریے ہیں جن کی ارتقائی شکل آج طیاروں (ہوائی جہازوں) کی صورت میں دنیا کے سامنے ہے۔

انہوں نے رقیق و فقیق کی آیت پر غور کیا تو ان کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ آسمانوں کے تمام کتبے آغازِ پیدائش میں ایک ہی بولی سے مرکب تھے۔ پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر الگ الگ کتبے بن گئے۔  
 أَوَلَمْ يَرَأِ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ۝ (۲۱/۳۰)  
 کیا ان لوگوں نے جو آیاتِ الہی کا انکار کرتے ہیں یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین پہلے آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو الگ الگ کر دیا اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا۔ کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لاتے؟

آیت کے آخری ٹکڑے سے ان کی توجہ اس طرف بھی گئی کہ تمام ذی حیاتہ اشیاء کا قوام اولین پانی سے ہوا۔ کیا رقیق و فقیق اور پانی کا مبداءِ حیات ہونا آج سائنس کے آخری انکشافات نہیں، نظریہ ارتقا؟

(EVOLUTION THEORY) آج سائنس کی تحقیقات کا معرکہ آرا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اہل علم حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ اس کی ابتداء بھی مسلم ائمہ علم و حکمت کی ذہنی کاوشوں کی رہیں کرم ہے۔ فارابی ابن سینا ابن مسکویہ اور ابن باجر نے اپنی تصانیف میں اس نظریہ پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے تکویریل و ہنار اور تفسیر شمس و قمر کی آیات پر غور کیا تو ان پر فلکیات کے راز منکشف ہو گئے۔

خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يَكْوَرُ اللَّيْلُ عَلَى النَّهَارِ وَيَكْوَرُ النَّهَارُ  
عَلَى اللَّيْلِ ۚ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَجْرِي لِإِجَالٍ مُّسَمًّى ۗ (۳۹/۵)

اس نے زمین و آسمان کو حکمت سے پیدا کیا وہ رات کی تاریکی پر دن کی روشنی اور دن کی روشنی پر رات کی تاریکی چادر پیٹ دیتا ہے اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور ان میں سے ہر ایک ایک وقت معین تک چلے جا رہا ہے۔

انہوں نے جس نظام شمسی کی بنیاد قرآن کریم کی ان آیات کی روشنی میں قائم کی وہ آج سائنس کی تحقیقات کی آخری سرحد ہے۔ چنانچہ عَلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (ہر ایک کرہ اپنے اپنے دائرہ میں تیرتا پھرتا ہے) نے بطلموسی نظام کی تغلیط کر کے فارابی کی رہنمائی، علم الافلاک کی صحیح منزل کی طرف کی فلکیات کے متعلق ہرشل نے اپنی مدت العمر کے تجارب کے بعد جس نظریہ کا اضافہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ یہ سورج مع اپنے نظام کے ایک اور ستارہ کی طرف دوڑ رہا ہے جو اس کا مستقر ہے۔ اس ستارہ کو دیو کہتے ہیں لیکن ہرشل سے تیرہ سو سال پیشتر قرآن کریم کی اس آیت نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا۔

وَالشَّمْسُ بَجَرِيٍّ لَّمْسْتَقَرُّ لَهَا ۗ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۗ (۳۶/۳۸)

اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اس خدا کا جو زبردست علم

دالا ہے۔

غرضیکہ ان اہل نظر مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی ہر چیز میں ایک آیت الہی، ایک خداوندی نشان، ایک رازِ فطرت مضمر ہوتا تھا۔ وہ ہر چیز کو تجسس کی نگاہ سے دیکھتے اور نقاب برافگندہ عروس حقیقت کو علمی تحقیقات اور علمی تجارب سے جنتِ نگاہ بنا لیتے۔ صبح کی سپیدی میں، رات کی سیاہی میں، شفق کی رنگینی میں، قوسِ قزح کی ندرت، آفرینی میں، پہاڑوں کی بلندیوں میں، سمندروں کی گہرائیوں میں، بادلوں کی روانیوں میں، نسیمِ سحر کی عنبرِ فشاہیوں میں، سورج کے جلال میں، چاند کے جمال میں، انہیں صحیفہ فطرت کے اوراق کھلے ملتے جو انہیں

دعوتِ علم و عمل دیتے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاختلافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَخْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ م وَتَضْرِبُ الرِّيحُ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِينَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (۲۴۰)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور رات دن کے آنے جانے میں اور جہازوں میں جو کہ لوگوں کے فائدہ کی چیزیں سمندروں میں لے کر چلتے ہیں اور (بارش کے) پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا، پھر اس سے زمین کو پڑمردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے حیوانات پھیلا دیتے اور ہواؤں کے (رُخ) بدلنے میں اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید معلق رہتے ہیں سمجھ رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

ایک مسلمان کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ ان آیات اللہ پر محکم یقین رکھے، وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ قرآن کریم کی ان شہادات کو دنیا کے سامنے سچا ثابت کر دے۔ اور یہ اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ فطرت کے ایک ایک نقش و نگار کو دیکھے اور پیہم تجربات اور مسلسل مشاہدات سے ان کی حقیقتیں دنیا کے سامنے کھول کر رکھے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کے نزدیک مومن کی صفت ہی یہی ہے کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کارگر ہستی پر غور کرے اور اس کی نگاہِ دقیقہ رس پھول اور کانٹے کے نظر فریب امتیازات سے گزر کر شاخِ گل کی ان گہرائیوں تک جانچے جہاں ایک ہی قسم کے قوام سے پھول کو مشامِ جانفز اور کانٹے کو نوکِ خلش زاعطا ہوتی ہے۔ وہ چل رہا ہو تو گل بوٹے کی شادابی و شگفتگی اسے دعوتِ نظارہ دے۔ بیٹھے تو ریت کے ایک ایک ذرہ میں ہزاروں آفتابِ رخشا نظر آئیں اور لیٹے تو آسمان کی ایک جرد اوچھتِ مرصع کار کی صنعتِ تحسین و تزیین کی داد مانگ رہی ہو۔ غرضیکہ نہ اس کا اٹھنا بیکار ہو، نہ اس کا بیٹھنا خالی از مصلحت ہے

بیٹھے تو عجزِ نقشِ کف پالتے ہوئے!

اُٹھے تو درودِ دل کا بہانہ لے ہوئے!

اس لئے کہ اس کے خضر راہ کا ارشاد ہے:-

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاختلافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ

لَاُولِي الْأَلْبَابِ ۗ الَّذِينَ يُذَكِّرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقَعُودًا ۗ وَعَلَىٰ جُنُودِهِمْ  
وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِن رَّبِّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا ۗ

(۱۹۰-۱۹۱/۳)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور رات دن کے آنے جانے میں اہل عقل کے لئے نشانیاں ہیں، وہ لوگ جن کی یہ حالت ہے کہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اٹھنے کے قانون کو سامنے رکھتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے اس (موجودات) کو منفیاًہ طریق پر پیدا نہیں کیا۔

ہم رَبِّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا کا دعوے اس وقت کر سکتے ہیں جب ہم فی الحقیقت دنیا کی ہر ایک چیز کو سود مند ثابت کر دکھائیں اور یہ چیز "علم حقائقِ اشیاء" اور "علم منافعِ اشیاء" کے بغیر کیسے ممکن ہے؟

**توہم پرستی** | برادرانِ سائنس کا سب سے بڑا احسان یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ہر چیز کی کنہ و حقیقت کو آشکارا کر کے دنیا میں عجائب پسندی اور توہم پرستی کے امکانات کو کم کر دیا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ توہم پرستی کا استیصال سب سے پہلے اسلام نے کیا ہے یا موجودہ سائنس کے انکشافات نے؟ مذاہب کی دنیا میں یہ مشرف صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے ہر ایک دعوے کی بنیاد دلیل و برہان پر رکھی ہے۔ دین اور عقل میں شروع سے جنگ چلی آتی تھی، لیکن اسلام نے اپنی بصیرت افروز تعلیم سے دین اور عقل کو ایک کر دکھایا۔ اس کا دعوے ہے کہ:-

أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۗ (۱۲۱/۸)

اے رسول کہہ دیجئے، کہ میں اور میرے تابعین جو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں تو علیٰ وجہ البصیر

دیتے ہیں۔

حضرات! اس دُھندلے سے خاکے سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلام علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیوں کا کس درجہ حامی و مؤید ہے۔ مسلمانوں کے دیر عروج میں سائنس کی ترقیاں کس بلندی پر پہنچ گئی تھیں۔ پھر یورپ کے محققین اور علمائے اسلام میں ایک بہت بڑا اصولی فرق بھی ہے۔ یورپ اپنے محققین کے صرف علمی کارنامے پیش کرتا ہے۔ ان کے ذاتی کیریئر سے کسی کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اسلام سب سے پہلے کیریئر کو پرکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان اور تقویٰ کی فضیلت سب سے مقدم ہے۔ علاوہ ازیں، اگر

انفرادیت کو چھوڑ کر اجتماعی حالت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اقوام مغرب اگر سائنس کے ایجادات ہیں اس درجہ منہمک ہیں تو محض اس لئے کہ ایک قوم کی قوتِ قابرہ دوسری قوم سے کم نہ ہو جائے۔ سائنس کی کرشمہ سازیاں میدانِ حرب میں اقوامِ مقابل کو بالادست نہ کر دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد سائنس کی ترقی کی رفتار اس قدر برقی رفتار ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اقوامِ عالم میں باہمی اعتماد اٹھ چکا ہے اور ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے اور اسی لئے سائنس کی ایجادات میں ایک دوسرے پر مسابقت کی فکر دامن گیر ہے۔ ظاہر ہے کہ جس علمی اور عملی انہماک کا محرک جذبہ یہ ہو اس سے اہلِ عالم کے امن و سکون اور اطمینانِ قلبی میں کس قدر اضافہ ہوگا؟ برعکس اس کے مسلمانوں کی ترقیوں کا مطمح نظر کیا تھا اور خدا کی زمین پر بسنے والوں پر ان کا کیا اثر پڑا؟ اگر اس کے متعلق ہم خود کچھ کہیں گے تو شاید جاہلِ باری پر محمول کیا جائے گا اس کے لئے ایک غیر مسلم کی رائے سنئے۔ مسز سر وجنی نیڈو کہتی ہیں:-

”عرب فوجیں یلغار کرتی ہوئی فرانس کے دروازے پر پہنچی تھیں تو کیوں؟ فتح و ظفر و دولت کے لئے نہیں، ملک گیری اسلام کا اصل مقصد نہ تھا۔ اس کا مقصد حریت و آزادی کی اشاعتِ عمومی اور غلامی کا استیصال تھا۔ آج کل ہم ملکی طاقت کے لئے مرتے ہیں اور علاقوں کا رونا روتے ہیں۔ لیکن اسلام کا مطمح نظر کوئی ملک یا صوبہ یا خطہ نہ تھا، بلکہ اس کا مقصد ساری دنیا کی نجات تھا اور مسلم داعی ہی دھن لے کر ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے تھے، عربوں نے صرف ملک کی زمینیں فتح نہیں کیں، بلکہ دل اور دماغ فتح کئے۔ انہوں نے قوموں کے لٹریچر اور خیالات کو مٹا دیا۔ ہمارے دہم و خیال کو حقیقت کا جامہ مسلمانوں نے پہنایا، ہمارے افکار و تخیلات میں حرکت اور جان انہوں نے ڈالی، مسلمانوں نے دنیا میں علوم و فنون کی بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اخلاق، فیاضی اور مردانگی ہمیشہ ان کی قومی خصوصیات رہی ہیں، انہوں نے ہندوؤں کی طرح اشاعتِ علوم میں کبھی سخل نہیں رکھا، یہ ہمیشہ بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت کی فکر میں رہے ہیں۔“

(دیکھیں، مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۹۸ء)

یہ اس لئے تھا کہ انہوں نے علم کو دین کے تابع رکھا اور اس سے احکامِ خداوندی کے مطابق کام لیا۔ برادران! ہیں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا۔ ہمارے ہاں ایک تجدید پسند روشن خیال طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے نزدیک کسی شے

کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار محض حکمائے یورپ کی رائے ہے۔ حتیٰ کہ وہ قرآنِ کریم کے حقائق و معارف بلکہ اوامر و نواہی تک کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اگر قرآنِ کریم کا کوئی ارشاد کسی یورپین محقق کے قول یا نظریہ سے مطابقت پا جاتا ہے تو وہ اُسے قرآنِ حکیم کی صداقت کا معجزہ سمجھ کر ساری دنیا میں اس کا چرچا کرتے ہیں اور اگر قرآنی تعلیم اور یورپ کے کسی نظریہ میں کہیں تضاد و مخالفت واقع ہوتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش اس امر میں صرف ہو جاتی ہے کہ قرآن کو کسی نہ کسی طرح کھینچ کر ان یا موڈ توڑ کر یورپ کے نظریہ کے مطابق ثابت کر دیا جائے۔

اس "جہادِ عظیم" کی دھن میں قرآنی آیات کی ایسی مضحکہ خیز تاویلیں کرتے ہیں کہ **سائنس اور قرآن** غیر توغیر خود اپنیوں کو بھی ہنسی آجائے۔ یہ مرعوب ذہنیت کی خود فریبی اور اصول قرآنِ فہمی کے متعلق بنیادی غلطی ہے۔ اس چیز کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات (خواہ کسی ملک میں ہوں یا کسی زمانہ میں) جب بھی یقیناً کے درجہ کو پہنچ جائیں گے، یہ ممکن نہیں کہ وہ ارشاداتِ قرآنی کے خلاف ہو سکیں۔ اس لئے کہ سائنس کے انکشافات بالآخر ہیں کیا؟ یہی ناکہ فطرت کی چھپی ہوئی حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا دیا جائے۔ بنا بریں کیا یہ ممکن ہے کہ فطرت کی کوئی حقیقت بے نقاب ہو اور وہ صحیفہ فطرت کے مصنفِ حقیقی کے کسی ارشاد کے خلاف نکلے؟

ایں خیال است و محال است و جنوں

لیکن علمی تحقیقات کی یہ حالت ہے کہ ایک نظریہ کو یقین کے درجہ تک پہنچنے کے لئے ہزاروں قیاسات کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی ایک موجد کی زندگی ہی میں اس کا قیاس غلط ثابت ہو جاتا ہے اور کبھی آنے والی نسلیں اس کی دھجیاں بکھیر دیتی ہیں۔ لہذا آج جو نظریہ قرآنِ کریم کے کسی ارشاد سے مطابقت نہیں پاتا اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ محکم اور یقینی ہے۔ قیاسی اور ظنی نہیں۔ مشاہدات اور قیاسات میں ایک بین فرق ہے جسے بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ آج تک قرآنِ کریم کا کوئی اشارہ بھی کسی مشاہدہ کے خلاف ثابت نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کی تعلیم کو قیاسات کے مطابق ثابت کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔

یہی غلطی ہم اس سے پہلے بھی ایک دفعہ کر چکے ہیں جب بعض حکمائے اسلام نے قرآنِ حکیم کو فلسفہ یونان کے مطابق ثابت کرنے میں اس قدر دماغ سوزی سے کام لیا حالانکہ فلسفہ کے اصول قیاسات پر مبنی ہوتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس فلسفہ قدیم کی بنیادیں منہدم ہونے کے ساتھ ہی ان علماء کی تمام کاوشیں بھی اکارت گئیں۔ نہیں بلکہ جن لوگوں نے قرآنِ کریم کو انہی لوگوں کی وساطت سے سمجھا تھا اور ان کی توضیحات کو اصل قرآنِ خیال

کرتے تھے ان کے دلوں میں خود قرآن کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات سے ارتیابی کیفیتیں پیدا ہو گئیں۔ جو آیات قرآنی کسی خاص زمانہ کے قیاسی نظریوں کے مطابق نہ ہوں ان کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ نظریے منور قیاس ہیں۔ جب زمانہ کی مزید علمی ترقیوں سے قیاس حقیقت میں بدل جائے گا تو وہ ان آیات کے عین مطابق ہو گا۔ یہی آج تک ہوتا چلا آیا ہے اور یہی اس کے بعد ہو گا۔

آخر میں ایک مختصر سی گزارش حضرات علماء کی خدمت میں بھی کرنا چاہتا ہوں اگرچہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن چونکہ بات قرآن کی ہے اس لئے اس کے عرض کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ قرآن کریم نے جس علم کی اس درجہ تاکید فرمائی ہے اس کی تعریف کیا ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۗ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ  
كَانَ عِنْدَهُ مَشْهُورًا ۝ (۱۷/۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت چلو (یاد رکھو) کان، آنکھ اور دل۔ ان سب سے باز پرس ہوگی۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک علم وہ ہے جس کی شہادت سمع، بصر اور قلب سلیم دیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ظن اور قیاس ہے، علم کے درجہ تک نہیں پہنچتا۔ ہمارے مذہبی مکاتب میں جو نصاب تعلیم مقرر ہے غور فرمائیے کہ اس میں کتنا حصہ ظن و قیاس کا ہے اور کتنا علم و یقین کا۔

**ہمارے مذہبی مکاتب** | فلسفہ یونان، منطق، علم الکلام جسے فی الحقیقت فلسفہ یونان ہی کی ایک

شاخ کہنا چاہیے تمام ظنی اور قیاسی ہیں اور ایسے کہ خود موجودہ ظنیات میں بھی انہیں کوئی قبول نہیں کرتا۔ یورپ ایک عرصہ تک انہی قیاسات کی نکتہ آفرینیوں میں اُبجھار ہا۔ مسئلہ پیش ہوتا کہ "مرغی کے منہ میں دانت ہو سکتے ہیں یا نہیں" ایک جماعت اثبات کی طرف اور دوسری نفی کی طرف ہو جاتی۔ دلائل پر دلائل دیئے جاتے۔ منطقی توجیہات پیش کی جاتیں۔ صغریٰ اور کبریٰ ملائے جاتے۔ لیکن کوئی اتنا نہ کہتا کہ مرغی کا منہ کھول کر دیکھ لو کہ اس میں دانت ہیں یا نہیں۔ حتیٰ کہ ان میں بیکن پیدا ہوا۔ اس نے سب سے پہلے یورپ میں علم کی وہ تعریف کی جو قرآن کریم کی مصرحہ صدر آیت میں تیرہ سو سال پیشتر دنیا کے سامنے آچکی تھی۔ اس نے مرغی کا منہ کھول کر دکھا دیا کہ اس میں دانت ہیں یا نہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ علم کی اس تعریف کے بدل جانے سے اس قوم کی ذہنیت بدل گئی، اور آج جس قدر علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیاں ہو رہی ہیں سب علم کی اسی تعریف پر مبنی ہیں۔ لیکن ایک ہم ہیں کہ۔

ہوئی لاکھ دُنسیا ادھر کی ادھر ہے  
وہی سنگِ در ہے وہی اپنا سر ہے

ضرورت ہے کہ ہم بھی اپنے زاویہ نگاہ کو قرآنِ کریم کی روشنی میں بدلیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "علمِ دین" سے مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اسے زندگی کے تمام مراحل میں شمعِ ہدایت بنا سکیں اور اس کی روشنی میں منزلِ مقصود تک پہنچیں۔ لیکن اگر ہم اس شمع کو اپنی کوٹھڑیوں کی زینت بنا کر بیٹھ جائیں تو ہر چند شمع کے نورانی ہونے میں شبہ نہ ہوگا لیکن ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہاں وہی پہنچے گا جو مسافت قطع کر رہا ہوگا۔ علمِ دین امورِ دنیاوی میں اسی صورت میں کام آسکتا ہے جب وہ اس قسم کا علم ہو جس کی تعریف قرآنِ کریم نے بیان فرمائی ہے۔ اور یہی علم کا وہ حصہ ہے جسے علمِ فطرت کہا جاتا ہے۔ لہذا جب تک اس حصہ علم کی تکمیل نہ ہو اسلام کا کوئی عالم عالم نہیں بن سکتا۔ اسلام کے دورِ ترقی میں عالم کے لفظ سے ذہن کسی زاویہ گوشہ نشین کی طرف منتقل نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ اس وقت عالم اور حکیم سے مراد وہی ہوتی تھی جو آج کل ریسرچ سکاالر یا سائنسٹ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر نظامیہ میں ایک طرف امام غزالی و نیا ت کا درس دیا کرتے تھے تو دوسری طرف علامہ بہار الدین ریاضی اور تاریخ پر لکھ دیتے تھے۔ خود مساجد میں اسی قسم کے درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے۔ مصر کے خلیفہ العزیز کے زمانہ میں جامع الازہر میں لٹریچر اور طبیعیات پر لکھ دیتے جاتے تھے اور اسی نصابِ تعلیم کا اثر تھا جس نے وہ قوم پیدا کر دی جس کے علمی احسانات سے تمام مہذب دنیا کی گردن جھک رہی ہے اور جن کے علمی کارنامے سَحَر لَکھَر مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے سب تمہارے تابع فرمان بنا دیا) کی زندہ تفسیر ہیں۔ یقین مانئے اگر ہم بھی اپنا نظریہ بدل لیں اور علم کی صحیح تعریف اپنے پیش نظر رکھیں تو یہ زمین بدل جائے گی یہ آسمان بدل جائے گا، اور ایک دن ہم پھر یہ کہنے کے قابل ہو سکیں گے کہ

زمین از گردش تقدیر ما گردوں شود رونے سے  
فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود رونے سے



# خدا کی پادشاہت

(نوشتہ مئی ۱۹۳۹ء)

یوں تو دنیا میں ہر شکار میں ایک لطف ہے لیکن انسان سب سے زیادہ لذت اُس وقت محسوس کرتا ہے جب اس کا شکار خود دوسرا انسان ہو۔ نوع انسانی کی تاریخ پر نگاہ ڈالنے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی سلسلہ صید و صیاد کی ایک مسلسل داستان ہے۔ تہذیب و تمدن، معاشرت و عمرانیات کے بدلنے سے محض جال کی نوعیتیں بدلتی رہی ہیں، لیکن جذبہ ہمیشہ وہی کار فرما رہا ہے۔ اصطلاحات میں تغیر و تبدل ضرور ہوتا ہے لیکن مفہوم ہر جگہ وہی رہتا ہے۔

انسان اپنے عمدہ طفولیت میں انفرادیت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ ایک ایسی "جنت" میں رہتا تھا جہاں ع  
کے را با کے کارے نباشد

لیکن یہ زندگی بچپن کی زندگی تھی۔ اس کی معاشرت کسی اور اسلوب حیات کی متقاضی تھی۔ ارتقائی منازل میں انسان تمام مخلوق سے آگے تھا۔ اس کی تخلیق "فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ" (بہترین ہیئت پر) ہوئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دیگر مخلوق کے مقابلہ میں جسے اُس نے اپنا تابع فرمان بنانا تھا، یہ بہت کمزور اور نہتہ پیدا کیا گیا تھا۔ دوسری مخلوق پر تغلب و تسلط تو ایک طرف اسے اپنی مدافعت اور حفاظت کے لئے بھی کوئی سامان نہیں دیا گیا تھا۔ اس لئے اس کے جذبہ تحفظ خویش کا تقاضا تھا کہ یہ اجتماعیت یا مدینیت کی زندگی بسر کرے۔ ایک جماعت بن کر رہے۔

اس لئے جب یہ بچپن کی زندگی سے ذرا آگے بڑھا تو اس کے احساس اجتماعیت | اجتماعی زندگی (HERD INSTINCT) میں بیداری پیدا ہوئی اور اس نے قبائلی زندگی اختیار کی۔ اس

طرز زندگی کا تقاضا تھا کہ آپس میں کام بانٹ لئے جائیں۔ مختلف لوگ مختلف ضروریات زندگی اور داعیات حیات کے ذمہ دار ہوں۔ یہ تقسیم عمل تھی جس سے انسانی "گروہ سازی" کی ابتدا ہوئی۔ یہ ظاہر ہے کہ اس "سوسائٹی" میں فرائض مفوضہ یکساں نہیں ہو سکتے تھے۔ کچھ فرد تر تھے کچھ بالاتر۔ اگر ایک گروہ کے حصہ میں قبیلہ کے لڑائی جھگڑے پنپانے کا کام آیا ہو گا تو دوسرے کی ڈیوٹی ڈھور ڈنگ چرنے پر لگی ہوگی جن لوگوں کے حصے میں بالائی سطح کے کام آئے انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ چوپاؤں کی سیاحت میں وہ ذہنی تعیش کہاں جو خود اپنے جیسے انسانوں کی سیادت میں ہے۔ جانوروں کے شکار میں وہ لذت کہاں جو اپنے ہم جنسوں کے خون میں ہے۔

چنانچہ انہوں نے ایسی تدابیر اختیار کرنا شروع کیں کہ ہاتھ آئی ہوئی طاقت کبھی چھیننے نہ پائے۔ ہمیں سے حکومت کی بنیاد پڑی۔ یعنی ایک انسان کا دوسرے انسان پر غلبہ و اختیار۔ ارباب اقتدار نے اپنی سطوت و **حکومت** غلبہ کو قائم رکھنے کے لئے مختلف قوتوں کو اپنے اندر مرکوز کرنا شروع کیا، تاکہ ان کے خوف اور دبدبے سے دوسرے انسانوں کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنائے رکھیں۔ حصول قوت اور اس کے استحکام و استبداد کے اسی اہتمام و انتظام کا نام نظام سلطنت قرار پایا اور جس کے ہاتھ میں قوت و اختیار ہو اس کی مرضی اور منشا کا نام قانون رکھا گیا۔ ابتداء تو ہوئی تھی اس ضرورت کے ماتحت کہ انسان اپنی حیات اجتماعیہ کا نظام تقسیم عمل سے صحیح طور پر قائم کر سکے، لیکن یہی چیز اس کے جذبہ اقتدار کی تسکین کا سامان بن کر رہ گئی۔

انسان کی ابتدائی زندگی قبائلی زندگی تھی۔ قبیلے کا بزرگ تمام جھگڑے چکانے اور مشترکہ امور کے سرانجام دینے کا ذمہ دار تھا۔ چونکہ یہ اختیارات ایک فرد کے ہاتھ میں تھے اس لئے اس سے دنیا میں شخصی حکومت کی بنا پڑی جو ذاتی املاک اور جائیداد کی طرح اس کی اولاد میں متوارث آتی رہی۔ جب انسانوں نے اس طرز حکومت کے خلاف بغاوت کی تو بطور انتقام یہ اختیارات پھر فرد سے جماعت کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اسے جمہوری حکومت کہا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کے خلاف بھی بغاوت شروع ہو گئی تو پھر وہی شخصی حکومت ڈکٹیٹر یا آمریت کی شکل میں رونما ہو گئی (شخصی حکومت تھی تو جمہوری حکومت کا انداز تھا تو) اور اس کے بعد آمریت کا دور شروع ہوا، تو فرق صرف ظواہر و رسوم میں تھا، روح ہر جگہ وہی کار فرما تھی۔ یعنی ایک انسان کا دوسرے انسان پر یا انسانوں کے ایک گروہ کا دوسرے گروہ پر حکومت کرنا۔ عصر حاضر مغرب کی جمہوریت کو بہترین طرز حکومت قرار دیتا ہے اور بڑے فخر و ناز سے دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے انسانیت کو ازمنہ متوسط کے شخصی استبداد سے نجات دلا کر آزادی کی فضا میں کھلا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے فرق صرف قالب میں ہے روح وہی ہے ۷

ہے وہی سازِ کهن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری  
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی نئے سلم پری

جمہوریت ہو یا آمریت زمانہ قدیم میں ہو یا عصر حاضر میں، نظام حکومت کی بنا اس پر قائم ہے کہ صاحب اقتدار کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی منشا کے مطابق قانون بنائے اور دوسروں سے ان قوانین کی اطاعت کرائے۔ جمہوریت میں ایک یا دو (۵۱) کی اکثریت کو حق حاصل ہے کہ وہ انچاس (۴۹) کی اقلیت سے اپنا فیصلہ بہ جبر منوائے، مثلاً اگر کسی اسمبلی یا کینٹ میں یہ سوال پیش ہو کہ خدا ہے یا نہیں؟ اور کیا وہن آرار خدا کی ہستی کے خلاف ہوں، تو انچاس آرار والی جماعت کو ماننا پڑے گا کہ واقعی (نعوذ باللہ) خدا نہیں ہے اور یہی فیصلہ بھر ملک کا قانون بن جائے گا جسے انتظام (ADMINISTRATION) یعنی قوت کے دباؤ سے منوایا جائے گا اور اس فیصلہ کے خلاف آواز اٹھانے والے کو حکومت کا باغی قرار دیا جائے گا۔ یہی اصول آمریت کے اندر جلوہ پیرا ہے جمہوریت میں جو شخص اراکین کی اکثریت اپنے ساتھ ملا لے وہی صاحب اختیار ہو جاتا ہے۔ البتہ اس میں ہوتا یہ ہے کہ ایک ایک معاملہ الگ الگ پیش کیا جاتا ہے اور اس میں رائے شماری کی رسم پوری کر لی جاتی ہے اور آمریت میں ایک ہی مرتبہ ان رسمی تکلفات کو طے کر لیا جاتا ہے۔ قوم ایک ہی دفعہ فیصلہ کر کے (بجبر یا برضا و رغبت) ایک شخص کے ہاتھ میں زمام اختیار دے دیتی ہے اور پھر اس شخص کے فیصلے قانون کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ قوانین (جمہوریت کے ہوں یا آمریت کے) آخری اور اٹل ہوتے ہیں اور ان کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔

لیکن جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، جمہوریت ہو یا آمریت، جماعتی حکومت ہو یا شخصی، انسان نے ہر انداز حکومت سے ابار کیا ہے۔ اس لئے کہ ہر طرز حکومت کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی جاتی ہے کہ بعض انسانوں کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ حالانکہ یہ بنیاد ہی غلط ہے اور چونکہ خلاف شرف انسانیت ہے، اس لئے انسان غیر محسوس اور غیر شعوری طور پر اس کے خلاف اپنے سینے میں بغاوت کے جذبات موجود پاتا ہے۔ لیکن چونکہ ایک عرصہ کی "خوئے غلامی" سے اس کی قوت تیز دب چکی ہوتی ہے، اس لئے اسے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کونسی بنیادی خرابی ہے جس کی وجہ سے اس کے سینے میں اس طرز زندگی کے خلاف طوفان جذبات برپا ہوتا رہتا ہے۔ اس اضطراری کیفیت میں وہ کرتا یہ ہے کہ اس نظام کو الٹ دیتا ہے جو اس کے سامنے

اپنے انسان تو ایک طرف حیوانات کی یہ حالت ہے کہ کوئی حیوان اپنے کسی ہم جنس کی حکومت قبول نہیں کرتا، اس کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔

موجود ہونا ہے اور اس کی جگہ ایک دوسرا نظام قائم کرتا ہے جس کے متعلق سمجھ لیتا ہے کہ اس میں اسے اطمینان و سکون حاصل ہو جائے گا حالانکہ یہ دوسرا نظام بھی انہی غلط بنیادوں پر قائم ہونا ہے جن پر پہلا نظام قائم تھا۔ لہذا انسان کی کیفیت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ ۵۔

رست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ کے اوراق اُلٹے جاتیے (چند صفحات کے سوا) ہر صفحہ پر لکھائے گائے تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

انسان کی عام حالت اس مریض کی سی رہی ہے جسے یہ تو معلوم نہ ہو کہ مجھے مرض کیا ہے، لیکن اتنا ضرور جانتا ہو کہ میں تندرست نہیں ہوں۔ پھر وہ ہر نئے علاج کے وقت بلا ساختہ پکار اُٹھے کہ بس یہ ہے تریاق! لیکن حقوڑے ہی عرصہ کے بعد خود اپنے ہاتھوں سے مزعومہ تریاق کے پٹھے پھوڑ ڈالے اور کسی نئے تریاق کی جستجو میں چل نکلے اور اس کی تمام عمر انہی تجربوں میں بسر ہو جائے۔

كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشْرُوفِيهِ قَالُوا إِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا (۲/۲۰)

جب ذرا بجلی چمکی تو دو قدم چل پڑے اور جب پھر اندھیرا ہو گیا تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔

انسانیت اسی تک و تا ز اسی اضطراب و انتشار میں الجھتی، تڑپتی مرغِ بسمل کی طرح یوں پھر پھرتی چلی آ رہی تھی کہ ۵۔

**ایک نئی آواز**

ہر قدم پر تھا گماں، یاں رہ گئی واں رہ گئی

کہ آج سے قریب چودہ سو برس پہلے حظیمہ قدس کی ایک دلکشا آواز اس کے کانوں میں آئی کہ آؤ تمہیں بتایا جائے کہ تمہارے دکھ کا درماں کیا ہے۔ اس مرض کی دوا کونسی ہے؟ تم نے کہاں غلطی کی ہے اور اس کا ازالہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس آواز نے بتایا کہ تمہاری بنیادی غلطی یہ ہے کہ تم نے سمجھ رکھا ہے کہ ایک انسان کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ یہ غلط ہے اور خلافِ شرفِ انسانیت۔ یاد رکھو۔

إِنَّ الْحُكْمَ لِلَّهِ (۱۲/۴۰)

حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے جو تمام انسانوں سے بلند بالاترستی ہے

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

حکمران ہے اکِ دہی، باقی بستانِ آذری

اس کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ تمام انسان ایک سطح پر ہیں اور برابر ہیں اس لئے کہ کوئی کسی دوسرے پر بالادست نہیں ہو سکتا۔ بالادست صرف وہ ہستی ہے جو فی الواقعہ انسانوں سے بالاتر ہو اور وہ صرف خدا کی ذات ہے۔ حتیٰ کہ وہ برگزیدہ ہستیاں جو نوع انسانی کی رشد و ہدایت کے لئے انتخاب کر کے بھیجی جاتی رہی ہیں انہیں بھی یہ حق نہیں کہ انسانوں کو اپنا غلام بنا لیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ  
كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّاتِنِ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكُتُبَ  
وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ۝ (۳/۷۹)

کسی انسان کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکم و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم اللہ سے دوسرے میرے غلام بن جاؤ (بلکہ وہ یہی کہے گا کہ تم سب ربّانی بن جاؤ) اس کتاب کے ذریعے جو تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور دلوں پر نقش کرتے ہو۔

یہ قوانین الہی جن کے اتباع سے انسانوں کو ہر نوع کی خلائی کا طوق اتار کر فقط اللہ کا غلام بنانا تھا اس کتاب مقدس اس صحیفہ آسمانی میں منضبط ہوتے جو ان حضرات انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتا۔ قرآن کریم میں مختلف انبیاء کریم کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۝ (۲۱۳/۲)

اور (اللہ نے) ان پر کتاب نازل کی حق کے ساتھ تاکہ وہ ان امور میں جن میں لوگ اختلاف کرتے ہوں حکم بنیں (فیصلے کریں)۔

جو ان قوانین الہیہ کے مطابق حکومت نہ کرے وہ خدا کا عملاً منکر ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ (هُمُ الْكَافِرُونَ)

(۵/۴۱، ۴۲، ۴۳)

اور جو قوانین خداوندی کے مطابق حکومت نہ کرے تو ظالمین میں سے ہوگا۔ کافرین میں سے ہوگا۔

یہ قوانین خداوندی مختلف زمانوں میں مختلف اقوام عالم کو وقتاً فوقتاً ملتے رہے لیکن چونکہ وہ یا تو حوادث ارضی و سماوی سے محفوظ نہ رہ سکے یا ان میں انسانی ہاتھوں نے رد و بدل کر ڈالا اس لئے ان کا آخری اور مکمل ایڈیشن قرآن کریم کی شکل میں دنیا کو دیا گیا اور یہ ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا کہ اب اس آخری پیغام میں

قیامت تک کسی قسم کا رد و بدل اور تحریف والحاق نہیں ہو سکے گا۔ اس ضابطہ خداوندی کی غرض و غایت یہی تھی کہ نظامِ حکومت اسی کے مطابق ہو۔ توریت و انجیل کے ذکر کے بعد فرمایا:-

**قانونِ خداوندی کا اتباع** | وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ  
مِنَ الْكِتَابِ مُهَيِّمًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنْزَلَ

اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵/۴۸)

اور ہم نے (دے رسول!) تمہاری طرف حق کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے جو ان تمام کتبِ سماوی کے دعویٰ کو سچا کر کے دکھانے والی ہے جو اس سے پیشتر دنیا کو مل چکی ہیں اور ان کے توہین کو اپنے اندر لیتے ہوئے ہے۔ پس اس ضابطہ خداوندی کے مطابق لوگوں میں (نظام) حکومت قائم کرو اور لوگوں کے خیالات کا اتباع مت کرو ورنہ وہ تمہیں اس راستہ سے ہٹا دیں گے جو تمہیں حق و صداقت کے ساتھ دیا گیا ہے۔

یہ قوانین چونکہ اس خدائے کائنات کے مرتب فرمودہ ہیں جو رب العالمین ہے جو تمام نوع انسانی کا یکساں پروردگار ہے اس لئے ان میں کسی خاص جماعت، خاص قوم، خاص ملک کی کوئی رعایت نہیں کی گئی۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کتنے ہی بلند درجہ پر کیوں نہ ہوں، ان میں ارادی یا غیر ارادی طور پر اپنی جماعت کے مفاد کی طرف میلان ضرور ہوگا۔ جب تک انسان کے سینے میں دھڑکنے والا دل موجود ہے وہ جذبات سے مبرئی نہیں ہو سکتا، اور جذبات کا تقاضا ہے کہ وہ امیال و عواطف کی رنگینی قبول کر لیں۔

عقل خود میں غافل از بہبودِ غیر

سود خود بیند، نہ بیند سودِ غیر

برعکس اس کے خدائے رب العالمین ان جذبات سے منزہ و مبرئی ہے اس لئے اس کے وضع کردہ قوانین میں کسی خاص سمت جھک جانے کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ وہاں بہ معاملہ اصول پر مبنی ہوگا اور ایک خاص قاعدے اور قانون کے ماتحت اس کا فیصلہ ہوگا۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ

النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷/۲۵)

بلاریب ہم نے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب یعنی قوانینِ عدل و

انصاف نازل کئے تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

وحیٰ حق بینندہ سود ہم

درنگا شس سودو بہبود ہم

علاوہ ازیں، دنیاوی نظامِ حکومت میں کوئی نہ کوئی منزل ایسی آئے گی جہاں پہنچ کر قوانین کے وضع یا نافذ کرنے والے خود قانون کی حد سے بالا ہو جائیں گے، یا کم از کم ان کے فیصلوں کی اپیل کہیں نہیں ہو سکے گی۔ ڈکٹیٹر یا جو انسانی حکومت کے سلسلہ ارتقا میں آخری بھی جاتی ہے، اسی اصول پر مبنی ہے کہ ڈکٹیٹر کا ہر لفظ قانون ہوتا ہے اور وہ خود قانون سے بالاتر۔ سٹالین اپنی کتاب "لینن" میں خود لینن کے الفاظ نقل کرتا ہے کہ:-

"ڈکٹیٹر کے معنی ہیں قوت، غیر محدود قوت، ایک قاہرہ قوت، جو آئین و دستور سے بلند ہو اور اس کا ہر لفظ قانون ہو۔"

اٹلی کے ہر مدرسہ کی دیوار پر فسطائیت کے دس اصول آتشیں حروف میں لکھے جاتے ہیں جن میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ مسولینی کا ہر لفظ قانون ہے وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ المانیہ میں ہٹلر کا ہر اشارہ قانون بن کر نافذ ہوتا ہے۔ شاہ انگلستان کے متعلق بھی دستور و آئین میں یہ شق رکھنی پڑتی ہے کہ وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں ابھی پچھلے دنوں (مہاتما) گاندھی کے متعلق علائقہ کہا گیا کہ وہ منترہ عن الخطا ہیں۔ یعنی ہر جگہ اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ نظامِ آئین و دستور میں سب سے اوپر کی کڑی کسی کی مطیع و فرماں بردار نہ ہو۔ اس کے برعکس نظامِ خداوندی میں کوئی کڑی بھی ایسی نہیں ہوتی جو قانونِ خداوندی کے احاطہ اطاعت و اتباع سے باہر نکل جائے۔ بلکہ وہاں تو اطاعت اور بلندی مدارج لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی جتنا بلند ہوتا ہے اُسے اتنی ہی زیادہ اطاعت کرنی پڑتی ہے، اور وہ جتنی زیادہ اطاعت کرتا ہے اسی نسبت سے اسے سرفرازی اور سر بلندی کے مدارج عطا ہوتے ہیں۔ نظامِ خداوندی میں ذاتِ رسالت مآب کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ ظاہر و باہر ہے ۵

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن خود حضور کے لئے سب سے بڑے شرف کا مقام عِبْدُ اللہ ہے۔ اللہ کے غلام، اس کے مطیع و فرمانبردار

اور قوانینِ خداوندی کی سب سے زیادہ اتباع کرنے والے۔ ارشاد ہے:-

لے اس زمانے میں اسٹالین، روس کا ڈکٹیٹر، مسولینی، اٹلی کا ڈکٹیٹر اور ہٹلر، جرمنی کا ڈکٹیٹر تھا۔

إِشْبَعُ مَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (۶/۱۰۴)

جو کچھ تیرے رب کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کرو۔

**نظامِ کائنات** اس نظامِ کائنات کا ایک ایک ذرہ اطاعت کے اٹل اور بے پناہ قانون میں جکوا ہوا ہے۔ اگر سورج کا عظیم الشان کرہ ایک سیکنڈ کے سوئیں حصے کے برابر بھی اس

قانونِ اطاعت میں تساہل برتتے تو یہ تمام نظامِ شمسی دھنی ہوئی رُوئی کے گالوں کی طرح فضائے آسمانی میں اڑنا نظر آئے۔ خاک کے ایک ادنیٰ ذرے سے لے کر ان بڑے بڑے مجر العقول کتروں تک تمام کے تمام ایک بلند و بالا قانون کے مطیع و منقاد ہیں۔ اسی سے یہ سلسلہ نظم و ضبط قائم ہے جب کائنات کا نظم و نسق ہی یہ ٹھہرا تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ فطرت کا یہ منشا ہو سکتا ہے انسان کے لئے کسی منزل (اسٹیج) پر پہنچ کر اطاعت کا قانون غیر منزوری قرار پا جائے لیکن انسانوں کے بنائے ہوئے نظام میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص منزل پر پہنچ کر کسی نہ کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو اطاعت کے قانون سے مستثنیٰ کیا جائے۔ اس لئے کہ وہی جماعت خود قانون ساز ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ دوسرا بنیادی نقص جو دنیا میں انسانوں کے وضع کردہ نظامِ حکومت میں موجود رہتا ہے اور جس کے دور کرنے کا کوئی طریقہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ جمہوری نظام میں مجلسِ واضعین قوانین کا ہر رکن قانون کی اطاعت پر اسی طرح مجبور ہے جس طرح دوسرے انسان۔ اس لئے وہ جماعت کے قانون سے مستثنیٰ نہیں ہوتی لیکن جس جماعت کے اختیار میں ہو کہ جس وقت چاہے کوئی قانون بنا لے اور جب چاہے اس میں رد و بدل کر دے یا اسے منسوخ ہی کر ڈالے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ جماعت کس وقت تک اطاعت کی مکلف رہے گی؟ صرف اس وقت تک جب اسے اس قانون کی اطاعت میں اپنا فائدہ نظر آتا ہو۔ جب اسے اس اطاعت میں نقصان معلوم ہوگا وہ جھٹ سے قانون بدل ڈالے گی۔ جب یہ حالت ہو تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ جماعت قانون کی اطاعت پر مجبور ہے؛ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ خود قانون اس جماعت کی اطاعت پر مجبور ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان ہر دو اہم اور بنیادی نقائص کو الگ کر کے رکھ دیا، جب اس نے فیصلہ کر دیا کہ ۱۔

(۱) کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں یہ حق صرف ذاتِ باری تعالیٰ کو حاصل

ہے۔ اور

(۲) کوئی انسان ایسا نہیں جسے قانون کی اطاعت سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔



اور یہ نقائص اسی صورت میں دُور ہو سکتے ہیں جب قانون کے اصول انسانوں کے وضع کردہ نہ ہوں، بلکہ انسانوں کے اعلیٰ وارفع ہستی کے متعین فرمودہ ہوں، اللہ تعالیٰ کے اس ضابطہ قوانین کے ماتحت کسی انسان کو قانون سازی کا حق باقی نہیں رہتا۔ ان کے سپرد صرف یہ خدمت ہوتی ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات و فروعات کو ترتیب دیں اور پھر دنیا میں ان قوانین کو نافذ کریں۔ جب دنیا میں نظامِ آئینِ صحیح آزادی دستور کی یہ شکل پیدا ہوگی تو اس وقت کہا جاسکے گا کہ انسان کو فی الواقعہ آزادی حاصل ہے، کیونکہ اس وقت کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں ہوگا۔ اس وقت یہ تمام اغلال سلاسل جو بالادست انسانوں نے زبردست انسانوں کی گردن میں مختلف نام دے کر ڈال رکھے ہیں، ایک ایک کر کے اتر جائیں گے اور انسان خدا کی اس کھلی فضا میں اطمینان کا سانس لے گا اور سر اوجھا کر کے چل سکے گا۔ اس وقت وہ محسوس کرے گا کہ ے

نہ غلام اور نہ اوکس را غلام  
زشت و خوب و تلخ و زینش زحتی

بندہ حق بے نیاز از ہر مقام  
رسم و راہ و دین و آئینش زحتی

قرآن کریم نے نبی اکرم کی بعثت کا مقصدِ عظیم بھی قرار دیا ہے جب فرمایا کہ آپ اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ:-

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۵۷)

وہ ان تمام طوق و سلاسل کو اتار دیں جو انسانیت کی گردن میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یوں انسانوں کو اس بوجھ سے سبکدوش کر دیں گے جن کے نیچے وہ دب رہے ہیں۔

حضور اس مقصدِ عظیم کو لے کر تشریف لائے اور اپنی مختصر سی حیاتِ طیبہ میں اپنے رفقا کی ایک جماعت پیدا کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ اس سطحِ ارض پر خدا کی پادشاہت کیسے قائم کی جاسکتی ہے جس میں انسان اور اس کے خدا کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہ ہو۔ جب اس نظام کی تکمیل ہو گئی تو ہر دیکھنے والی آنکھ نے دیکھ لیا کہ جنتِ ارضی اسے کہتے ہیں۔ اس نظام کی تکمیل کے بعد نبی اکرم نے اپنے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ

ان الزمان قد استدار كهيئة يوم خلق الله السموات والارض

آج زمانہ مختلف چکر کاٹ کر اپنی اصلی ہیئت پر پہنچ گیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے تخلیق

کائنات کے دن بنایا تھا۔

یعنی آج انسانیت اس فضا میں پہنچ گئی ہے جو اس کے شرفِ دکریم کے عین سازگار تھی اور جسے انسانی

جذبہ تغلب و تسلط کی وسیع کاریوں نے اس قدر مکدر کر رکھا تھا۔ یہ فضا کیا تھی۔  
 فَطَرَتِ اللَّهُ النَّبِيَّ فُطَرَ النَّاسِ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ  
 الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۰/۳۰﴾  
**دینِ قیم** | اللہ کا وہ قانون تخلیق جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا اور جس میں کوئی  
 رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے دینِ قیم (ایک محکم اور مضبوط قانونِ حیات) لیکن اکثر  
 لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں۔

یہ ”دینِ قیم“ کیا ہے، اسے وعظِ یوسفی کے الفاظ میں سنئے۔ فرمایا:-  
 لِيُصَاحِبِي السَّجْنَاءَ أَرْبَابٌ مُّنتَفِرُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۲/۴۰﴾  
 اے قید خانے کے ساتھیو! ذرا سوچو تو سہی کہ کیا مختلف اور تفریق خدا ”(آقا) مجھے میں یا ایک خدا  
 جو تمام قوتوں کا مالک ہے؟“

مَا نَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاءُكُمْ ﴿۱۲/۴۰﴾  
 تم اللہ سے ورے جن آقاؤں کی محکومی اختیار کر لیتے ہو، ان کی حقیقت سوائے اس کے اور کچھ نہیں  
 کہ تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے کچھ نام مقرر کر رکھے ہیں (اصطلاحات وضع کر چھوڑی ہیں)۔  
 مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ﴿۱۲/۴۰﴾  
 ان ”خداؤں“ (آقاؤں) کی محکومی اختیار کرنے کے لئے اللہ کی طرف سے تمہارے پاس کوئی سند  
 نہیں ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ﴿۱۲/۴۰﴾  
 یاد رکھو! حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے  
 أَمَرَ إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا آيَاتُهُ ﴿۱۲/۴۰﴾  
 اس نے حکم دے رکھا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومی اختیار نہ کرو۔  
 ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۲/۴۰﴾  
 یہ ہے دینِ قیم لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے نا آشنا ہیں۔



## باب دوم

اس مختصرے مضمون میں یہ بتانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ اس نظام زندگی میں جو حکومتِ الہی کے ماتحت مرتب ہوتا ہے، یہ دنیا جسے انسانی چہرہ و ستیوں نے جہنم زار بنا رکھا ہے، کس طرح امن و سکون کی جنت بن جاتی ہے۔ اس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ البتہ اس وقت ہم ان دو اصولی **دولت اور قوت** باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جن کی غلط بنیادوں کی وجہ سے انسانیت کا گلا گھٹ رہا ہے۔ اور اضطراب و عدم اطمینان کی آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ رہے ہیں۔ یہ دو بنیادی چیزیں ہیں، دولت اور قوت (WEALTH, PROPERTY & POWER) کی غلط تقسیم اور ان کا غلط استعمال۔ تاریخ عالم پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ دولت اور قوت کا بے جا استعمال ہی تمام فتنہ سامانیوں کا سرچشمہ ہے۔ اجمالاً دیکھئے کہ صنابطہ خداوندی ان دونوں فتنوں کا کس طرح سے سدباب کرتا ہے اور انہیں کس طرح حدود و قیود کی پابندیوں میں گھیر کر ان سے ایسا کام لیتا ہے جیسے کسی انجن میں بھاپ ہو چند موٹے موٹے عنوانات پر غور فرمائیے۔

(۱) زمین کسی کی ملکیت نہیں | زمین پر ذاتی قبضہ اور اس کی ناہموار تقسیم دنیا میں عظیم الشان فتنوں کا باعث بنی رہی ہے اور بن رہی ہے۔ ایک شخص کے پاس دس ہزار بیگھے زمین ہے جس پر وہ بلا شرکتِ غیرے قابض ہے اور وہ باپ سے بیٹے کی طرف وراثتاً منتقل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا شخص ہے جسے سال بھر کے اناج کے لئے زمین کا ٹکڑا نہیں ملتا اس کے لئے وہ زمین کے مالک کا محتاج ہے۔ وہ دن کی چلچلاتی دھوپ اور رات کے کڑکڑاتے جاڑے کی محنت کا حاصل زمین کے مالک کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا ہے اور اپنے بچوں کی روٹی کے لئے اس کے ہاتھوں کی طرف تکتا ہے۔

حاصل آئین و دستورِ ملوک

وہ خدا یاں فر بہ و دہمقاں چودوک

قرآن کریم زمین کی شخصی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک زمین 'رزق حاصل کرنے کا ذریعہ' ہے اس لئے اس کی تقسیم لوگوں کی محنت اور ضرورت کے اعتبار سے ہونی چاہیے اور اس کا نظم و نسق اس جماعت کے ہاتھ میں جو حکومتِ الہی کے قیام کے لئے متمکن ہو، ہر حد کے آزاد قبائل کے متعلق کہتے ہیں کہ وہاں آج بھی یہ حالت

ہے کہ گاؤں کا خان ہر تیسرے یا پانچویں برس "بندوبست" کی تجدید کرتا ہے اور ہر شخص کی ضرورت اور محنت کے مطابق زمین کے ٹکڑے تقسیم کر دیتا ہے۔ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوتی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کچھ مدت کے لئے فائدہ حاصل کرنے کے لئے عطا فرمایا ہے (مَتَاعٌ اِلٰی حَيٰثِنِ) نہ کہ اس پر سانپ بن کر بیٹھ جانے کے لئے۔

حق زمین را بجز متاع مانگفت	ایں متاع بے بہا مفت است بہت
دہ خدا یا انکتہ از من پذیر	رزق و گورازو سے بگیر اور امیگر
باطن الارض بئد ظاہر است	ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
رزق خود را از زمین بردن روا است	ایں متاع بندہ و ملک خدا است

صرف زمین ہی نہیں بلکہ رزق کے جس قدر چشمے مبدار فیض کی کرم گستری سے انسان کو مفت عطا ہوتے ہیں، قرآن کریم انہیں ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھتا ہے تاکہ ہر شخص اپنی محنت اور ضرورت کے مطابق ان سے متمتع ہو۔ فرمایا:-

وَجَعَلْ فِيهَا رَوْاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبُرُكٌ فِيهَا وَقَدْ رَفِئَهَا آقْوَاتُهَا فِي فِئَةِ  
اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَاءً لِّلشَّائِثِيْنَ ۝ (۴۱/۱۰)

اور (اللہ نے) زمین کی سطح پر پہاڑ پیدا کئے اور اس میں (ایسی چیزیں پیدا کیں جو موجب برکت ہیں اور اس میں چار فصلوں میں خوراک کے سامان پیدا کئے) ان سب کے دروازے (ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کشاہدہ ہیں۔

(۲) دفاہن و غزائن | قرآن کریم انسان کو اس کی محنت کے ما حاصل کا مالک قرار دیتا ہے۔ لیکن اس کی اجازت کبھی نہیں دیتا کہ دولت کے انبار کے انبار جمع کر کے رکھ لئے جائیں، کیونکہ دولت کے تو معنی ہی "گردش کرنے" کے ہیں۔ جب وہ گردش (CIRCULATION) سے رُک جائے تو دولت نہیں رہتی، نوع انسانی کے لئے عذاب بن جاتی ہے۔ اس لئے دولت کو روک رکھنے والوں کے لئے سخت وعید آتی ہے۔ ایک جگہ فرمایا:-

کس قدر بد بختی ہے اس کے لئے جو دولت کو جمع کرتا ہے اور پھر اسے گننا رہتا ہے (کہ اس میں کتنا اضافہ ہوا) کیا یہ سمجھتا ہے کہ یہ دولت اس کے پاس ابد الابد تک رہے گی؟ کبھی نہیں! بلکہ یہ تو اسے ایک ایسے ٹکڑے کر دینے والے جہنم میں لے جائے گی جس کی آگ کے شعلے

دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ (۱۰۴/۲-۶)

دوسری جگہ فرمایا:-

جو لوگ چاندی اور سونے کے دینے بنا رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں ایک دردناک عذاب کی بشارت دیکھتے جس دن ان سکوں کو آگ میں تپایا جائے گا اور ان کی پیشانی اور پہلو اور کمر کو داغ دیا جائے گا (اور کہا جائے گا کہ ہاں!) یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے روکے رکھا تھا۔ سواب اس کے روکنے کا مزہ چکھو۔ (۹/۲۴-۳۵)

دنیا میں آج دولت کی اس قدر فراوانی ہے کہ ازمنہ سابقہ میں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی لیکن بایں ہمہ دنیا میں جس قدر بھوک اور افلاس آج ہے اس کی

(۳) **روپیہ کی گردش**

بھی کہیں نظیر نہیں ملتی۔ ماہرین اقتصادیات اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ روپیہ کی گردش (CIRUCLATION) صرف اوپر کے طبقہ میں رہتی ہے۔ روپیہ نیچے نہیں اُترتا۔ قرآن کریم نے آج سے چودہ سو برس پیشتر جب دنیا معاشریات کے جدید اصولوں سے نا آشنا تھی، کس قدر واضح الفاظ میں فرمادیا کہ روپیہ کی گردش اس انداز سے مت کر دو کہ

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (۵۹/۷)

وہ تمہارے امراء کے طبقہ میں ہی گردش کرتا رہے۔

آج دنیا کی ہمیب ترین لعنتوں میں سب سے بڑی لعنت سود ہے۔ یعنی روپیہ کسی ایسی جگہ سے جہاں وہ بلا ضرورت پڑا ہے ایسی جگہ آتا ہے جہاں اس کی احتیاج ہے تو وہ سود کی لعنت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ ضابطہ خداوندی کی رو سے سود وہ جرمِ عظیم ہے کہ جسے خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا گیا ہے (۱۲/۲۷۹)۔

ازربا آخر چرمی زائد؛ فتن  
ازربا جہاں تیرہ دل چوں نشت و سنگ  
کس نداند لذتِ قرضِ حسن  
آدمی درندہ بے دندان و جنگ



جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ہم نے حکومتِ الہی کے اس شعبہ نظام کوئی بھوکا نہیں رہ سکتا کے متعلق صرف اشارات پر اکتفا کیا ہے، تفصیل اس اجمال کی طویل ہے۔

لیکن اس نظام کا عملی اور زندہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو اس نظام کی حفاظت میں لے آتا ہے وہ کبھی بھوکا نہیں رہ سکتا۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ اس کے رزق کی ذمہ داری اس نظام پر عائد ہو جاتی ہے۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس عہد کے کیا معنی ہیں کہ:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

رُوئے زمین پر کوئی ایسا جاندار نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ نے نہ لیا ہو۔

دیکھنے کو تو یہ آیت مقدسہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے، لیکن غور فرمائیے کہ اس کے اندر نظام انسانیت کا کس قدر مہتمم باشان اصول کار فرما ہے۔ کیا انسان اپنے دماغ سے کوئی ایسا نظام وضع کر سکا ہے جس میں صرف انسان ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری نظام مملکت نے اپنے سر لے لی ہو؟ انسانی حکومت کی تاریخ کے کسی دور میں بھی آپ کو یہ چیز نہیں ملے گی۔ سب سے پہلی مرتبہ اس کا اعلان حکومت الہیہ کی طرف سے ہی ہوا اور اسی نے ہمیں بتایا کہ

کس نمائندہ درجہاں محتاج کس نکتہ شرع میں ایں است دس

یہ چیز آپ کو صرف اسی نظام میں ملے گی کہ اُمت کا بلند ترین فرد امیر المؤمنین ردئی کا ایک لقمہ اپنے منہ میں نہیں ڈال سکتا جب تک اسے پورا اطمینان نہ ہو جائے کہ جس حلقہ کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد پیٹ بھر کر سکھ کی نیند سو گیا ہے۔ آج انسان کی حالت یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ پر ضابطہ خداوندی کی بجائے اپنے خود ساختہ ضوابط کو مسلط کر رکھا ہے اور جب اس نظام کے نتائج بھوک، افلاس، ذلت و نکبت، پریشانی و تباہ حالی کی شکل میں سامنے آتے ہیں تو اس کا الزام خدا پر دھرتا ہے۔ اور اس کے بعد ان مصائب کا حل پھر کسی اپنے ہی متعین کردہ نظام میں تلاش کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ اپنے آپ کو خدا کے نظام کے حوالے کر دے تو پھر دیکھے کہ یہ تمام مشکلات کس طرح خود بخود آسان ہو جاتی ہیں؛ نظام اپنے اوپر مسلط کر لینا طاغوتی اور نتائج تلاش کرنے ملکوئی! اگر کھلی ہوئی جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟ زلزلہ میں بوسیدہ مکان کے اندر پناہ لینے والے کا انجام ہلاکت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؛ ذرا خدا کی چھت کے نیچے آئیے اور پھر دیکھئے کہ وہ آپ کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے یا نہیں؟

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ

لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ (۲/۲۵۶)

جو غیر خدا (کے سرکش نظام) سے مُنہ موڑ کر اللہ پر ایمان لے آتا ہے تو اسے ایک ایسا محکم اور پائیدار  
سہارا مل جاتا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

یہ پائیدار سہارا "وہ نظامِ خداوندی ہے جس کے بعد دنیا کے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ  
انسان کی ذہنیت بدل دیتا ہے۔ ساری دنیا کی کیفیت بدل دیتا ہے۔

چوں بجاں در رفت جہاں دیگر شود جہاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود



اس عالم کو ن و فساد میں دو سرا انسانیت سوز فتنہ قوت کا غلط استعمال ہے۔  
**قوت** (POWER) قوت در حقیقت دولت ہی کے عملی نتیجہ کا نام ہے۔ سرکشی و تمرد، استبداد و  
فرعونیت، بلا گنج قارون کہاں پنپ سکتی ہے۔ پھر جس طرح دولت بجائے خویش بُری چیز نہیں بلکہ اس کا غلط استعمال  
بلاکت آفریں ہے، اسی طرح قوت کے اندر بھی بجائے خود کوئی خرابی نہیں، البتہ اس کا بیجا استعمال تباہی و بربادی کا  
ایسا بلا انگیز طوفان پیدا کرتا ہے کہ

اس سیلِ سبک سیر و زمین گیر کے آگے

عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

حکومتِ الہی میں قوت پر ایسی پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں کہ وہ ایک سرکش طوفان بننے کے بجائے ساحلوں  
میں گھرا ہوا دریا بن جاتی ہے جس سے ہزار قسم کے فائدے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ نظامِ خداوندی میں قوت،  
ظلم و ستمگری کی حمایت کے لئے نہیں، بلکہ ظالم و قہرماں کا بخور و ستم روکنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ وہ غاصب  
و سفاک کی شمشیر بے نیام نہیں بنتی بلکہ مظلوم و ستم رسیدہ کے لئے سپر کا کام دیتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ قوت  
لا دیں ہو تو ہے زہر بلا بل سے بھی بڑھ کر  
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق



تاریخِ عالم شاہد ہے کہ استبداد کا آہنی پنجہ سب سے پہلے حریتِ فکر اور آزادی  
**آزادیِ مذاہب** مذہب کا گلا گھونٹتا ہے۔ ساحرینِ فرعون نے جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ  
حق و صداقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے تو انہوں نے بلاتامل اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ اس پر فرعون کی

آنکھوں سے جلال کے شرارے نکلنے لگے غضب و انتقام کا سیلاب جوش میں آگیا۔ قوت کے نشے میں بچھ کر بولا۔  
 اَمْنُؤْ لَهُ قَبْلَ اَنْ اَذْنَ لَكُمْ..... (۲۰/۴۱)

ہیں! تم اس پر میری اجازت کے بغیر ہی ایمان لے آئے! اب دیکھو کہ میرا انتقام کیا کرتا ہے۔ ابھی  
 تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تمہیں سُولی پر لٹکاتا ہوں۔

یہ صرف ایک واقعہ ہے۔ دنیا کی تاریخ کے ایک ایک ورق پر اس قسم کے واقعات خون کے حروف سے لکھے  
 ملتے ہیں۔ لیکن یہ اعلان آپ کو حکومتِ الہی کے دربار ہی سے ملے گا کہ

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲۲/۵۶)  
 دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں۔ ہدایت اور گمراہی واضح ہو چکی۔

اس لئے

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِرْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۸/۲۹)  
 جس کا جی چاہے ایمان لے آئے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

حکومتِ خداوندی میں مذہب کے معاملہ میں صرف آزادی ہی نہیں بلکہ وہاں ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔  
 مسلمان صاحبِ قوت و اختیار ہوں تو ان پر لازم آتا ہے کہ بوقتِ ضرورت دیگر اہل مذاہب کی پرستش گاہوں کی  
 حفاظت کریں۔ اس لئے کہ

لَوْلَا دَفَعُ اللهُ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفُتِنَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ  
 وَمَسْجِدٌ يُدْعَرُ فِيهَا اسْمُ اللهِ كُفْرًا (۲۲/۳۰)

اگر اللہ بعض انسانوں (کی قوت) کے ذریعہ دوسرے انسانوں (کی سرکشی) کی روک تھام نہ کرے  
 تو زہاد کے غلوت خانے، نصاریٰ کے گرجے، یہودیوں کے صومعے اور مسلمانوں کی مسجدیں سب  
 منہدم ہو جائیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی قوم تمہارے ساتھ دشمنی کرے تو تم ان کے بارے  
**عدل و انصاف** میں عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ یہ نہ ہو کہ ان کی عدلوت کی بنا پر تمہارے  
 دل میں انتقام کے جذبات پیدا ہوں اور ان جذبات کی تسکین کے لئے تم بے انصافی پر اتر آؤ۔



لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا (۵/۸)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان سے بے انصافی کرنے لگو۔

آپ اقوامِ گزشتہ کی تاریخ کے اوراق اُلٹتے جائیے۔ سیاستِ عصرِ حاضرہ پر گہری نگاہ ڈالنے اور دیکھنے کہ کہیں کسی ایک جگہ بھی آپ کو یہ بلند اصول دکھائی دیتا ہے؟ کیا انسانوں کے وضع کردہ نظام و دستور میں یہ ممکن ہے کہ معاندت و عداوت کا جواب عدل و انصاف سے دیا جائے؟ اس سے بھی آگے بڑھتے۔ دشمن برسرِ پیکار ہے۔ اس کی قوم کا کوئی فرد آپ سے پناہ کا طالب ہے، ارشاد ہے کہ اسے پناہ دو۔ خدا کا کلام سناؤ۔ اس کے بعد اگر وہ اپنے ہاں واپس جانا چاہے تو اپنی حفاظت میں اُسے اس کی جائے امن تک پہنچا دو (۹/۶)۔

”جنگ اور قرآن کریم“ کے عنوان پر کسی دوسری فرصت میں مفصل لکھا جائے گا۔ اس وقت صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ خدا کی حکومت میں جنگ، فتنہ و فساد کے استیصال کی خاطر ہے، نہ کہ فتنہ و فساد پھیلانے کی غرض سے۔ اگر مقصد محض تسخیرِ ممالک ہو، جو ع الارض کی تسکین ہو، تو وہ جنگِ سلطنت کی جنگ ہو جاتی ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ لیکن اگر جنگ کی غرض جو رد و استبداد کی بجائے حکومتِ الہی کا قیام ہو جس میں انسانیت کو صحیح آزادی حاصل ہوتی ہے، تو یہ جنگ عین منشاءِ خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک زہر آلود مہلک ناسور کا آپریشن مریض پر ظلم ہے۔

صلح، شہِ گروہ و چومقصد است غیر      گر خدا باشد غرض جنگ است خیر

گر نہ گردد حق ز تیغِ مابلند      جنگ باشد قوم را نارجمند

جب قوت و اختیار، ضابطہِ خداوندی کے ماتحت، حاصل ہوتا ہے تو وہ جماعت جو قوانینِ الہی کے نافذ

کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے، اس انداز کی ہوتی ہے کہ

الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَتَوْا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ

وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲/۴۱)

وہ لوگ اگر تمہیں فی الارض ہوتے ہیں تو اس لئے کہ نظامِ صلوة مستحکم کریں، نوعِ انسانی کی ربوبیت

کا سامان ہم پہنچائیں۔ ہر جگہ عدل و انصاف (نیک امور) کا حکم جاری کریں اور ظلم و تشدد کی بُری باتوں

کی روک تھام کریں۔

اس جماعت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف

وصل و فصاشس لایراعی لایخاف

یہ وہ کسی کی بے جا رعایت کرتے ہیں، نہ کسی سے ڈرتے ہیں۔ ان کی صلح اور دشمنی دونوں حق و انصاف پر مبنی ہوتی ہیں۔

یہ ہے اجمالی سا خاکہ اس حکومتِ الہی کا جس کے قیام کے بعد انسان، وحشت و درندگی، سبیت و بربریت کی زندگی چھوڑ کر صحیح انسانیت کی زندگی اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح وہ ارتقائی منازل طے کرتا ہے جن کے بعد وہ اس نصب العین تک پہنچ سکتا ہے جس کا حصول اس کی تخلیق کا مقصد ہے۔

وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ



# اسلام اور مذہبی رواداری

(نوشتہ جون ۱۹۳۹ء)

غالباً آپ نے سنا ہوگا کہ ایک مکتب میں جب بچوں کو شرارت سوجھتی اور وہ مولوی صاحب کے پنجہ استبداد سے کم از کم کچھ وقت کے لئے چھوٹنا چاہتے تو وہ منظم سازش کرتے۔ ایک آتے ہی کہتا۔ اوہو اقبلہ خیریت ہے آج نصیب اعدا کچھ طبیعت مضحل سی نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھائی رات کچھ دیر سے سویا، اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ دوسرا آتا اور السلام علیکم کے بعد مولوی صاحب کے چہرے پر مترددانہ نگاہ ڈال کر پوچھتا کہ مولا نا خیریت ہے! آنکھیں مٹرخ ہو رہی ہیں۔ چہرے پر کچھ تمازت کے آثار بھی ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھئی کچھ اعضا شکنی سی محسوس ہو رہی ہے۔ تیسرا ابھی آکر بیٹھے بھی نہ پاتا کہ ایک گہری تشویش سے پوچھتا کہ مولوی صاحب! مزاج گرامی میں کچھ خرابی سی نظر آرہی ہے۔ اب مولوی صاحب پر **پروپیگنڈے کا اثر** کا دل بھی ڈوبنا شروع ہو جاتا۔ فرماتے ہیں کہ ہاں کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی ہے۔ چوتھا طالب علم ابھی آنے بھی نہ پاتا کہ مولوی صاحب لحاف اوڑھے حجرے میں دراز ہیں اور نبض پر ہاتھ رکھو تو سچ مچ تپ چڑھ رہی ہے۔

مولوی صاحب کے بخار آجانے کا واقعہ افسانہ ہو یا حقیقت، لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ پروپیگنڈا اگر منظم طریقہ سے کیا جائے تو فی الواقع قلب ماہیت پیدا کر دیتا ہے۔ اشیا کی نوعیت اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے زاویے بدل دیتا ہے۔ جو چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے تسلیم کر لیتا ہے۔ یہی وہ سحر سامری ہے جس کی نگاہ بندی سے قوموں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ لَهْمُ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَانَا وَ لَهْمُ اَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَانَا وَ لَهْمُ اُذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَانَا (۲/۱۷۹) آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی عینک سے ہیں کان

اپنے ہیں لیکن سنتے کسی اور کے آوازِ صوت سے ہیں دل اپنے میں لیکن سمجھتے کسی اور کے دماغ سے ہیں۔ اُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلَّغْنَا لَهُمُ الْعِلْمَ ۖ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۲/۱۷۹) بالکل ہنر ماسٹرز دانتس ہوتے ہیں۔

اسلام کے ساتھ کبھی دنیا میں یہی ہوا۔ اس نے کبھی اپنی تربیت گاہ سے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ یورپ کے اربابِ حل و عقد کو اس سے خواہ مخواہ ایک خطرہ محسوس ہوا اور انہوں نے اس کا بہترین علاج یہی سوچا کہ اسلام کو اس کے اصلی خط و خال میں کہیں ظاہر نہ ہونے دیا جائے۔ اربابِ سیاست کے پیش نظر کچھ اپنی مصلحتیں تھیں۔ خداوندانِ مذہب اپنی سیادت کا تحفظ چاہتے تھے۔ چنانچہ دونوں گروہ اس مشترکہ مقصد کو لے کر اٹھے اور زبانِ قلم کے زور سے اسلام کی ایک ایسی بھیاناک تصویر کھینچی کہ غیر تو غیر خود اپنے کبھی جب اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو کانپ کر رہ جائیں۔ جب دولتِ یورپ کا تسلط دیگر ممالک پر ہوا تو انہوں نے وہاں بھی اس مقصد کو فراموش نہیں ہونے دیا اور چونکہ قاعدہ ہے کہ حاکم قوم کی ہر ادائیں ایک شانِ خداوندی نظر آیا کرتی ہے، لہذا

**اسلام کی تصویر** اقوامِ یورپ نے اسلام کی تصویر کے جو ایڈیشن شائع کئے دل و دماغ کے چوکھٹوں میں فریم کر کے رکھ لئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا تہذیبِ تمدن

میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے، قتل و غارتگری، بربادی و تباہی، ہلاکت و خونریزی، جور و ظلم، ستم و استبداد کے خونی مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جن میں لظراً آتا ہے کہ (معاذ اللہ) وحشی و خونخوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول، نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں، سیلِ حوادث کی طرح کھٹ بردہاں بڑھتے چلے آ رہے ہیں، جن کے جلو میں بیعت و بربریت کے محبتے، ہولناک آہن پوش جنات کی شکل میں آگ اور خون کی ہولی کھینٹے، اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں میں اُمنڈتے چلے آتے ہیں اور اس قہرِ خداوندی، اس سیلابِ بلا، اس طوفانِ بدتمیزی کے سامنے، تہذیب و تمدن، علم و عمرانیات، عدل و انصاف، عفت و عصمت، مذہب و مسلک، ایک ایک کر کے جڑ سے اکھڑتے چلے جاتے ہیں۔ مظلوموں کی فریاد، یتیموں کی آہ و بکا، بیواؤں کا نالہ و فغاں، آسمان تک جاتا اور ٹکرا کر واپس آجاتا ہے گویا (نعوذ باللہ) اس خونخوار قوم کے خدا کا دروازہ ان سب پر بند ہے۔ جہاں جہاں سے یہ قیامتِ صغریٰ گزرتی ہے، آبادیاں ویرانہ بن جاتی ہیں، بستیاں اُجر جاتی ہیں، کتب خانے جل کر راکھ کا ڈھیر رہ جاتے ہیں، تہذیب و تمدن کے آئینہ دار قصر شاہی کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں، کہیں ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے انبار نظر آتے ہیں، کسی جگہ زنا کار کا ڈھیر دکھائی دیتا ہے۔ مندر و مینار میں، گرجے و مسمار میں، نہ برہمن کو کہیں امن ہے، نہ کلیسا کے راہب کے لئے امن، نہ عورتیں محفوظ

ہیں نہ بچے مصنون کچھ قتل کر دیئے گئے، جو باقی بچے وہ ناک میں نکیل ڈلوائے حبشی سرداروں کے کوڑے کھاتے نحاس کی طرف گھسٹتے چلے جا رہے ہیں کہ وہاں انسانیتِ عظمیٰ دو دو ٹکوں میں فروخت کی جائے۔

غرضیکہ یہ ہے وہ "تصویر" جو اسلام کے نام کے ساتھ ہی سامنے آکر آنکھوں کی پتلیوں میں سکتے پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھنے والے کا خون کھولنے لگتا ہے، حقارت و تنفر، انتقام و مواخذہ کے بخارات قلب سے اُٹھ کر دماغ پر چھا جاتے ہیں اور اسے اس "عالم سوز تہذیب اور رنگِ انسانیتِ تمدن" کو امن و سلامتی کی دنیا سے منادینے کی مختلف تدابیر و خیالات کی جولانگاہ بنا دیتے ہیں، آئیے! آج کی مختصر سی صحبت میں دیکھیں کہ جس تصویر کو آپ کے سامنے اس شکل میں پیش کیا جاتا ہے اس کے صحیح خطوط کیا ہیں اور جس تہذیبِ تمدن کو تواریخ اور آگ کی نسبت سے انسانیت سوز سمجھا جا رہا ہے اس کی اصلیت کیا! اسلام کی صورت مسخ کرنے والوں کی یہ بے باک جراتیں فی الحقیقت قابلِ داد ہیں کہ یہ سب کچھ ایک ایسے دین کے متعلق پیش کیا جاتا ہے جس کا اصل دستور اساسی ایک ایک حرف اور نقطہ کی صحت کے ساتھ دنیا کے ہر کتب فروش کی دکان سے مل سکتا ہے۔ اس مضمون میں ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ خدا کی اس بادشاہت میں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے گا۔ ہم اس وقت تاریخی شہادت سے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حکومتِ الہی میں پوری طاقت اور قوت ہوتے ہوئے محکوم و مفتوح غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اور انہیں مذہبی آزادی کس درجہ حاصل تھی۔ اس مضمون میں ہم تاریخی شہادات بالعموم غیر مسلم مصنفوں اور مورخوں کے حوالوں سے پیش کریں گے تاکہ کسی قسم کے تعصب، جنبہ داری اور رجحانِ قلبی کا شائبہ نہ رہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ وہ سلطنت جسے ہم "خدا کی بادشاہت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں قرونِ اولیٰ کے ایک مختصر عرصے پر مشتمل تھی، اس کے بعد جو حکومت قائم ہوئی اُسے آپ مسلمانوں کی سلطنت تو کہہ سکتے ہیں، لیکن صحیح معنوں میں خدا کی حکومت نہیں کہہ سکتے۔ بایں ہمہ اس حکومت میں بھی چونکہ مسلمانوں کے سامنے اسلامی روایات کے کچھ نہ کچھ نقوش موجود تھے، اس لئے غیر مسلموں سے رواداری کے باب میں اس زمانہ میں بھی ہمیں ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو دوسرے مذاہب کی سلطنتوں میں معدوم ہیں۔

اگرچہ غیر اقوام کے ساتھ ربط و ضبط عہد رسالتِ مآب ہی سے شروع ہو گیا تھا اور فتحِ خیبر، یہود مدینہ اور فتحِ مکہ جیسے مقامات پر جس قسم کی رواداری کی مثالیں ملتی ہیں تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، لیکن بحیثیتِ مجموعی عہدِ فاروقی سے اس کا سلسلہ بڑھا ہے۔ اور چونکہ اس عہد کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلنے

کی کوشش کی گئی ہے اس لئے ہم شروع میں اسی عہد کے چند ایک واقعات پر نظر ڈالتے ہیں۔ اسلامی عہدِ حکومت میں غیر ملکی رعایا کو ذمہ داری کہا جاتا تھا۔ جب یروشلم فتح ہوا ہے تو وہاں کے ذمیوں کے ساتھ ایک عہد نامہ ہوا۔ اس کے اقتباسات سے اندازہ لگائیے کہ بحیثیت فاتح، مغلوب و مفتوح **یروشلم کے عیسائی** قوم کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا گیا۔

یروشلم کی غیر مسلم رعایا کو ان کی جان و مال، اولاد اور عبادت گاہوں، صلیبوں اور ہر اس چیز کی جو ان کی ملکیت میں ہے حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے۔ ان کی زمینوں اور ان کے مذہب میں کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے گا۔ ان کے کلیساؤں کو نہ تو مہندم کیا جائے گا اور نہ کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے گا۔ ان کے اوقاف اور ان کے وفار کو بحال رکھا جائے گا۔ اہل یروشلم کو اپنے مذہب کی پابندی میں ہر قسم کی آزادی ہوگی اور ان پر کسی قسم کا ظلم و ستم روا نہیں رکھا جائے گا۔

فتح یروشلم کے بعد جب حضرت عمرؓ گرجے کا ملاحظہ فرما رہے تھے تو نماز کا وقت آگیا۔ بطریق نے کہا کہ آپ وہیں نماز ادا کر لیں، لیکن آپ نے اس سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ مبادا بعد میں آنے والے مسلمان سنتِ عمرؓ کی تقلید میں اس گرجے کو مسجد میں تبدیل کر لیں۔ تالیفِ قلوب بالغ نظری اور مذہبی رواداری کا یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے سرولیم میورجیا متعصب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور اس نے اپنی کتاب (THE CALIPHATE ITS RISE AND FALL) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب دیگر اقوام عالم

میں مذہبی تعصب جنوں کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اسی یروشلم میں مسلمانوں کی فتح سے پیشتر ہر قتل نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ فلسطین، شام، ایشیائے کوچک اور مصر سے تمام یہودیوں کے اخراج کا حکم عام تھا اور ان پر جس قدر مظالم توڑے جاتے ان کی کبھی دادرسی نہ ہو سکتی تھی۔ غیر مذہب والوں ہی سے نہیں، بلکہ عیسائی جو اس خاص فرقہ سے متعلق نہ تھے جس کا ہر قتل پیرو تھا، ہر قسم کے مظالم کا شکار ہوتے تھے، چنانچہ یعقوبی فرقہ کا ایک بطریق لکھتا ہے کہ:-

”ہر قتل نے اپنی مملکت میں اعلان کر رکھا تھا کہ جو عیسائی اس کے مشرب اور مسلک سے متعلق

نہ ہو اس کی ناک اور کان کاٹ دیئے جائیں اور اس کا گھر بار لوٹ لیا جائے۔ یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں کو ہرقل اپنے سامنے نہیں آنے دیتا تھا، لہذا ان کی کہیں شنوائی نہیں ہوتی تھی یہی وجہ تھی کہ خدائے جبار نے بنی اسمعیل کے گھرانے سے ایک ایسی ہستی کو مبعوث کر دیا جس نے ہمیں ظالم رومیوں کے پنجہٴ استبداد سے نجات دلائی، چونکہ ان علاقوں کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے کسی عیسائی سے اس کے مذہب کے معاملہ میں تعرض نہ کیا، جو معبد کسی کے قبضہ میں تھا وہ اسی کے پاس رہنے دیا۔ اس لئے یہ تو نہ ہو سکا کہ ہمارے چند ایک گرجے جن پر \_\_\_\_\_ رومی قبضہ کر چکے تھے واپس مل جاتے لیکن ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رومیوں کے مظالم سے چھوٹ گئے اور ہمیں عربوں کے ساتھ امن کی زندگی میسر آئی۔<sup>۱</sup>

**مصر میں** | یہی حالت مصر میں تھی۔ ایک آرمینین عیسائی ابوصالح، جو تیرہویں صدی کے شروع میں گزرا ہے، لکھتا ہے:-

”یہ ایسا وقت تھا کہ شہنشاہ (قیصر) قدیم مذہب کے پرستار عیسائیوں پر بے حد ظلم و ستم کرتا تھا اور انہیں زبردستی اپنے فرقے میں داخل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ہرقل اور مقوتس کے ہاتھوں حقیقت پسند عیسائیوں نے بے حد تکالیف اٹھائیں جب مظالم انتہا کو پہنچ گئے، تو ملتِ حنیفہ کی ایک قوم اٹھی، جس نے رومیوں کے سخت اور تکبر کو توڑا اور مصر کو فتح کر کے یعقوبی فرقے کے عیسائیوں کو رومیوں کے مظالم سے نجات دلائی۔“<sup>۲</sup>

چنانچہ فتح مصر کے وقت حضرت عمر بن عاصؓ نے تمام اہل مصر کو ایک شرائط نامہ لکھ کر دیا جس کی رو سے ان کے املاک، نفوس اور اولاد سب محفوظ تھیں۔ انہیں کامل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ان کے گرجے اور معبد بالکل مصئون تھے اور دشمنوں کے حملوں سے ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ تھی۔<sup>۳</sup>

۱۔ (CHRONIQUE DE MICHEL LE SYRIAN-II-412-413)

۲۔ (THE CHURCHES AND MONESTRIES OF EGYPT-PP. 30-31)

۳۔ (THE PREACHING OF ISLAM ARNOLD)

**دمشق میں** فتح دمشق کے وقت ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے بڑے بڑے مقنن اور سیاستدان سنتے ہیں اور انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں مسلم افواج دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں۔ ایک طرف حضرت خالدؓ تھے دوسری طرف ابو عبیدہؓ۔ حضرت خالدؓ ایک رات خندق پار کر کے قلعہ کی دیوار پر چڑھ گئے۔ نیچے اتر کر دروازہ کھول دیا اور مسلم فوج ورنہ شہر میں گھس آئی۔ عیسائیوں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو فوراً دوسری طرف جا کر چپکے سے حضرت ابو عبیدہؓ سے صلح کر لی۔ چنانچہ ایک طرف سے حضرت خالدؓ بحیثیت فاتح شہر میں بڑھتے چلے گئے، اور دوسری طرف سے ابو عبیدہؓ بحیثیت معاہد بڑھتے آئے۔ وسط شہر میں دونوں فریق آئے۔ نصف شہر بہر حال لڑائی میں فتح ہوا تھا اور اس حصہ کے ساتھ ان شرائط کے ماتحت سلوک ہونا چاہیے تھا جو ان سے بحیثیت فاتح ملے ہو تیں۔ لیکن حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا کہ چونکہ انہوں نے اہل شہر سے صلح کر لی ہے اور وہ انہیں امان دے چکے ہیں اس لئے ان سب کو حلیف ہی شمار کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اہل شہر سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ایفائے عہد کے متعلق یونان کے مقنن اعظم سولن نے لکھا ہے کہ معاہدہ مکزی کا حال ہے جو اپنے سے کمزور کو الجھالیتا ہے اور اپنے سے قوی کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔

”اے مسلمانو! ہم تمہیں باز نطینی حکمرانوں پر ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ وہ ہمارے ہم مذہب ہیں۔

اس لئے کہ تم معاملہ میں ان سے کہیں بہتر ہو اور ہم سے ہمیشہ عدل و انصاف سے پیش آتے ہو۔

اور تمہاری حکومت ان سے بدرجہا اچھی ہے کہ انہوں نے تو ہمارے گھر بار ہم سے چھین لئے۔“

**حمص میں** حمص میں مسلمانوں نے کچھ عرصہ تک اپنی چھاؤنی رکھی۔ عیسائیوں کی افواج نے جب دوبارہ حملہ کیا تو حمص کے عیسائیوں نے اپنے شہر کے دروازے بند کر لئے اور ان سے کہہ دیا کہ جاؤ، تم سے ان مسلمانوں کی حکومت ہزار درجہ بہتر ہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو فوجی ضرورت کے ماتحت کسی دوسری جگہ منتقل ہونا پڑا تو اہل شہر روتے تھے اور التجا میں کرتے تھے کہ خدا کے لئے جلدی واپس آنا تاکہ ایسا نہ ہو کہ رومن عیسائی پھر ہم پر حکومت کرنے کو آجائیں۔ اللہ اللہ!

تو نخلِ خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن

ہمہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند



اسی حصے کا واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے ان سے سال بھر کا خراج وصول کیا، لیکن چھ مہینے بعد انہیں دوسری جگہ جانا پڑ گیا تو حضرت عمرؓ نے حکم بھیجا کہ نصف خراج اہل شہر کو واپس کر دو کیونکہ جب ان کی حفاظت ہی نہیں تو اس حفاظت کے بدلے میں خراج کیسا لے؟ کیا ایسی مثالیں کسی اور تاریخ میں بھی آپ کو مل سکتی ہیں؟

**جبلہ کا واقعہ** | جبلہ بن ایہم کا واقعہ مشہور ہے کہ جب طوافِ کعبہ کے دوران اس کی چادر ایک اعرابی کے پاؤں تلے آگئی تو اس نے اعرابی کے منہ پر طمانہ مارا۔ اعرابی نے اس کا جواب ویسے ہی طمانچہ سے دیا۔ شہزادہ جبلہ نے حضرت عمرؓ کے سامنے اس کی شکایت کی، لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام کے نزدیک ایک شہزادہ اور ایک ادنیٰ و مقانی کا درجہ مساوی ہے۔ اس پر اس نے پھر سے عیسائی ہو جانا چاہا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں! ہمارے نزدیک تمہارے لئے تینوں راستے کھلے ہیں۔ یا مسلمان رہو یا عیسائی ہو کر جزیرہ ادا کرو۔ یا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنی تیس ہزار فوج کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف چلا گیا۔

**جزیرہ** | مسلمانوں پر سب سے بڑا الزام جزیرہ کے متعلق عائد کیا جاتا ہے اور یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ غیر مسلم رعایا سے "جرمانہ" ان کے مسلمان نہ ہونے کے حرم کی بنا پر وصول کیا جاتا تھا، حالانکہ اس کی حقیقت بالکل جداگانہ ہے۔ مسلمانوں کو اپنی آمدنی کا (کم از کم) چالیسواں حصہ حکومت کو ادا کرنا پڑتا تھا اور اس کے علاوہ ہر قسم کی فوجی خدمت بھی ان کے ذمہ تھی، غیر مسلم رعایا جو مسلمانوں کے زیر حکومت رہتی تھی ان کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمان حکومت پر لازم تھی۔ وہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔ ان سے فوجی خدمت کے بدلے تھوڑی سی رقم وصول کر لی جاتی تھی جس کی شرح زکوٰۃ سے کم تھی۔ نیز عورتیں، بچے، بوڑھے، اپاہج اور مذہبی رہنما اس سے مستثنیٰ تھے۔

یہ بھی دیکھئے کہ اس جزیرہ کی مقدار کتنی تھی معمولی حیثیت والے سے ۱۲ سالانہ، متوسط درجہ والے سے ۸ اور اس سے آگے خواہ کوئی کروڑ پتی ہو، زیادہ سے زیادہ بارہ روپے سالانہ، حالانکہ (مثلاً) ایک کروڑ پتی مسلمان سے

۱ (ECLIPS OF CHRISTIANITY.)

۲ (THE PREACHING OF ISLAM)

۳ (CALIPHS AND THEIR NON-MUSLIM SUBJECTS—TRITTON)

کم از کم ڈھائی لاکھ روپیہ سالانہ بطور زکوٰۃ وصول کیا جاتا تھا۔ صدقات و خیرات اس کے علاوہ تھے۔ اور اس مالی قربانی کے ساتھ ساتھ جب ضرورت لاحق ہوتی تو یہ جان بھرتی پر رکھ کر میدان جنگ میں بھی شریک ہوتا تھا اور ذمی رعایا کے مال، جان، مذہب، معاہدہ کی حفاظت کرتا تھا۔ یعنی ایک ذمی رئیس بارہ روپیہ ادا کر کے نہایت اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھا رہتا اور اسی حیثیت کا ایک مسلمان اڑھائی لاکھ روپیہ ادا کرنے کے بعد اس ذمی کے محافظ کی حیثیت سے میدان کارزار میں دشمن کی شمشیر و سناں کا مقابلہ کرتا۔ دشمن کی گولیاں ہوتیں اور مسلمانوں کا سینہ، جو غیر مسلم رعایا کی حفاظت کے لئے سپر کا کام دیتا، مسلمانوں سے پہلے ساسانیوں نے عیسائی رعایا پر جو ٹیکس لگا رکھا تھا وہ ساسانی رعایا سے دوگنا ہوتا تھا اور اس کے جواز میں شاہ پر سادویم نے کہا تھا کہ لڑائی نہیں لڑنی پڑتی ہے اور یہ مزے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ دوگنا کیوں نہ ادا کریں۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں جب کوئی غیر مسلم فوجی خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیتا تو اس سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ چنانچہ حجاج کے عیسائی قبیلے نے اس رعایت سے فائدہ اٹھایا۔ اہل حیرہ نے جزیہ دیا تو ان سے یہ شرط تھی کہ ان پر خواہ مسلمان حملہ آور ہوں، خواہ غیر مسلم، ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہوگی۔ ہم محض کے واقعہ میں دیکھ چکے ہیں کہ جب مسلمان حفاظت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے تو باقی ماندہ جزیہ ذمیوں کو واپس کر دیا۔ کیا اس کے بعد یہی سمجھا جائے گا کہ غیر مسلموں سے جزیہ اسلام قبول نہ کرنے کے جرم کی پاداش میں وصول کیا جاتا تھا؟

**ذمیوں کے حقوق** | الفاظ یہ تھے۔

”میں ذمیوں کے حقوق اب اپنے جانشین کے سپرد کرتا ہوں۔ ان کو خدا اور رسول نے پناہ دے رکھی ہے۔ اس لئے میرے جانشین کو خیال رکھنا چاہیے کہ جو معاہدے ان کے ساتھ ہوئے ہیں ان کی شدت سے پابندی ہو اور ان پر کسی قسم کا زائد بوجھ نہ ڈالا جائے۔“

حضرت عمرؓ کے خلاف الزامات عائد کئے جاتے ہیں کہ انہوں نے مذہب کے معاملہ میں عیسائیوں پر کچھ

پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ لیکن سر تھا مس آرنڈ نے  
یہ تمام الزامات بعد کی اختراع ہیں۔ اس کے برعکس یہ واقعات بھی حضرت عمرؓ کے عہد ہی کے ہیں کہ انہوں نے  
ذمیوں کے جان و مال کو مسلمانوں کے جان و مال کے برابر قرار دیا اور اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو حضرت  
عمرؓ اس مسلمان کو ذمی کے قتل کے بدلے میں قتل کر دیتے۔ انہوں نے تمام زمینیں ذمیوں کے قبضہ میں رہنے  
دیں اور یہ حکم دے دیا کہ کوئی مسلمان کسی ذمی کی زمین خرید نہیں سکتا۔ ذمیوں کے علاقہ کے متعلق کوئی معاملہ پیش آتا  
تو انہی کے نمائندوں سے اس کے بارے میں مشاورت ہوتی۔ قاعدہ تھا کہ جو شخص اپنا بیج اور ضعیف ہو جاتا اور  
محنت و مزدوری سے کسبِ معاش نہ کر سکتا تو اس کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر ہو جاتا۔ مساوات کی یہ  
انتہا کہ اس میں مسلمانوں کے ساتھ ذمی بھی برابر کے شریک تھے۔ چنانچہ ابن ولید نے ہجرہ کے ذمیوں کے ساتھ جو  
معاہدہ کیا (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) اس میں یہ شرط بھی داخل تھی۔ خلافت راشدہ کے بعد اگرچہ حکومت  
ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ بایں ہمہ عہدِ بنی امیہ اور عہدِ عباسیہ میں بھی ہیں

## عہدِ عباسیہ میں

عمر بن عبدالعزیز نے حکم دے رکھا تھا کہ کوئی گرجا کوئی صومعہ گرایا نہ جائے؛  
خلیفہ ہشام کے لڑکے نے ایک مرتبہ شکایت کی کہ ایک مسلمان کو ایک عیسائی نے مارا ہے۔ خلیفہ نے کہا کہ  
اس سے کہو کہ عدالت میں جا کر چارہ جوئی کرے۔ مسلمان اور عیسائی کی تمیز کیسی ہے؟  
خلیفہ المامون کے وقت میں ایک پادری 'یزداں بخت' دربار میں آیا۔ مسلمانوں سے اس نے مباحثہ  
کیا اور ہار گیا۔ خلیفہ نے کہا 'اب مسلمان ہو جاؤ۔ اس نے کہا زبردستی یا اپنی مرضی سے خلیفہ نے کہا اپنی مرضی  
سے اس میں زبردستی کوئی نہیں۔ اس نے کہا پھر تو میں مسلمان نہیں ہوتا۔ چنانچہ خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے فوجی حفاظت  
میں اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے، مبادا کوئی ناوان اسے نقصان پہنچا دے۔ عہدِ عباسیہ میں نسٹورین فرقہ  
کے عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت کا تنازعہ ہو گیا۔ ایک مسلمان مارا گیا جس سے مشتعل ہو کر مسلمانوں  
نے ان کے گرجے پر حملہ کر دیا۔ گرجے کو اتنا فیہ آگ لگ گئی عیسائیوں نے مسلمان قاضی کی عدالت میں دعویٰ

دائرہ کر دیا۔ چنانچہ ابو حامد اسفرائینی اور ابو بکر خوارزمی جیسے جلیل القدر متقنین کی رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ جس شخص نے گرجے پر حملہ کرنے میں مسابقت کی ہے وہ مجرم ہے۔ اُسے اُس کے جرم کی سزا دی جائے۔ ان واقعات سے اس زمانہ کی عام مذہبی آزادی کا پتہ چل سکتا ہے۔

**مصر میں** | مصر میں سلطان صلاح الدین کے وقت میں عیسائی اچھے اچھے عہدوں پر متمکن تھے۔ سیکرٹری اکونٹنٹ، رجسٹرار بالعموم عیسائی ہوتے تھے۔ مسٹر لارنس ای براؤن نے لکھا ہے کہ مصر میں عیسائیوں پر سوائے خلیفہ المحاکم کے عہد کے جو در حقیقت دیوانہ قرار دیا جاتا تھا، کبھی ظلم و ستم نہ ہوا، اور جہاں کہیں عیسائیوں نے کچھ مصیبتیں اٹھائیں وہ ان کی باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے تھیں۔ جنگ صلیبی کے وقت بہت سے عیسائی مسلمانوں کے کیمپ میں پناہ گزین ہو گئے اور مسلمانوں نے ان کو امان دی۔ ان میں سے کچھ تو واپس چلے گئے اور بہت سے وہیں ملازم ہو گئے اور اپنے آبائی مذہب پر بدستور قائم رہے اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا گیا۔ انہی حالات کی روشنی میں سر آرٹلڈ نے لکھا ہے کہ :-

**صلیبی لڑائیاں** | اگر خلفائے عباسیہ چاہتے تو جس طرح از بلا اور فرڈی منڈ نے ہسپانیہ سے اسلام کو خارج کر دیا تھا، بالونس چہار دہم نے فرانس میں پرائٹنٹ کے عیسائی فرقہ کو مجرم قرار دے دیا تھا، وہ بھی ایشیائے کوچک سے عیسائی خارج کر دیتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

انہیں صلیبی لڑائیوں کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ ایک سرہنگ فرنگی فوج سے ایک شیر خوار بچہ اٹھا لیا۔ اس کی ماں رنج و غم سے بے قرار ہو گئی اور اپنے سرداروں کے پاس جا کر روئی۔ انہوں نے کہا کہ سلطان صلاح الدین ایک سچا مسلمان ہے۔ اس کی خدمت میں جا کر عرض کرو۔ وہ روتی ہوئی آئی اور اپنی داستان سنائی۔ سلطان یہ کہانی سننا جا رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ اپنی کہانی ختم کر چکی تو سلطان غصہ سے کانپ رہا تھا اور اٹھا ساری فوج میں تلاش کیا، معلوم ہوا کہ بچہ بیچ دیا گیا ہے۔ اس کے دام ادا کر کے بچہ کو واپس منگایا اور اس کی ماں کی گود میں دے دیا اور سوار کر کے عزت کے ساتھ واپس پہنچا دیا۔

بیس زمانہ میں سلطان ارملہ کے متصل خیمہ زن تھا، یا قاف میں انگلستانی بادشاہ رچرڈ ڈی ہار پڑا۔ رچرڈ کے پاس اس وقت صرف دو تین سو سپاہی تھے۔ سلطان نے حکم دیا کہ بیمار دشمن پر حملہ کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔ رچرڈ کے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ سلطان اسے روزانہ برف اور میوہ بھیجتا تھا اور بعض مورخ لکھتے ہیں کہ سلطان خود طبیب بن کر اُسے دیکھنے گیا اور اس کا علاج بھی کیا۔

جب فرنگی بیت المقدس میں سلطان کے محاصرہ سے تنگ آگئے تو امان کے طالب ہوئے۔ اُس نے امان دے دی اور کہا کہ تمام فرنگی چالیس دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیں۔ جب اسلامی فوج شہر میں داخل ہوئی تو سپاہیوں نے دیکھا کہ فرنگی اشرافیوں کے صندوق بھرے لئے جا رہے ہیں۔ سلطان سے جا کر کہا گیا کہ فاتح فوج ایسی غنیمت سے کیوں محروم کی جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ درست ہے، لیکن بد عہدی ہمارا شیوہ نہیں۔

سلطان مراد ثانی کے مقابلہ میں جب صلیبی لشکر ہونیا کی قیادت میں جو کیتھولک تھا، میدانِ قوصوہ میں صف آرا تھا، اس وقت ہونیا کے ساتھی سلطان سر بیانے اس سے پوچھا کہ اگر تمہیں فتح حاصل ہوگئی تو کیا کر دو گے۔ اس نے کہا سب کو کیتھولک بنا کر چھوڑ دوں گا۔ لیکن جب یہی سوال شاہ سر بیانے مراد کے پاس بھیجا تو اس نے جواب میں لکھا کہ میں اگر کامیاب ہوا تو ہر مسجد کے پہلو میں ایک ایک کینسہ بنانے کی اجازت دے دوں گا تاکہ جس کا جی چاہے مسجد میں آئے جس کا جی چاہے کینسہ میں جائے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ شاہ سر بیانے ہونیا کا ساتھ چھوڑ دیا جس کی وجہ سے صلیبیوں کو شکست اٹھانی پڑی۔

ایک بار ایک عثمانی مفتی سے کسی نے سوال کیا کہ اگر دس مسلمان ایک سید یہودی یا عیسائی ذمی کے قتل میں شریک ہوں تو کیا وہ سب کے سب قصاص میں مارے جائیں گے۔ مفتی نے جواب دیا کہ بے شک، دس نہیں ایک ہزار بھی۔

اگرچہ یہ شہادتیں تاریخی اعتبار سے کچھ کم و قیچ نہیں، لیکن عہدِ اسلامی میں غیر مسلم رعایا کی حالت کے متعلق کچھ ایسے بیانات بھی موجود ہیں جن پر کسی خارجی اثر ایک طرف میلان اور حجان یا کسی دباؤ کا امکان نہیں ہو سکتا۔ اس زمانہ کے بعض عیسائی بطریق اور دیگر پادری اپنے اسقف وغیرہ کو خطوط لکھتے رہتے تھے۔ اتفاق سے ان میں سے بعض خطوط دستیاب ہو گئے ہیں جن کے مطالعہ سے **دشمن کی شہادت** معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی رعایا واقعی مسلمانوں کے عہدِ حکومت سے مطمئن اور خوش تھی۔ ورنہ ظاہر ہے اگر انہیں کچھ بھی تکلیف ہوتی تو وہ اس کو بڑھا پڑھا کر لکھتے۔ ہم ان خطوط میں سے بعض کے اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بطریق ایشوب سوم دیوار دیشیر (فارس) کے سامین کے نام ایک خط کے دوران لکھتا ہے:-  
یہ طے یا عرب جن کو خدا نے اس زمین کی حکومت عطا کی ہے، آپ کو علم ہی ہے کہ اب ہمارے  
پاس رہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے کبھی ہمارے مذہب پر حملہ نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ ہمارے مذہب  
کی عزت کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور خدائے مسیحی کے اولیاء کی تعظیم کرتے ہیں اور کلیساؤں  
اور خانقاہوں پر ان کی طرف سے الطاف و اکرام کا سلوک کیا جاتا ہے۔

چونکہ اس بطریق کا زمانہ قریباً ۶۴۷ء لغایت ۶۶۰ء ہے اس لئے مصر صہ بالانخط حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ  
کے عہد حکومت میں لکھا گیا ہوگا۔ یروشلم کے فرقہ مانکی کا ایک بطریق قسطنطنیہ کے بطریق کے نام ایک خط میں  
رقطہ ازبہ ہے۔

”مسلمان عادل ہیں اور ہم سے نہ کوئی بے انصافی کرتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی زیادتی روا  
رکھتے ہیں۔“

اسی طرح نرین کے میٹروپولیٹین الیاس نے ۸۰۹ء میں لکھا ہے:-  
”مسلمانوں کے متعلق ہمارا عقیدہ ہے کہ ان کی اطاعت اور محبت دیگر مذاہب کے لوگوں کی  
اطاعت سے زیادہ ہم کو متاثر کرتی ہے، خواہ ہم ان کی رعایا ہوں یا نہ ہوں اور خواہ وہ ہم سے  
کیسا ہی سلوک کیوں نہ کریں۔ اور یہ اس لئے کہ مسلمان اسے اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں کہ  
ہماری حفاظت کریں اور ہم سے نیک سلوک کریں۔ اور ان کا عقیدہ ہے کہ ان میں سے جو کوئی  
غیر مذہب والے کو ستائے گا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن اس مسلمان سے  
مواخذہ کریں گے۔ ان کا قانون ہمارے حقوق کو تسلیم کرتا ہے اور ہمیں دیگر مذاہب سے متمیز  
قرار دیتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی مسلمان نے جب ہم سے زیادتی کی ہے تو اس کے قانون نے  
اسے بتا دیا ہے کہ اس نے یہ ناجائز کام کیا ہے۔ برعکس اس کے دوسرے مذاہب کے تابعین

۱ (THE ECLIPS OF CHRISTIANITY)

۲ (BOEHIER)

گے یہ ابوداؤد کی ایک حدیث کی بنا پر ہے۔ (برہدین)

میں سے کسی نے اگر ہماری عزت کی ہے یا ہم سے نیک سلوک کیا ہے تو اسے اس کے قانون نے بتایا ہے کہ اس نے یہ اچھا کام نہیں کیا۔ لہذا مسلمانوں نے اگر کہیں ہم پر زیادتی بھی کی ہے تو ان کے اس اعتراف کی بنا پر کہ انہوں نے یہ مستحسن کام نہیں کیا ان کی زیادتی ہمارے لئے دیگر اہل مذاہب کے حسن سلوک سے کہیں بہتر ہے کہ جس سلوک کی بنا پر ان کے قانون نے انہیں بتایا کہ انہوں نے یہ بُرا کام کیا ہے؟

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ غیر مسلم رعایا مسلمانوں کے عہدِ حکومت اور ان کے اصولوں کو کس قدر نعمت الہی سمجھتی تھی اور ان کو کس قدر اطمینان اور آزادی حاصل تھی۔ برعکس اس کے اس زمانہ میں جہاں کہیں مسلمان عیسائی حکومت میں آباد تھے ان پر انتہائی مظالم توڑے جاتے تھے۔ ابی سینیا میں شاہ سیفا آزاد نے حکم عام دے رکھا تھا کہ ملک میں جتنے مسلمان ہیں یا تو عیسائی ہو جائیں یا ملک بدر کر دیئے جائیں یا جہاں ہوں وہیں قتل کر دیئے جائیں۔ حالانکہ یہ وہ ابی سینیا ہے جو مسلمانوں کی وسعتِ ظرف کے صدقے میں عیسائیوں کے قبضے میں رہا تھا۔

نجاشی نے مسلمانوں کے سب سے پہلے مہاجرین کے قافلہ کو سات آٹھ سال تک اپنے ہاں پناہ دی تو مسلمانوں نے اس احسان کا بدلہ اس انداز سے دیا کہ **نجاشی کی مملکت** سات آٹھ سو سال تک جبکہ چین سے لے کر مرکش تک اسلامی پرچم لہراتا رہا، حبش کی عیسائی سلطنت میں جو ایک مختصر سے قطعہ ارض پر مشتمل تھی کبھی دخل انداز نہ ہوئے۔ درآں حالیکہ نجاشی اول کا جانشین ہی مسلمانوں کا مخالف ہو گیا تھا۔ اور ۹۶ھ میں ایک دستہ فوج لے کر جدہ تک پہنچا آیا تھا۔ نبی اکرم نے بجائے جنگ کرنے کے اس سے صلح کا برتاؤ کیا اور نجاشی کے احسان کے بدلے میں مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ

سَالِمُوا لِحَبِشَةَ مَا سَأَلْتَكُمْ

جب تک اہل حبش تم سے مصالحت کہیں تم بھی ان سے مصالحت نہ کھنا۔

یہ تو تھا مسلمانوں کا طرزِ عمل حبش کے عیسائیوں کے ساتھ، لیکن اسی حبش کا خود اٹلی کے عیسائیوں کے ہاتھوں کیا انجام ہوا، دنیا اس پر شاہد ہے۔

**اسپین میں** جب مسلمان اسپین میں داخل ہوئے تو وہاں کی عیسائی سلطنت کے ماتحت یہودیوں پر ایک قیامت برپا تھی۔ انہوں نے یہودیوں کو ان کے پنجرے استبداد سے چھڑایا اور خود عیسائیوں کو ان کے مذہب میں کامل آزادی عطا کی۔ وہ اپنے معاملات کا نصف اپنے قاضیوں سے کراتے، ہر قسم کے مذہبی نہوار ملتے، سنے گرجے بھی تعمیر کرتے۔ آخری زمانے میں عیسائی مذہبی جوش میں قرطبہ کے بازاروں میں آکر رسول اکرم کی شان میں گستاخی برتتے لیکن اسلامی حکومت کی طرف سے سزا صرف انفرادی مجرم کو دی جاتی۔ اس کے ہم مذہب دیگر افراد سے کوئی باز پرس نہ ہوتی اور تمام عیسائی رعایا امن و اطمینان کی زندگی بسر کرتی ایک روسی مؤرخ کا بیان ہے کہ

فتح قسطنطنیہ کے وقت عیسائیوں کے مظالم سے غریبوں پر خدا کی دنیا تنگ ہو چکی تھی مسلمان ان کے ظلم سے استبداد پر برقی خاطر بن کر گرے۔ ان کے منصف اپنی امانتوں میں کبھی نیچت نہیں کرتے تھے۔

**فارس میں** فارس میں آتش پرستوں کے معبد بالکل محفوظ رہے۔ دسویں صدی یعنی فتح ایران کے تین سو سال بعد تک کے مؤرخین کے بیان کے مطابق عراق، فارس، کرمان، خراسان، آذربائیجان میں آتشکدے موجود تھے۔ المقتصد کے عہد میں ایک جرنیل نے ایک امام مسجد اور مؤذن کو دروں سے پیٹا، جن کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک پرانے آتشکدے کو مسجد میں تبدیل کرانا چاہتے تھے۔ شیراز میں گیارہویں اور تیرہویں صدی تک غیر مسلم رعایا کے تیوہاروں کی تقریب میں شہر کے بازار آراستہ کئے جاتے۔ یہ تیوہار بڑی دھوم سے منائے جاتے تھے۔

اسلام کی تعلیم کا کچھ ایسا نتیجہ انگیز اثر ہے کہ وہ انسان میں قلبِ مابیت کر دیتی ہے۔ جنگیز خان اور بلا کو خان کے چغتائی اور منگول قبائل تاریخِ عالم میں وحشت و بربریت کے محض تصور کئے جاتے ہیں۔

**منگول** ہرزبان میں ان کا نام آتش و خون کے حروف میں لکھا جاتا ہے۔ اس سے ان کے مذہبی

۱ (ARNOLD'S)

۲ (KARAMSIN-VOL.V-P.45)

۳ (THE CALIPHS AND THEIR NON-MUSLIM SUBJECTS-



تعصب و جنون کا اندازہ لگا لیجئے۔ چنگیز خان اور بغراخان کے عہدِ حکومت میں یہ حکم عام تھا کہ جو شخص مسلمانوں کے طریق پر کوئی جانور ذبح کرے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اسے قتل کر دے۔ لیکن یہی قبائل جب اسلام کے آغوش میں آئے تو ان کی مذہبی رواداری کی یہ کیفیت تھی کہ ازبک خان نے پیٹر کے اسقف کے نام ۱۳۱۳ء میں ایک منشور لکھا جس میں درج تھا کہ کوئی شخص حدودِ سلطنت کے اندر کسی عیسائی کے گرجا کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اس کی جاتیاد نہیں چھینے گا اور اس کے مذہب سے قطعاً تعرض نہیں کرے گا۔ جو ایسا کرے گا وہ حکومت کی جانب سے سزا کا مستوجب ہوگا اور اپنے خدا کے حضور اس کا جواب دہ ہے۔

**ہندوستان میں** | ہندوستان کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے لکھنا تحصیلِ لا حاصل ہے۔ یہاں مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں مذہبی رواداری کا ثبوت خود یہاں کی مردم شماری سے ہے۔ ہندوستان میں قریب ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے حکومت کی اور اس میں ایسے ایسے وقت بھی آئے کہ کشمیر سے میسور تک اور گجرات سے بنگال تک ایک ہی مسلمان بادشاہ کا سکہ رواں تھا۔ لیکن بایں ہمہ سلطنتِ مغلیہ کے اختتام پر مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ سے کم تھی۔ اور جب تلوار ہاتھ سے نکل گئی تو اس اتنی سال کے عرصہ میں وہ تین گنا ہو گئی۔ ان اعداد و شمار سے اگر وہ تعداد خارج کر دی جائے جو غیر ہندی مسلمانوں اور ان کی اولاد پر مشتمل ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ ہندوستان میں کس قدر اسلامی مبلغ آئے اور انہوں نے غیر مسلم باشندوں کے دلوں میں کس قدر گہری عقیدت پیدا کر لی، تو شمشیرِ بچاری کے حصہ میں سوائے بدنامی کے اور کیا رہ جاتا ہے؟

**سندھ میں** | سب سے پہلے حجاج کے عہد میں غازی محمد بن قاسم کے زیرِ قیادت مسلمان سندھ میں آئے۔ سر ولیم میور لکھتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں نے ہندوؤں کے تمام مندر اسی طرح

لے (ARNOLD)

لے ڈاکٹر بینک کے ایک بیان کی رُو سے جب ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آگئی تو مسلمان کل آبادی کا دو سوواں حصہ تھے اور گورنمنٹ آف انڈیا کی مردم شماری کی رپورٹ بابت ۱۸۸۱ء کے مطابق مسلمان کل آبادی کا پانچواں حصہ یعنی پانچ کروڑ تھے۔ لیکن ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رُو سے ۵ کروڑ۔

رہنے دیئے ان کو بُت پرستی سے بہ جبر نہیں روکا۔ یہود، نصاریٰ، پارسی سب کو اجازت تھی کہ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں اور یہی وجہ ہے کہ باوجود اسلامی حکومت کے ہندوستان غیر مسلم ہی رہا۔ محمود غزنوی کے حملے مسلم جوہر و ابتداء کے لئے بطور ضرب المثل استعمال کئے جاتے ہیں لیکن انسانی کلچر پیڈیا آف اسلام کا عیسائی مدیر ان تمام حملوں کے تذکرہ کے بعد لکھتا ہے کہ:-

**محمود غزنوی** | محمود نے مذہب کے بارے میں کہیں زبردستی نہیں کی بلکہ کئی جگہ اس نے اپنے اہل مذہب پر ہندوؤں کو ترجیح دی۔

اسی طرح لالہ تلسی رام صاحب اپنی کتاب ”واقعات ہند“ میں لکھتے ہیں:-  
محمود نے بہ جبر کسی کو مسلمان نہیں بنایا۔ نہ کسی ہندو کو اس لئے قتل کیا کہ وہ ہندو ہے۔  
ڈاکٹر برنیر اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے:-

مسلمانوں کی تدبیر مملکت کا یہ ایک جزو ہے کہ وہ ہندوؤں کے مذہب میں جن کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے، دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ ان کے مذہبی رسوم کو بچلانے میں ان کو آزادی دیتے ہیں۔

اکبر کے عہد میں یہ رواداری تو گویا جانب داری کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ راجہ مان سنگھ کو، مثلاً، وہ اقتدار حاصل تھا جو شاید پرتھوی راج کو بھی نصیب نہ ہوا ہو۔ راجہ ٹودرمل وغیرہ کی قدر و منزلت کسی صورت میں بکراہیت کے نورتنوں سے کم نہ تھی۔ مذہبی آزادیوں کے متعلق رائے بہادر لال بیج ناتھ اپنی کتاب **اکبر کے عہد میں** | ہندوستان گذشتہ و حال میں تحریر فرماتے ہیں:-

مسلمان فرمانرواؤں کی نسبت یہ اعتراض بھی پیش کیا جاتا ہے کہ ان کے عہد میں مندر بننے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن یہ سراسر فط ہے۔ دہلی، آگرہ، مئتمرا وغیرہ میں جو اسلامی قوت و سطوت کے خاص مرکز تھے، بہت سے مندر شاہان اسلام کے عہد کے تعمیر شدہ اس وقت تک موجود ہیں۔

**اورنگ زیب** | اورنگ زیب کے تو نام ہی سے ایک خونچکاں منظر سامنے آجاتا ہے۔ اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ جب تک سوامن زتار نہیں اُتر و البتہ اٹھا کھانا نہیں کھایا کرتا تھا۔ لیکن

تاریخ کے ان صفحات کو کہاں لیجائیے جن پر ثبوت ہے کہ

اورنگ زیب کو شہر پنہیجی کہ بنارس کے بعض حکام برہمنوں کو ستاتے ہیں۔ تو اس نے ابو الحسن گورنہ بنارس کو فرمان بھیجا کہ ہماری شریعت کا حکم ہے کہ مندر نہ ڈھائے جائیں اور ان کے پجاریوں پر سختی نہ کی جائے۔ لہذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی برہمن یا ہندو پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالے۔ اسی طرح بابورام نرائن صاحب، منجر ریاست رام نگر اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:-  
ضلع سیتاپور میں مہر کے مندر کو عالمیگیر نے چند مواضع جاگیر میں دیئے جو اب تک موجود ہیں۔ نیز مخمر کے نزدیک بلدیو راؤ کے مندر کو بہت سے گاؤں جاگیر میں دیئے۔

بابو منوہر لال صاحب اوہری اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:-

اورنگ زیب نے مندروں کو جاگیر میں دیں۔ اس کے بڑے بڑے عہدے دار ہندو تھے۔

پروفیسر ایشوری پرشاد صاحب اپنی "تاریخ ہند" میں لکھتے ہیں:-

مٹان میں تو تلمہ مائی کے مندر کو ایک سو روپیہ سالانہ جاگیر عالمیگیر نے عطا فرمائی۔ ڈیرہ دون کے

گوردوارہ کو جاگیر دی۔ ہندوؤں پر سے محصول جاترہ جو پہلے سے چلا آتا تھا موقوف کر دیا۔

سکھوں کے ہاں تو "اورنگا" کے مظالم کی داستانیں ہر تقریب پر دہرائی جاتی ہیں اور ان میں گوردو کو بند سنگھ

کے واقعات کو سب سے زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے۔ لیکن رائے بہادر کھنیا لال اپنی "تاریخ پنجاب" میں لکھتے ہیں:-

گوردو کو بند سنگھ جی نے محاصرہ کے بعد اورنگ زیب کو فارسی میں عرضی لکھی کہ میں سیاست سے

الگ ہو کر عبادت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے لکھا کہ اگر ایسا ہے تو آپ سے کوئی

مزاحمت نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ اس نے تمام حکام کو اس کے مطابق احکام جاری کر دیئے۔

مناخرین میں سے حیدر علی اور سلطان ٹیپو بھی اس بارے میں بہت بدنام کئے جاتے

ہیں کہ انہوں نے بہت سے ہندو خاندانوں کو مسلمان کر لیا تھا۔ ان کے متعلق سر تھامس آرنلڈ

**ٹیپو سلطان**

لکھتے ہیں کہ:-

گذشتہ صفحے کا بقیہ فٹ نوٹ جاتے تھے۔ اب اندازہ فرمائیے کہ اورنگ زیب کے پچاس سالہ عہد حکومت میں کس قدر ہندو مسلمان ہوئے یا قتل کئے گئے۔

۱۔ بنارس سٹی "مصنفہ نرنجن سین صاحب، بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل۔

اسی حیدر علی کے دو وزیر برہمن تھے اور شاما برہمن اس کا معتد خاص تھا۔ ملوکوٹہ میں جو دشمنوں کا مندر ہے اس میں دو چاندی کے برتن ہیں جن پر یہ عبارت کندہ ہے: "یہ برتن ٹیپو سلطان کی طرف سے بطور ہدیہ مندر کو دیئے گئے"



ان واقعات کو دہرنے سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ ان مسلمان فرمانرواؤں کی وسعتِ نظر اور کشادہ دلی کے قصائد لکھے جائیں۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ چونکہ ان کے عہدِ حکومت میں اسلامی کلچر اسلامی روایات اور اسلامی تعلیم کے کچھ نہ کچھ آثار باقی تھے اس لئے ان کا تقاضا تھا کہ غیر مذاہب والوں سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے جب عام مسلمانوں کی سلطنت میں غیر مسلموں کے ساتھ اس قسم کی مذہبی رواداری کا عملی ثبوت دیا جاتا تھا تو ظاہر ہے کہ جب دنیا میں صحیح معنوں میں قرآنی نظام قائم ہو جائے تو اس وقت تمام نوعِ انسانی کو کس قدر آزادیِ مذہب اور حریتِ فکر حاصل ہوگی۔ اگر غیر مسلم ان واقعات پر غور و فکر کریں تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ اسلام کا دامن ان تمام نونی دھبوں سے پاک ہے جو اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ وہ دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام دینے والا ہے اور کسی حالت میں بھی رشتہٴ عدل و انصاف کو ہاتھ سے چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ اس کے خدا کا اعلان یہ ہے کہ:-

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدُوْا اَعْدٰٓؤَافِ  
هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۙ (۵/۸)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ عدل کرو کہ وہ تقوٰی سے بہت قریب ہے۔

اور انہی واقعات کو دیکھنے کے بعد ایک عیسائی مصنف یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:-

تاریخ کے واقعات جو ہم نے اس کتاب کے صفحات پر لے نقاب کئے ہیں ظاہر کر رہے ہیں کہ اسلام ایشیا کے عیسائیوں سے "بزرگ شمشیر" نہیں منوایا گیا، بلکہ اس کی اشاعت مسلمانوں کی روز افزوں ترقیوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔

لے سوانح عمری حیدر علی، انڈیٹی لال بنگم۔

برعکس اس کے۔

صلیبی لڑائیاں لڑنے والوں کے دل میں سب سے پہلے آرزو یہ تھی کہ وہ جناب مسیح کے لئے  
”بروز شمشیر“ ایک سلطنت حاصل کر لیں۔



# تمسک بالکتاب

(نوشتہ جنوری ۱۹۴۰ء)

بلا کی کالی رات تھی۔ سامنے پہاڑ کی بٹیا سے دو آدمی نیچے اتر رہے تھے۔ ایک کچے پاس روشنی تھی اور اندازے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے شخص کو راستہ دکھانے کی غرض سے ساتھ ہے۔ دوسرے آدمی نے کہا: "بھائی! روشنی میرے آگے آگے رکھو تاکہ راستہ روشن ہو پیچھے رکھنے سے تو اٹنا خود میرے سایہ سے راستہ تاریک تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔" پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں نظر سے اوجھل ہو گئے۔ پھر وہی تاریکی اور وہی سناٹا تھا۔ لیکن اس جانے والے کا فقرہ ابھی تک میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ روشنی کا مقصد یہ ہے کہ وہ تاریکیوں کے پردے کو چاک کرٹی چلی جائے لیکن یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ روشنی کو اس کے صحیح محل پر رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا میں اس قوم کو بھیجا جس کے متعلق خود فرما دیا۔

اَسْمَانِي رُوشَنِي | كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجْتُمْ لِلنَّاسِ (۳/۱۱۰)

تم بہترین قوم ہو جو نوری انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

تو انہیں ہلاکت اور تباہی کے عمیق غاروں سے بچانے کے لئے ایک مشعلِ ہدایت، ایک سراجِ منیر، ایک نورِ مبین عطا فرمایا کہ وہ اس کو اپنے جاوہِ حیات میں پیش پیش رکھیں اپنے شاہراہِ عمل کا خطرِ یقوت بنائیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں جو قدم اٹھائیں اس کی روشنی میں اٹھائیں تاکہ وہ راستہ کی پُرخطر وہیب گھاٹیوں سے مامون و مصنون منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ لَا يَهْدِي اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ  
رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَ

يَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ (۱۵-۵/۱۶)

اور تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور یعنی ایک کتاب مبین آئی ہے۔ اس کے ذریعے اللہ ایسے لوگوں کو جو قانونِ خداوندی کا اتباع کریں سلامتی کی راہ بتاتا اور انہیں اس قانون کی نُد سے ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے اور انہیں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

لیکن اگر وہ اس روشنی کو بجائے سامنے رکھنے کے جس سے ان کا راستہ روشن ہو جائے اپنے پیچھے رکھ چھوڑیں تو ظاہر ہے کہ قطع شدہ منزل تو ضرور درخشاں رہے تاہناک نظر آئے گی، لیکن سامنے کا راستہ پہلے سے بھی زیادہ تاریک ہو جائے گا اس لئے کہ تنہا عقل کی دھندلی سی روشنی میں عام طور پر جس قدر راستہ نظر آ سکتا ہے اس طرح وہ بھی ان کے اپنے سائے سے ظلمت ناک ہو جائے گا یہی مطلب اس آیتِ مقدسہ کا ہے جس میں یہودیوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کو پیٹھ کے پیچھے رکھ چھوڑا تھا تاکہ ان کا ماضی درخشاں رہے لیکن مستقبل خوفناک طور پر تاریک ہو جائے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَىٰ فِرْعَوْنُ مَنَ  
الَّذِينَ أَوْفُوا الْكَيْبَ لَا يَكْتُمُ اللَّهُ ذُرِّيَّةَ ظَٰلِمٍ رَّهْمٌ كَانَتْهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

(۲/۱۰۱)

اور جب ان کے پاس میں جانب اللہ وہ رسول آیا جو سچ کر کے دکھاتا ہے اُسے جو ان کے پاس ہے تو اہل کتاب کے ایک فریق نے خود کتاب اللہ ہی کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا گویا انہیں کچھ علم ہی نہیں۔

**یہود کا جرم** یہود کا کیا جرم تھا؟ یہی کہ جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس مقدس روشنی کو اپنا نصب العین حیات بناؤ جس سے تمہارا حال مستقبل روشن ہو جائے اور تمہیں نظر آجائے کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور تمہاری کورانہ تقلید نے تمہیں کس راستے پر ڈال رکھا ہے تو انہوں نے اس روشنی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ جس ڈگر پر ہمارے آباء واجداد چلتے آئے ہیں وہی صراطِ مستقیم ہے۔

وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَسْتَبِعُ مَا الْفِينَا عَلَيْهِ آبَاءُنَا  
أَوْ لَوْ كَانَ آبَاءُ وَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ (۲/۱۴۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی طریق پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے

ہوں نہ ہدایت۔

یہی چیز ہے جسے اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفر سے تعبیر کیا ہے۔

جو شخص کفر کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کے مانند ہے جو ایسے (جانور) کے پیچھے چلا جا رہا ہو جو بجز بلانے اور پکارنے کے اور کسی بات کو نہیں سمجھ سکتا (اسی طرح یہ لوگ بھی) بہرے میں ڈگنکے ہیں،

اندھے ہیں اور نہیں سمجھتے۔ (۲/۲۴۱)

کفر و ناسپاسی اسی روش کا نام ہے کہ جو چیز جس مصرف کے لئے دی گئی ہے اسے اس مصرف میں نہ لایا جائے مثلاً اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال کا صحیح مقصد یہ ہے کہ اسے نوع انسان کی بہبود کے لئے صرف کیا جائے لیکن جو لوگ اس کے برعکس اسے دبائے رکھتے ہیں انہیں قرآن کریم نے کفار قرار دیا ہے۔

وَالَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۝ (۴/۳۴)

یعنی وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخیلی کی تعلیم دیتے ہیں اور اس چیز کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دے دی ہے۔ اور ہم نے ایسے کفار کے لئے ذلت آمیز عذاب مقرر کر رکھا ہے۔

لہذا اپنی زندگی میں قرآن کریم کو اس کی صحیح جگہ پر نہ رکھنا یعنی ہر معاملہ میں خالی الذہن ہو کر اس کی روشنی میں قدم نہ اٹھانا قرآن کی نظر میں کفر ہے ایمان نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دینا

بات کا اعتراف کرے کہ اس نے قرآن کریم کو پس پشت ڈال رکھا ہے یا اس کا قرآن پر ایمان نہیں لیکن قرآن صرف اسی قدر اعتراف کو کوئی وقعت نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک ایمان و ایمان کی صداقت کا ثبوت یہی ہے کہ انسان کے اعمال اس اعتراف کی شہادت دیتے ہوں۔ مثلاً دیکھئے اہل ایمان کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ اگر تم خلافت ارشادِ خداوندی، رسول میں اُلجھ گئے تو تمہارے لئے وہی جہنم ہے جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ

لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ۝ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝ (۳/۱۳۰-۱۳۱)

اے ایمان والو! رباؤ مت کھاؤ۔ دونا۔ ڈگنا کئے ہوئے۔ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔



اور اس آگ سے ڈرو جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے۔

عام طور پر آپ کو دو قسم کی جماعتیں ملیں گی۔ ایک وہ لوگ جو دنیا میں صحیح اور غلط، کامعیار اپنی مفاد پرستیوں ہی کو سمجھتے ہیں۔ ہر معاملہ کا اپنی مصلحت کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں اور انہی فیصلوں کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ اپنی عقل کا بے محل استعمال کرتے ہیں اس لئے انہیں ظالم کہا گیا اور ان کے متعلق ارشاد ہوا:

بَلْ أَشَبَّهَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ فَمَنْ يَمْدِي مَنْ أَضَلَّ  
اللَّهُ ۗ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝ (۳۰/۲۹)

لیکن ان ظالموں نے بلا علم و دلیل اپنی خواہشات (خیالات) کا اتباع کر رکھا ہے۔ سو جو (خدا کے قانون کے مطابق یوں) گمراہ ہو جائے اُسے کون راہِ راست پر لا سکتا ہے۔ ان کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔

چونکہ تنہا عقل کے فیصلے یقیناً پر مبنی نہیں ہوتے۔ اس لئے قرآن کریم نے یقینی اور حقیقی علم، علم الکتاب کو کہا ہے اور جو علم الکتاب نہیں رکھتا، اس کے متعلق کہا کہ وہ محض قیاس آرائیاں کرتا ہے۔ وہ ذہن انسانی کی اہلہ فریبوں سے طرح طرح کی منطقی موثکافیوں اور قسم قسم کی فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں کے حلقہ دام فریب میں الجھا رہتا ہے اور عروس حقیقت اس کے سامنے کبھی بے نقاب نہیں ہوتی۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝

(۲/۷۸)

اور ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو کتاب کا علم تو کچھ نہیں رکھتے سوائے اس کی لفظی تلاوت کے۔ یہ لوگ محض قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔

۱۔ تنہا عقل، انسانی رہنمائی کے لئے کیوں ناکافی اور ناقابل اعتبار ہے اس کی تفصیل اس موضوع سے خارج ہے اور ایک مستقل عنوان کی محتاج۔ اس وقت اس باب میں جوڈ کے بیان کا مختصر سا اقتباس پیش کرنا کافی ہوگا۔ لکھتا ہے "عقل فی الحقیقت ہماری خواہشات کی لونڈی یا انہیں بروئے کار لانے کا ایک آلہ ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ ان مقاصد کو ہمارے لئے ہمیا کرے۔ جنہیں ہمارا نفس ہمارے لئے تجویز کر رہا ہے۔ اور اس انداز سے کہ جو ہمارا نفس غیر شعوری طور پر کرنا چاہے اس کے جوازیں دلائل و حیل تراش دے، تفصیل ان امور کی "ابلیس و آدم" اور "انسان نے کیا سوچا" میں ملے گی۔

لیکن ظنِ حقیقت کے مقابلہ میں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

وَمَا يَنْبَغُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا إِنَّ  
اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ۝ (۱۰/۳۶)

اور ان میں سے اکثر محض ظن کا اتباع کرتے ہیں۔ اور یقیناً ظن حق کے مقابلہ میں کچھ فائدہ نہیں

دے سکتا اور اللہ ان کے اعمال سے واقف ہے۔

**دو قسم کی جماعتیں** | یہ جماعت کبھی سعادت کی راہ نہیں پاسکتی کیونکہ انہوں نے اپنے خیالات ہی کو اپنا

خدا بنا رکھا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور جماعت بھی ہے جس نے مشران کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ اور یہ جماعت اس پہلی جماعت سے بھی زیادہ خطرناک وادیوں میں سرگرداں ہیں بمقام الذکر جماعت کی خطا و لغزش کا راز ان کے کیر پیکر کی کمزوری ہے۔ قوتِ ایمان کا فقدان ہے۔ وہ رجحاناتِ ذہنی اور خواہشاتِ قلبی کے غلام ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ان میں سے جو سلیم الطبع ہیں جب ان کے سامنے قرآنِ کریم کا کھلا کھلا فیصلہ آجاتے تو ان کی نگاہیں ضرور جھک جائیں گی۔ قلب محسوس کرے گا اور انہیں نظر آجاتے گا کہ جس راہِ عمل کو انہوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ ان کی قلبی کمزوریوں کی وجہ سے ہے۔ قرآن کا راستہ وہ نہیں اور چونکہ ان میں عقل و بصیرت موجود ہوتی ہے اس لئے جب ایک مرتبہ ان کے سامنے رشد و ہدایت کی راہیں کھل جائیں تو وہ اپنی روش کو دین بنا کر پیش نہیں کرتے اس کے برعکس دوسرے لوگ وہ ہیں جو غلط راستے پر چل رہے ہیں لیکن اسے عین صراطِ مستقیم سمجھ رہے ہیں۔ غلط مسلمات، غلط معتقدات، غلط نظریے ذہن میں جھار کھے ہیں اور انہیں دین کا پھوڑ قرار دیتے ہیں۔ وہ نمازوں میں اپنا رخ قبلہ نما کو دیکھ کر سیدھا کرتے ہیں لیکن ان کے قبلہ نما کا رخ ہی کسی اور سمت کو ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا اور رسول کا متبع جانتے ہیں لیکن ان کا اتباع اپنے جیسے انسانوں کا اتباع ہوتا ہے دینِ خداوندی کا اتباع نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہیں۔

الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ  
صُنْعًا ۝ (۱۸/۱۰۶)

جن کی کوششیں اس دنیا میں غلط راستے پر پڑی ہوئی ہیں اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اچھے کام

کر رہے ہیں۔

ان میں عوام کو تو چھوڑیے جن میں ہنوز سمجھنے کی استعداد ہی نہیں۔ اگرچہ کسی قوم میں جہالت کا ہونا کوئی

معقول عذریا فخر کی بات نہیں۔ لیکن قیامت تو یہ ہے کہ جو لوگ عوام کے راہ نما، علم و فضل کے مدعی، رشد و ہدایت کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں۔ ان کی بھی یہ حالت ہے کہ ان کے علم و عمل کو قرآن سے کچھ نسبت نہیں ہوتی (الاما اشارتاً) اس جماعت کا علاج اول الذکر جماعت سے کہیں دشوار تر اور کہیں وقت طلب ہے۔ اگر اول الذکر جماعت کو ان کے غلط راستے سے ہٹا کر سیدھی راہ پر لانا ہو

## دوسری قسم کے لوگ

تو ان میں صرف قوتِ عمل کا بیدار کرنا ضروری ہوگا۔ اس کے بعد وہ محسوس کریں گے انہیں مرض کے بدلے شفا مل رہی ہے، ضعف کے عوض قوت اور اضطراب کی جگہ تسکین حاصل ہو رہی ہے۔ لیکن اگر اس (دوسری) جماعت کے مروجہ دستاویز آئین سے انہیں ایک ایسے بھی (دھڑ دھڑھٹنے کی دعوت دی جائے وہ تڑپ اٹھیں گے کہ ان کے معتقدات ان سے پھن رہے ہیں۔ اور معتقدات (غلط ہوں یا صحیح) قلبِ انسانی کے لئے گراں بہا متاع ہوتے ہیں۔ اور وہ اسے یوں لٹتے نہیں دیکھ سکتا۔ اور معتقدات بھی ایسے جو نسل بعد نسل آبار و اجداد سے ترکہ میں متوارث چلے آ رہے ہوں۔ ان کے ہاں نہ صرف معتقدات ضائع ہونے ہی کا صدمہ ہوتا ہے بلکہ آبار و اجداد کی تعظیم و تقدس ٹٹ جانے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ جب یہود نے یہ کہا تھا کہ ہم اپنے آبار و اجداد کے طریقوں پر ہی چلیں گے تو آبار و اجداد سے مراد نسی آبار نہیں تھے بلکہ ان کے متقدمین اجداد و رہبان تھے۔ اس لئے کہ جب قرآن کریم میں یہ آیت نازل ہوئی کہ انہوں نے اپنے اجداد و رہبان کو خدا بنا رکھا ہے۔ تو نبی اکرم سے عرض کیا گیا کہ وہ انہیں خدا بنا کر پوجتے تو نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ وہ اس چیز کو حلال سمجھتے ہیں جسے ان کے علماء حلال کہہ دیتے ہیں اور اس کو حرام جسے وہ حرام قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس طریق پر یہ لوگ چل رہے تھے وہ یہی شریعت اور قوانین تھے۔ اور یہ صرف یہود و نصاریٰ تک ہی محدود نہیں۔ قرآن کریم نے

## تقلیدِ اسلاف

اہم سابقہ میں سے ہر امت کے متعلق فرمایا۔

اور آپ سے قبل کوئی رسول کسی بستی میں نہیں آیا۔ جس سے وہاں کے راحت پسند لوگوں نے یہ نہ کہہ دیا ہو کہ ہم نے اپنے آبار و اجداد کو ایک طریق پر پایا اور ہم انہیں کے نشانات کی اقتدا کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ اس پر رسول نے کہا کہ خواہ میں اس سے جس پر تم نے اپنے آبار کو پایا ہے بہتر مقصود پر لے جانے والا راستہ کیوں نہ لایا ہوں (تم اسی پر چلے جاؤ گے؟) انہوں نے کہا کہ ہم تو اس سے انکار کرتے ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو۔ (۲۴-۲۳/۲۴)

آج مسلمانوں کی خواہ صدر جماعت کی حالت پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان کی بعینہ یہی حالت ہو رہی ہے یا

نہیں؟ وہ جن باتوں کو عین دینِ جہدِ ربی میں اُن میں سے ہر بات کی سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رُک جاتی ہے۔ ضابطہ خداوندی شریعتِ الہی کا کہیں نام نہیں آتا۔ کیا یہی "مَا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آيَاتًا" نہیں؟ کیا ایک عقیدہ ایک فیصلہ ایک قانون محض اس لئے منجرائی صراطِ مستقیم اور منزہ عن الخطا قرار پاسکتا ہے کہ اسے اسلاف میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا جائے؟ مسلمان قرآنِ کریم کو خدائے جی و قیوم کا ابدی قانون مانتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ صراطِ مستقیم وہی ہے جو اس سراجِ منیر کی روشنی میں چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ کیا انہوں نے کبھی اس کی ضرورت سمجھی ہے کہ جو باتیں اسلاف کی کتابوں میں لکھی گئی ہیں انہیں اس صراطِ مستقیم سے مطابقت دے لی جائے؟ قرآنِ کریم کی تو یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر زمانہ کی ضروریات کے لئے روشنی دیتا جائے۔ لیکن جو باتیں انسان کی پیدا کردہ ہیں وہ تو ہر کیف ماحول سے متاثر اور اپنے اپنے زمانہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ انسانی خیالات کا تو یہ عالم ہے کہ ایک مصنف اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف خیالات قائم کرتا اور ان میں ترمیم و ترمیم کرتا رہتا ہے۔ جب ایک مصنف کی مختصر سی زندگی میں اس کے خیالات قابلِ تغیر ہو سکتے ہیں، تو حیرت ہے کہ اس کے بعد زمانہ خواہ کہاں سے کہاں چلا جائے اس کے خیالات 'وحیِ الہی کی طرح' ناقابلِ تغیر کیسے ہو جائیں گے؟ قرآنِ کریم صحیفہ فطرت ہے۔ فطرت کی کسی چیز کو اٹھا کر دیکھتے 'وہ کسی خاص زمانہ سے مقید نہ ہوگی۔ یہ کبھی نہ ہوگا کہ اس شے کے متعلق جو کچھ تجارب و مشاہدات کسی ایک زمانہ میں عمل میں آچکے ہوں۔ اس کے فوائد و خصائص جو کسی ایک وقت معین کئے جا چکے ہوں اُن پر مہر لگ جائے اور آنے والی نسلیں گذشتہ محققین کی تحقیق و تفتیش کو نقشِ آخر سمجھ لیں۔ فطرت کی ہر شے، ہر زمانہ کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے رہی ہے۔ آج تک کسی شے نے یہ نہیں کہا کہ بس میں اب تھک چکی۔ اب میں زمانہ کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتی لیکن تعجب ہے کہ کتابِ الہی کو صحیفہ فطرت ماننے والے اس کے متعلق یہ یقین کئے بیٹھے ہیں کہ اس میں سے جو کچھ لیا جانا تھا ازمنہ گذشتہ میں لیا جا چکا ہے اور اس کے بعد یہ کتاب مقدس (نعوذ باللہ) ایک بیکار شے بن چکی ہے۔ قرآنِ کریم کا تو یہ دعویٰ تھا کہ:-

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝ وَ لَتَعْلَمَنَّ نَبَأُ بَعْدَ حِينٍ ۝ (۲۸-۲۹)

یہ قرآنِ تمام اہل عالم کے لئے یادداشت ہے اور کچھ وقت کے بعد تم اس کے متعلق (خود بخود)

جان لو گے۔

لیکن اس کے حاملین کا اب یہ ایمان ہے کہ عالمین سے مراد محض ازمنہ گذشتہ واقوام سابقہ میں لب چونکہ بابِ تحقیق بند ہو چکا ہے اس لئے اگر عہدِ حاضر کی قومیں اپنے احوال و ظروف کے مطابق اس سے درسِ عبرت و

موعظت لینا چاہیں اور اپنی ارتقائی منازل میں اسے شمع ہدایت بنانا چاہیں تو جب تک وہ اپنے آپ کو ہزار پانچ سو سال پیچھے نہ لے جائیں اس سے مستفیض نہیں ہو سکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو یہ فرمایا کہ کچھ وقت کے بعد تم اس حقیقت کو جان لو گے کہ قرآن واقعی تمام اقوامِ عالم کے لئے درسِ موعظت ہے، تو جوں جوں فرسانہ گزرتا جائے گا حقیقت بے نقاب ہوتی جائے گی۔ انسان جس قدر ترقی کرتا جائے گا اس کی عمرانیت اور بدنیت جتنی وسیع ہوتی چلی جائے گی قرآن کریم کا یہ دعویٰ حقیقت بن کر سامنے آتا جائے گا کہ اسے کسی خاص زمانہ میں مقید کر دینا اس کی امکانی وسعتوں کو پابہ زنجیر کر دینا ہے۔ قرآن کا ساری دنیا کو چیلنج ہے کہ آؤ اپنی عقلوں کی حد پرواز کو آزماؤ اور اور دیکھو کہ قرآن کریم تم سے کتنا آگے آگے چلتا ہے۔ لیکن ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ قرآنی کمالات کی جس قدر تکمیل ہوئی تھی ہو چکی۔ اب اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

**نفس کی جیلہ جونی** | ماضی پرستی کا یہ جذبیہ بظاہر بڑا مقدس اور یہ عقیدت بڑی مومنانہ نظر آتی ہے کہ یہ اسلاف کی عزت و تکریم اور اپنے عجز و انکسار کی آئینہ دار ہے۔ لیکن اگر ذرا بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو اس کے اندر نفسِ انسانی کی ایک بڑی جیلہ جونی بھی نظر آئے گی۔ ظاہر ہے کہ تدبیر و تفکر، تفحص و تجسس کچھ آسان کام نہیں۔ اس کے لئے بڑی ذہنی کاوش، دماغ سوزی اور جگر کاوی کی ضرورت ہے۔ اسلاف میں جن حضرات نے تحقیق و تدقیق کے میدان میں قدم رکھا ان کے سوانح حیات پر نگہ ڈالئے، یکسر مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی نظر آئے گی۔ برعکس اس کے بلا سوچے سمجھے ایک پڑھی پر چلے جانا، بڑی تن آسانی کا کام ہے۔ قرآن کریم نے جن لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ آبار و اجداد کی کورانہ تقلید پڑھتے تھے، ان کے متعلق ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ مترفین تھے۔ یعنی وہ لوگ آسائش و آرام، سہل انگاری اور تن آسانی کی زندگی بسر کرنے کے خوگر ہو چکے تھے۔ لہذا ظاہر ہے کہ جس چیز کو ہمارا نفس عام طور پر عقیدت و عظمت کے خوش آئند لباس میں پیش کرتا ہے۔ وہ اکثر اوقات اپنی ذہنی اور سہل انگاری کی پردہ پوشی ہوتی ہے اور نہ ایک مسلم کی زندگی، ذہنی، بدنی اور قلبی ہر حیثیت سے ستر پاسی و عمل کی زندگی ہے، تنگ و دود کی زندگی ہے، اضطراب و سیما بیت کی زندگی ہے، یکسر جہاد کی زندگی ہے، عقل و بصیرت اور غور و تفکر کی زندگی ہے۔ جمود و تعطل کی زندگی نہیں۔ اور ان دونوں زندگیوں کو قرآن کریم نے برابر قرار نہیں دیا۔

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۗ (۱۳/۱۹)

کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے حق ہے اس شخص کے مانند ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔ نصیحت تو سمجھ دار لوگ ہی قبول کر سکتے ہیں۔

**تدبر و تفکر** | دیکھئے! یہاں یہ نہیں کہا کہ "أَفَمَنْ يُؤْمِنُ" یعنی وہ شخص جو اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ جو کچھ نبی اکرم کی طرف سے نازل ہوا ہے حق ہے، بلکہ "أَفَمَنْ يُعَلِّمُ كِتَابًا" ہے۔

یعنی وہ شخص جو علیٰ وجہ البصیرت اس بات کا علم رکھتا ہے۔ اسی لئے آخر میں کہا گیا کہ نصیحت صرف سمجھ دار لوگ قبول کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایک قدم پر تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا فیصلہ یہ ہے کہ:-

إِنَّ شَرَّ الدِّينِ عِنْدَ اللَّهِ الضَّمُّ الْبِكُمْ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (۸/۲۲)

اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو گونگے اور پیرے بنے بیٹھے رہتے ہیں اور عقل سے

کام نہیں لیتے۔

یوں بھی جو لوگ محض عادتاً یا اس روش کی بنا پر جو اسلاف سے متواتر چلی آ رہی ہے "نیک کام" کرتے ہیں انہیں نیک اس لئے سمجھتے ہیں کہ ان کاموں کو ان کے آباء اجداد نیک سمجھتے اور قرار دیتے چلے آئے ہیں ان سے ان کی ذات کی نشو و ارتقا اور ذہنی و قلبی جلا قطعاً نہیں ہو سکتی۔ لہذا یہ خیال کہ باب نبوت کی طرح باب تدبر بھی بند ہو چکا ہے کبھی قرآن کریم کا منشا نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے تدبر و تفکر کا حکم کسی خاص قوم یا خاص زمانہ کے ساتھ مقید نہیں رکھا۔ اس لئے اگر یہ سمجھا جائے کہ جس قدر تدبر و تفکر قرآن میں ممکن تھا ہو چکا، تو وہ تمام احکام جو قرآن نے تدبر و تفکر کے متعلق دیئے ہیں بیکار ہو جائیں گے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس قوم سے تدبر و تفکر کی قوت ساقط ہو جائے اس کا کیا حشر ہو اگر کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے یہ احکام آج بھی اسی طرح قائم العمل ہیں جس طرح اس سے پہلے تھے۔ صرف ہمارے دماغوں پر برف کے ٹودے جم رہے ہیں اور نہیں غور کرتے کہ قرآن کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔ اس نے کہا ہے کہ:-

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں میں قفل لگے ہوئے ہیں؟ تو جو لوگ پیٹھ پھیر کر مٹ گئے بعد اس کے کہ سیدھا راستہ ان کو معلوم ہو گیا، شیطان نے ان کو چمکے دیا اور انہیں

ہلکت دی گئی ہے۔ (۲۴/۲۵-۲۴)

دوسری جگہ ہے،

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا الشَّيْءَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا

وَعَمَلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً قَلْبًا هُمْ وَمِمَّا تُوْفُّوْنَ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝ (۲۱/۴۵)

یہ لوگ جو برائیوں میں اُبھے ہوئے ہیں کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو ان جیسا رکھیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے۔ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے گا۔ یہ بہت بُرا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔

اس آیت پر ذرا گہری نظر ڈالئے۔ قرآنِ کریم کا فیصلہ ہے کہ کافر و مومن کی زندگی برابر نہیں ہو سکتی۔

**مسلمانوں کی حالت** لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ مومنین کی زندگی کفار سے بدرجہا پست و ذلیل ہو چکی ہے۔ مسلمانوں کی کسی مجلس میں جائیے کسی انجمن کی روئیدار پڑھئے کسی کانفرنس میں شریک ہو جئے۔ ہر جگہ ہر وقت یہی مرثیہ خوانی ہوگی کہ مسلمان ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ ان کی رسوائیوں کی حد ہو چکی ہے۔ حالانکہ ذلت و مسکنت وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا انتہائی غضب قرار دیا ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ یہود پر جب ان کے خدا نے اپنا غضب نازل کیا ہے تو انہی الفاظ میں کہ:-

ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ فَوَبَّأَهُمْ بَغْضَبٍ مِّنَ اللَّهِ (۱۶۱/۲)

پس ان پر ذلت اور مسکنت کی مار ماری گئی اور وہ غضبِ الہی کے مستحق ہو گئے۔

مسلمانوں کی اس تباہی و بربادی کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے تحقیقاتی کمیٹیاں بھجائی جاتی ہیں۔ مفکرینِ قوم سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں۔ اربابِ حل و عقد طرح طرح کی تجاویز پیش کرتے ہیں۔ کئی ہنگامی تحریکیں اُبھرتی ہیں اور بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن بائیں ہمہ۔۔۔ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔۔۔ ان کی پستی و ذلت کے اسباب تلاش کرنے کے لئے ہمیں اس قوت کے سرچشمہ کا سراغ لگانا چاہیے جو ان کے عہدِ خوش بخشی میں کار فرما تھی۔ ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ قوت یہ روح قرآنی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کی بدولت تھی۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم دنیا میں زندگی کی قوتیں سلب کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ زندگی اور قوت کا پیغام بن کر آیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ

(۸/۲۴)

اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہا کرو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو زندگی بخشنے والی ہے۔

یہ پیغامِ حیات اس راہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو دنیا میں اَقْوَم ہے۔ وہ ہر اس قوم کو جو اس راہ پر

گامزن ہوتی ہے، شاد کامی و کامرانی کی بشارت دیتا ہے۔

یقیناً یہ قرآن اس روش کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے سیدھی راہ ہے (اَقْوَم) اور مومنوں کو

بشارت دیتا ہے کہ اگر انہوں نے عملِ صالح کئے تو ان کے لئے اجرِ کبیر ہوگا۔ (۱۷/۹)

ظاہر ہے کہ جب یہ قوم تمام دنیا کی تہذیبوں کی مالک بنی تھی تو اسی راہِ فلاح پر جاہد پیمانے سے بنی تھی۔ اور اگر یہ آج نکت و افلاس کے ذلیل ترین گڑھوں میں پڑی ہوئی ہے تو اس کی ایک اور صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ اس نے قرآنِ کریم کے دامن کو چھوڑ رکھا ہے۔ حالت آج یہ ہے کہ قدم چلتے ہیں اور مسافت طے نہیں ہوتی۔ ہاتھ اٹھتے ہیں لیکن ہلاکتوں کا بڑھتا ہوا سیلاب نہیں رکھتا۔

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ (۲۷/۹)

یہ اس لئے کہ انہوں نے قرآنِ کریم سے منہ موڑ لیا سو اللہ نے ان کے اعمال غارت کر دیئے۔

اس باب میں وہ لوگ جو دانتہ قرآنِ کریم سے اعراض برتتے ہیں اور وہ جو غلط تعلیمات کو حسن عقیدت کی بنا پر قرآنی تعلیمات سمجھتے ہیں اور باوجود متنبہ کئے جانے کے پھر بھی اپنے آپ کو راہِ راست پر سمجھتے ہیں، دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ اگر سنکھیا کو زہر قاتل سمجھ کر کھاؤ تو اور تریاق سمجھ کر نکل جاؤ تو ہلاکت دونوں صورتوں میں لازمی ہے۔ یہی وہ ہلاکت ہے جس کی طرف قومیں بتدریج غیر محسوس طور پر کھینچی چلی جاتی ہیں۔

اور جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں انہیں ہم بتدریج (تباہی کی طرف) لئے جا رہے ہیں اس

طرح کہ ان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ (۷/۱۸۲)

قرآن کا کس قدر واضح حکم ہے جس کی مسلمان اس دیدہ دلیری سے مخالفت کرتے ہیں۔

أَفَغَيَّرَ اللَّهُ أَسْمَاءَ حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا (۱۱۵/۶)

تو کیا اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں حالانکہ وہ ایسا ہے کہ اس نے

ایک مفصل کتاب تمہارے پاس بھیج دی ہے۔

یہی وہ وقت تھا جس کے لئے قرآن نے کہہ دیا تھا۔

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعوے کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں

جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور جو آپ سے قبل نازل کی گئی ہیں (اور) اپنے مقدمات شیطان

کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کو یہ حکم ہوا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں اور شیطان ان کو بہکا



کر گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ (۴/۶۰)  
یہی وہ واقعات ہیں جن کی رو سے قرآن کریم کے فیصلے کے مطابق ایک مؤمن، مؤمن کہلاتے ہوئے بھی مشرک ہو سکتا ہے۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (۱۳/۱۰۶)

اور اکثر لوگ خدا کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر اور کیا شرک ہو گا کہ آپ اپنے متنازعہ فیہ امور میں احکام خداوندی کے مقابلہ میں روایات کہن کو ترجیح دیں؟ رواج اور روایات انسانوں کے نقوش قدم پر بلا تحقیق و بلا تصدیق چلے جانے کا نام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اتباع صرف قرآن کا جائز ہے اور بس۔

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا

مَا تَذَكَّرُونَ ۝ (۷/۳)

اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اس کو چھوڑ کر دوسرے رفقاء

کا اتباع مت کرو۔ تم لوگ بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو۔

ایک مسلمان کے لئے یہ اتباع و اطاعت بہ جبر و اکراہ نہیں، بلکہ بطیب خاطر ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ تو ان الہی کے فیصلوں کو کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شو، کی حیثیت سے مانو، بلکہ اس فیصلے کے بعد اگر تمہارے دل میں ذرا سی تنگی بھی محسوس ہوئی تو ایمان جاتا رہا۔

پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایمان دار نہیں ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ باہمی اختلافات

میں یہ لوگ آپ سے فیصلہ کرایا کریں اور پھر آپ کے اس فیصلہ کے خلاف دل میں بھی کوئی تنگی

محسوس نہ کریں اور پورے طور پر تسلیم کر لیں۔ (۴/۶۵)

یہ ظاہر ہے کہ جو بات قرآن کے خلاف ہوگی وہ بہر حال کھلی ہوئی گمراہی ہوگی، خواہ آپ اسے آبار و اجداد میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیں۔ اسی قسم کے فیصلوں کو قرآن کریم نے زمانہ جاہلیت کے فیصلے قرار دیا ہے (۵/۵۰)۔

○

قرآن کریم نے اپنے نازل ہونے کی غرض یہ بتائی ہے کہ اقوام  
قرآن اختلاف مٹانے کے لئے آیا ہے | عالم میں جس قدر اختلافات موجود ہوں ان کو مٹا دیا جائے۔

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ ۗ وَهُدًى  
وَرَحْمَةً ۗ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (۱۶/۶۴)

اور ہم نے آپ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کو واضح کر دیں اور یہ ہدایت و رحمت ہے مومنین کے لئے۔

تاکہ نوعِ انسانی باہمی نزاعات و اختلافات کی وجہ سے جس سببیت و بربریت میں الجھ رہی ہے باہمی تشتمت و افتراق کے باعث جس وحشت و درندگی کا ثبوت دے رہی ہے اس سے نجات حاصل کر کے صراطِ مستقیم اور راہِ سعادت پر گامزن ہو جائے جو وحدتِ انسانی کا راستہ ہے اور جس میں کوئی کجی نہیں کسی قسم کی کوئی الجھن نہیں سب تعریف اس ذات کے لئے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی کجی

نہیں رکھی۔ (۸/۱)

لیکن واحسرتاً کہ جو قوم اپنے آپ کو حاملِ قرآن کہہ رہی ہے، تمام دنیا کو ایک مرکز پر لانا تو ایک طرف، خود ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ ہزاروں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا ہورہا ہے۔ یہ حالت صرف عوام کی نہیں، بلکہ جنہیں عوام کے رہنما ہونے کا دعویٰ ہے وہ خود اسی تشیع و تخریب کی آگ بھڑکانے میں ہمتن مصروف ہیں اور اس چیز کو خدمتِ دین بتاتے ہیں۔ ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسروں کو ناری بتاتا ہے، حالانکہ ہر ایک گروہ اپنے سامنے قرآن لے کر بیٹھا ہوا ہے، یہود و نصاریٰ پر قرآن کریم نے الزام یہ عائد کیا تھا کہ

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ ۖ وَقَالَتِ النَّصْرَىٰ لَيْسَتِ  
الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ ۖ وَلَا هُمْ يَشْلُونَ الْكِتَابَ ۖ (۲/۱۱۳)

یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا طریقہ ہل ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کا طریقہ ہل ہے اور (طرفہ نماشا) کہ دونوں کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہیں۔

کیا بعینہ یہی حالت آج مسلمانوں کی نہیں ہو گئی؟ ذرا غور سے دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس علت کے اندر قدرِ مشترک کیا ہے؟ یہود و نصاریٰ کے متعلق جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، قرآن کا اعتراض تھا کہ انہوں نے اپنے ربیان و اجار کو خدا بنا رکھا تھا۔ یعنی حلت و حرمت جائز و ناجائز میں بجائے کتابِ الہی کے، انسانوں کے طرف رجوع کرتے تھے۔ اب دیکھئے مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟ جب تک مسلمانوں کا کتابِ خداوندی سے تمسک رہا، دین کے معاملہ میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے اختلافی امور میں

کتاب اللہ کی جگہ انسانوں کو مرکز بنا لیا تو وہی حالت ہو گئی جو یہود و نصاریٰ کی تھی اور ملت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ کسی مسئلہ کو سامنے لائیں، ہمارے زوایا نے علم دین سے کبھی متہدہ آواز نہیں اُٹھے گی۔ ایک کچھ کہے گا اور دوسرا کچھ اور سند میں ہر ایک کسی نہ کسی بزرگ کا نام پیش کر دے گا۔ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں تخریفِ لفظی بھی کی تھی اور اس کے ساتھ تخریفِ معنوی کی بھی کمی نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے الفاظ کے تحفظ کی ذمہ داری خود لے لی۔ لہذا اس میں تو کسی انسان کا کچھ اختیار نہ رہا کہ کوئی کمی بیشی کر سکے۔ لیکن تخریفِ معنوی کا دروازہ تو ہر ایک کے لئے کھلا تھا۔ چنانچہ دانستہ یا نادانستہ یہ تخریف اس انداز سے ہوئی کہ جو لباس کسی کے حجب میں آیا قرآن کو پہنا دیا اور وہی لباس نفسِ قرآن سمجھ لیا گیا۔ اب اگر قرآن کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک کہرام مچ جاتا ہے، شورا اٹھتا ہے۔ اس لئے کہ اس سے انسانوں سے تعلق چھوڑ کر خدا سے تعلق وابستہ کرنا پڑتا ہے اور انسانوں کی محبت تکبت اللہ او اللہ! محبت“ دلوں کی انتہائی گہرائیوں میں سمائی ہوئی ہے۔ کعبہ دل سے اس بہت کدے کو نکالنا بڑے کرے صیف کا کام ہے۔ دل کے اس مرض کا علاج قرآن کے سوا اور کہیں نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ اس کا دعوئے ہے کہ:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ  
وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۰/۵۷)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک موعظت کی کتاب آئی (جس میں) تمہارے سینے (کے روگ) کی شفا ہے اور وہ مؤمنین کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔

یعنی جس طرح تیرنا اُسے ہی آئے گا جو پہلے پانی میں اترے، قرآن کریم کا یہ نسخہ، شفا اُسے ہی دے گا جو دل کو تمام غیر قرآنی خیالات سے صاف کر کے قرآن کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اس کے برعکس ایسے قلوب کا خدا حافظ جن کے متعلق قرآن نے خود کہہ دیا ہے۔

اور وہ کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف آپ ہمیں بلا تے ہیں ہمارے دل اس کی طرف سے پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگ ہے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب ہے سو آپ اپنا کام کئے جائیں۔ ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔ (۴۱/۵)



ان معروضات سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ماضی سے بے نیاز ہونا چاہتے ہیں۔ حال کے استحکام اور مستقبل

کی درخشندگی کے لئے ماضی سے وابستگی ضروری ہے۔ ماضی گزرے ہوئے حال ہی کا تو نام ہے۔ لیکن ماضی سے وابستہ ہونا اور ماضی کی پرستش کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ علمائے سلف نے اسلام کی جو خدمات کی ہیں وہ ہمارے لئے باعث افتخار و مایہ ناز ہیں۔

## ماضی پرستی

اگر ہم آبار و اجداد کے دنیاوی ترکہ کے وارث بننے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے بلکہ اسے باعثِ عزت سمجھتے ہیں تو ان کے علمی ترکہ کو ہم باعثِ تنگ و عار کیوں سمجھیں؟ اس ترکہ سے ہمارا وقار قائم ہے۔ لیکن ہر چیز کو اس کی اپنی جگہ پر رکھنا بھی ضروری ہے۔ جیسے کسی کی تحقیر ناروا ہے ویسے ہی اس کی شان میں غلو و افراط کے کام لینا بھی مستحسن نہیں۔ حضراتِ متقدمین علم و بصیرت رکھتے تھے۔ لیکن تھے تو انسان ہی۔ خدا تو نہیں تھے۔ انہیں خدا کا مرتبہ دینا ان کے حق میں اچھا ہے نہ اپنے حق میں۔ جس درجہ امامت و اجتہاد میں وہ پہنچے تھے، اس تک آج بھی پہنچا جاسکتا ہے اور جو مسائل انہوں نے اپنے ماحول کو مد نظر رکھ کر قرآن کی روشنی میں مستنبط کئے تھے آج کے ماحول کے مطابق ویسے ہی دستاویز و قوانین آج بھی مرتب کئے جاسکتے ہیں جن کا سرچشمہ وہی اصول دین ہوں گے۔ لہذا سب سے پہلے علماء حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اس بات کو محسوس کریں کہ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا اور وہ امت مسلمہ کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ رسول اکرم نے فرمایا تھا کہ مؤمن کی زندگی کی شان ہی یہ ہونی چاہیے کہ اس کا آج، گزشتہ کل سے ترقی یافتہ ہو لیکن یہاں ہمیشہ یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے زیادہ بد بخت ہے۔ لہذا ایسی قوم کا خدا حافظ۔

اس کے دل سے پوچھئے اس کے جگر سے پوچھئے

آج جس کی منزل مقصود کل سے دور ہے

اس میں شبہ نہیں کہ آج الحاد و مادہ پرستی کا سیلاب اُمنڈے چلا آ رہا ہے۔ لیکن ان میں سب سے بڑا سبب خود ہمارے علماء حضرات کا بے وجہ تشدد اور بے معنی تنگ نظری ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اسلام کے احکام دو اقسام پر مبنی ہیں۔ ایک وہ جن میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لیکن دوسری قسم ان احکام کی ہے جو امت کے عام حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ زمانہ کے بدلنے کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں اس لئے ان کے متعلق احکام بھی اٹل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ قرآن نے یہی کیا کہ ان کے لئے اصول تو وضع کر دیئے لیکن ان کی روشنی میں جزئیات ترتیب دینے کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا رکھا۔ اس دروازے

کو بند کر دینا، دین میں 'خلافت' منشاءِ خداوندی، سختی پیدا کر دینا ہے۔ اربابِ عقل و فکر کا فرض ہے کہ وہ قوم کی اقتصاد، معاشرتی، اخلاقی، سیاسی، معاشی ضروریات پر غور کریں اور انہیں اس دین کا راستہ بتائیں جو ان کے لئے ان ضروریات کا حل پیش کر سکے۔



آج مسلمانوں کی ترقی و بہبود کے لئے طرح طرح کی تحریکیں پیدا ہو رہی ہیں۔ بختنیں، کانفرنسیں، جلسے، ریزولیشن، کمیٹیاں، تحریریں، تقریریں، غرضیکہ ہر ایک دوا اور ہر ایک دُعا بردے کا رلائی جا رہی ہے۔ لیکن نہ دوا میں شفاء، نہ دُعائیں اثر۔ قوم کی حالت روز بروز افسوسناک ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی آخر وجہ کیا ہے؟ اسلام تو ایک شجرِ مقدس ہے جس کی جڑیں زمین میں اور شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر یہ شجرِ طیب ہمیں بھی وہ پھل کیوں نہیں دیتا جو اس کی فطرت کا خاصہ ہے؟ اس کا جواب واضح ہے۔ اس کی علت بالکل عیاں ہے۔ آپ نے عام طور پر دیکھا ہو گا کہ بیری کے درخت پر بالخصوص اور دیگر درختوں پر بالعموم، ایک خاص قسم کی بیل پیدا ہو جاتی ہے، جسے اکاس بیل کہتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ تمام درخت پر چھا جاتی ہے۔ آپ اس درخت کو کتنا ہی سینچئے، اس کی کتنی ہی پرورش کیجئے، وہ کبھی برومند نہیں ہو سکتا۔ اس درخت کو آپ جتنی غذا پہنچانے کی کوشش کریں گے، اکاس بیل اتنی ہی بڑھتی جائے گی اور درخت سوکھ کر زرد پڑتا جائے گا۔ جب تک اس بیل کو اتار کر پھینک نہیں دیا جاتا، درخت سرسبز نہیں ہو گا۔ قرآن کے شجرِ مقدس پر ایک مدت سے انسانی تعلیمات کی اکاس بیل پڑھی ہوئی ہے۔ لہذا آپ اپنی دانست میں شجرِ اسلام کی تقویت کی جس قدر کوشش کریں، اس سے وہ دراصل اس بیل، اس غیر جنس کی تقویت کا موجب ہوتی جاتی ہے۔ اسلام کی برومندی بار آوری کے لئے سب سے پہلے اس بیل کو اتار کر پھینک دینا ضروری ہے۔ اس کے بعد اصل درخت کی پرورش خود بخود ہو جائے گی۔

ان گزارشات کے بعد کیا بادل دریافت کرنے کی اجازت حاصل کی جاسکتی ہے کہ  
 اَلْمَيَانِ لِلَّذِينَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ  
 مِنْ اَلْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوْا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ  
 عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَفَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت اور اس چیز کے لئے جو حق کے ساتھ نازل کی گئی ہے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے قبل کتاب ملی تھی۔ پھر ان پر ایک زمانہ گزر گیا۔ پھر ان کے دل سخت ہو گئے اور بہت سے ان میں سے فاسق ہیں۔



# کیا تمام مذاہب بڑیکساں ہیں؟

(نوشتہ اگست ۱۹۴۱ء)

کچھ عرصہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک رسم سی پیدا ہو گئی ہے۔ مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کئے جاتے ہیں جن میں مختلف ادیان عالم کے نمائندے اپنے اپنے مذاہب کے محاسن بیان کرتے ہیں۔ ان تقاریب سے مقصد بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اہل مذاہب ایک دوسرے کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں اور یوں ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے جو لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ اگرچہ اس مقصد کی عمدگی اور ان اجتماعات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن میں نے جب کبھی ان اجتماعات کی روئیداد کو پڑھا مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان میں (کم از کم) اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں بہت کم پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام امن و سلامتی کا پیغام اور نوع انسانی کے لئے آیہ رحمت ہے اس لئے اس میں غیر مذاہب سے رواداری، حسن سلوک اور وسعت نظر کی تعلیم ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کے مقابلہ میں ایک خاص افضلیت کا مدعی ہے۔ اس کا دعوئے ہے کہ خدا کا پیغام اپنی اصلی شکل میں آج صرف قرآن کریم کے اندر ہے جو خدا کا آخری پیام اور ایک ایسا مکمل ضابطہ سعیات ہے جو قیامت تک کے لئے انسانی زندگی کی ہر شاخ میں ہدایت کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ ان اجتماعات میں اسلام کی وسعت نظر، کشادگی، رواداری، حسن سلوک کا چرچا تو عام کیا جاتا ہے لیکن اس کی اس خصوصیت یعنی اس کی افضلیت و اہمیت، برتری اور فوقیت کے متعلق ایک حرف زبان تک نہیں لایا جاتا کیونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح اہل مذاہب کی دل شکنی ہوگی اور وہ اسلام کے نمائندہ کو متعصب اور تنگ نظر خیال کریں گے۔ لہذا رواداری اور کشادگی کے اس غلط مفہوم سے متاثر ہو کر اسلام کے نمائندوں کو

اسلام کے لئے "مذہب" کا لفظ دوسروں سے تقابل کی خاطر لکھ دیا گیا ہے، ورنہ اسلام مذہب نہیں دین ہے۔

اسلام کی صحیح ترجمانی کا حوصلہ نہیں پڑتا اور وہ ان اجتماعات میں کچھ ایسے سمٹے سمٹائے، جھجکتے لجاتے ہوئے آتے ہیں۔

چوزا ہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید

اس نقطہ خیال سے جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس قسم کی کانفرنسیں کسی بہتر نتیجہ کی طرف منجر نہیں ہوتیں۔ بلکہ میں تو ایک عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ یہ چیز بجائے فائدہ کے نقصان کا باعث ہو رہی ہے۔ ان اجتماعات کے انعقاد سے یہ مقصد ہویا نہ ہو لیکن اس کا نتیجہ یقیناً یہی مرتب ہو رہا ہے کہ رفتہ رفتہ اسلام کی اس ماہہ الاقیب از خصوصیت کو پس پشت ڈال کر اسے دوسرے مذاہب کی سطح پر لا کھرا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ واقعات آہستہ آہستہ بتا رہے ہیں کہ یہ خدشہ موموم اور یہ احتمال قیاسی نہیں۔

اول جون ۱۹۴۱ء میں شولا پور کے مقام پر اسی قسم کی ”تمام مذاہب کی کانفرنس“ منعقد ہوئی جس کے صدر ہندو قوم کے مشہور کارکن پنڈت سندر لال جی تھے۔ اس کانفرنس میں اسلام کے نمائندہ نے جو کچھ کہا اس کی تفصیل تو معلوم نہیں ہو سکی، البتہ جناب صدر نے اپنے خطبہ میں پورا زور اس بات کے ثابت کرنے میں لگا دیا کہ اسلام خود تسلیم کرتا ہے کہ نجات و سعادت کی راہیں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اور کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ اصل مذہب ”خدا پرستی اور نیک عملی“ کی زندگی ہے اور یہ اصل ہر مذہب میں موجود ہے۔ فرق صرف شرع و مہناج (فروع) میں ہے، اور یہ فرق کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ پنڈت جی نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا، بلکہ شروع سے آخر تک جناب ابوالکلام صاحب آزاد کی تفسیر | صاحب آزاد کی تفسیر | (ترجمان القرآن جلد اول) سے شرح و بسط سے

اقتباسات پیش کر دیئے۔ جن سے حرفاً حرفاً ان کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ آپ کو غالباً معلوم ہو گا کہ ہندوؤں کی طرف سے اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوا تھا اور پنڈت جی نے خطبہ میں اس کا حوالہ پیش کیا ہے۔ مجھے نہ تو ان امیال عواطف سے کچھ بحث ہے جو اس تفسیر کے محرک ہوئے اور نہ ان مقاصد سے واسطہ جو اس کے ہندی ترجمہ اور اس کی عام اشاعت سے پیش نظر ہیں۔ مجھے تو قرآن کریم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ دیکھنا ہے کہ یہ خیالات قرآن کریم کی رو سے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اس سے پیشتر بھی بنجما بنجما بہت کچھ لکھا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر تفصیلی طور پر لکھا جائے تاکہ ان خیالات کو عام کرنے والے یہ کہہ کر فریب خوردگی اور فریب دہی کے مرتکب نہ ہو سکیں کہ اسلام خود اس تعلیم کا موید ہے۔ اس تفصیلی بحث کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب یہ محسوس کیا جائے کہ ہمارے نوجوان طبقہ پر اس تعلیم کا کیا اثر پڑ رہا ہے؛ تمام مذاہب یکساں ہیں، عالمگیر سچائیاں سب



میں ایک جیسی ہیں۔ خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی نجات و سعادت کی ضامن ہے۔ ہدایت خدا کی رحمت ہے جو کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہو سکتی۔ وغیرہ وغیرہ خیالات ایسے نظر فریب اور خوش آئند ہیں کہ سطح بین نگاہیں فوراً اس سحر سے مسح ہو جاتی ہیں۔ اور جب اس سطحی کشش و جاذبیت کو جناب آزاد جیسے مفسرِ قرآن کی تائید بھی حاصل ہو جائے تو اس سحر کے سحر حلال بن جانے میں کوئی شے مانع ہو سکتی ہے؟



**الکبر کا دین الہی** | ارواداری کے اس نظر فریب مفہوم اور وسعتِ نگاہ کی اس سراب آسا تفسیر کی پہلی جھلک ہمیں شہنشاہِ اکبر کے دین الہی میں ملتی ہے۔ جس طرح وہ جذبات و مقاصد جو اس تحریک کے محرک تھے، تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں، اسی طرح وہ مساعی جمیلہ بھی ان کی نگاہوں سے مستور نہیں جو اس اسلام سوز نظریہ کے ابطال و استیصال کے لئے مجاہدانہ انداز سے معرض وجود میں آئیں۔

برہو سماج فرقہ کی تحریک بھی قریب قریب انہی بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے لیکن چونکہ یہ تحریک مسلمانوں کی طرف سے وجود میں نہیں آئی اس لئے وہ ہمارے دائرہ تنقید سے باہر ہے۔

اس کے بعد ہی نظریہ موجودہ سیاسی کشمکش کے طوفان میں سطح کے اوپر لایا گیا۔ اس نظریہ کی اشاعت کی موجب جناب آزاد کی تفسیر ہوئی اور اس طرح سے یہ چیز مسلمانوں میں دین کی حیثیت سے پھیل گئی۔ جناب آزاد مسلمانوں میں ایک عالم دین اور مفسر کی حیثیت سے امتیاز حاصل کر چکے تھے اور ان کی زبان اور قلم کا مسلمانوں کے دلوں پر گہرا اثر تھا۔ اس لئے اس تفسیر کا ایک عرصہ سے انتظار ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ اس کا استقبال ہوا۔ لوگوں نے اسے آنکھوں سے لگایا، سر پر اٹھایا اور مختلف گوشوں اور متنوع حلقوں سے اس کی تعریف اور توصیف میں غلغلہ انداز نعرے بلند ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جناب آزاد کے ترجمہ میں ایک خصوصیت ضرور ہے جس کی تعریف نہ کرنا، نکل ہوگا، لیکن بحث تو ان کے اس نظریہ سے ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ کتاب کی اشاعت کے زمانہ میں دُور شوق اور جوش عقیدت کے اس دالہانہ ہجوم میں کسی کی نگاہ اس طرف نہ اٹھی۔ برنگِ خود بینی نہیں بلکہ اظہارِ واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس اثرِ دحام مدح و ستائش میں یہ توفیق اللہ تعالیٰ نے راقم الحروف کو عطا فرمائی کہ جناب آزاد اور اہل نظر طبقہ کی توجہ اس بنیادی غلطی کی طرف مبذول کرائی جائے جو اس تفسیر کے ذریعہ سے عام ہونے والی تھی۔ چنانچہ مجلہ معارف (بابت جنوری ۱۹۲۳ء) میں میرا وہ مضمون شائع ہوا جس میں تفسیر کے اس حصہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی تھی! اس

مضمون کو اور بابِ نظر کے حلقہ میں مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے مختلف گوشوں سے جناب آزاد کے نظریہ کی مخالفت میں آوازیں بلند ہوئیں۔ اس واقعہ کو آٹھ نو برس ہو چکے ہیں چونکہ وہ تنقیدی مضامین جو اس نظریہ کے خلاف شائع ہوئے تھے لوگوں کی نگاہوں سے وقتی طور پر گزرے، اس لئے ان کی یاد محو ہوتی چلی گئی۔ (متفرق مضمونوں کا اثر ہوتا بھی وقتی ہے۔ اور تفسیر چونکہ مستقل کتاب کی شکل میں ہے اس لئے وہ ہر وقت سامنے رہتی ہے۔ اس کے بعد بھی جب کبھی اس نظریہ کا چرچا عام ہونے لگا، میں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ تین برس ادھر سے کبھی کبھار مجلہ طلوع اسلام میں بھی اس کا تذکرہ چھڑتا رہا، لیکن بائیں ہمہ یہ وقتی کوششیں ایک مستقل تصنیف کے مقابلہ میں زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ تاوقتیکہ انہیں یہ تسلسل نہ رکھا جائے، بالخصوص جبکہ اس نظریہ کی اشاعت میں غیر مذہب کے لوگ بھی کوشاں ہوں۔ میرے نزدیک اسلام کے لئے یہ نظریہ بہت بڑا خطرہ اپنے اندر رکھتا ہے، اس لئے کہ جب آپ ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیں کہ اسلام میں دیگر مذہب کے مقابلہ میں کوئی ماہِ امتیاز خصوصیت نہیں تو اس کے بعد اسلامی نظامِ زندگی سے شیفتگی اور اس کی سرفرازی کے لئے آرزوئیں اور کوششیں سب ختم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کی تمام سیاسی جدوجہد بھی جسے اس قدر اہمیت حاصل ہے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ قوموں کی زندگی کا راز ان کے عقیدہ (نصب العین حیات) سے وابستہ ہے۔ جس قدر کسی قوم کا سطحِ نظر (عقیدہ) بلند اور اس کے افراد کو جس قدر اس سے عشق ہوگا، اتنی ہی وہ قوم زندگی کی دولت سے بہرہ یاب ہوگی۔ نظریہ حیات (عقیدہ) کی ایک ذرا سی غلطی قوم کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ گاڑی جب کاٹنا بدلتی ہے تو دونوں لائنوں میں اونچ بھر کا غیر محسوس سا فرق ہوتا ہے، لیکن اس کا کاٹنا بدلنے میں اگر ایک نمبر کی بھی غلطی ہو جائے تو کھوڑے عرصہ کے بعد وہ گاڑی نہ صرف اپنی منزل ہی سے کوسوں دُور ہو جائے گی، بلکہ اسے ہر قدم پر ہلاکت اور تباہی کا سامنا ہوگا۔ میرے نزدیک جناب آزاد کا نظریہ ایک ایسی ہی ہلاکت آفریں غلطی ہے جو اگر بدستور قائم رہی تو نہ معلوم کسی وقت کیا رنگ لا کر رہے۔ یہی وہ احساس ہے جو مجھے بار بار اس موضوع پر لکھنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔



لے حصولِ پاکستان کی تحریک کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ مسلمان اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے ایک آزاد مملکت کی ضرورت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ صاحب! آجکل دوسرے مذاہب کے پیرو اس روش کی طرف آرہے ہیں کہ وہ اپنے ہی مذہب کو سب سے اعلیٰ و ارفع نہیں بتاتے بلکہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا مذہب بھی باقی مذاہب جیسا ہے اس طرح وہ رنگ خود بخود بدل رہا ہے جس میں مباحث و مناظرات کے اٹھاڑے قائم ہو کر تھے اور ہر مذہب والا اپنے مذہب کی اولیت و افضلیت ثابت کرنے میں نبرد آزما ہی کرتا تھا۔ دوسرے مذاہب والوں کا تو یہ مسلک ہے اور ادھر یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کو پھر اسی مقام پر پہنچ جانے کی **تنگ نظری کا طعنہ** تلقین کی جا رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ناروا بحث و جدل عمدہ نتائج کی حامل نہیں ہوتی اور اس سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہوں، لیکن معترض حضرات ذرا سوچیں تو سہی کہ وہ کیا فرما رہے ہیں؟ جس چیز کو وہ دیگر اہل مذاہب کی وسعت نگاہ اور مسلمانوں کی تنگ نظری قرار دے رہے ہیں اس کی اصلیت کیا ہے؟ یوں سمجھتے کہ (مثلاً زید) کا ایک بچہ ہے۔ بڑا غبی اور نالائق۔ عمر کا ایک بچہ اس کے مقابلہ میں بڑا ذکی اور ذہین ہے۔ زید ہر مقام پر کہتا پھرتا ہے کہ صاحب! میں تو کبھی یہ نہیں کہتا کہ میرے بچے کو کوئی خاص افضلیت حاصل ہے۔ میرے نزدیک تو میرا اور عمر کا بچہ بالکل یکساں ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تو عمر کی خود ستائی ہے کہ اپنے بچہ کے برابر کسی اور کو سمجھتا ہی نہیں!

فرمائیے کہ یہ اصول زید کی وسعت نظر اور عمر کی تنگ دامنی کا آئینہ دار ہے یا کسی اور حقیقت کا غمگین؟ دورِ حاضر میں زمانے کے تقاضوں سے ہوا یہ ہے کہ اسلام کے سوا باقی تمام مذاہب کو دقت پیش آرہی ہے کہ ان کے معقولات علم و عقل کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے ہیں نہ ان کے اصول و ضوابط انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور گونا گوں مقتضیات کے لئے کوئی حل پیش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہیں آئے دن اپنی عملی ضروریات کے لئے اصرار دھر سے اصول و قوانین مستعار لینے پڑتے ہیں۔ اس لئے وہ مذاہب انسان کی برق رفتار ترقی کا ساتھ دینے سے قطعاً قاصر ہیں۔ رفتہ رفتہ ان مذاہب کے ماننے والوں کی حالت یہ ہوتی جا رہی ہے کہ انہیں نہ اپنے عقائد پر یقین رہا ہے اور نہ ہی اپنے مذہب سے وابستگی۔ وہ مذہب سے برگشتہ ہو رہے ہیں اور ان کی یہ برگشتگی بعض صورتوں میں سرکشی اور بغاوت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ قوم کی زندگی کا راز عقائد سے وابستگی میں مضمر ہے۔ اس لئے ان مذاہب کے اربابِ حل و عقد کو خطرہ ہے کہ کہیں اس طرح رفتہ رفتہ یہ شیرازہ ہی منتشر نہ ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں وہ دیکھ رہے کہ قرآن کس طرح انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دیتا ہے۔ انہیں خطرہ ہے کہ ان حالات کے پیش نظر ان کے مذاہب کے پیروں

سمجھ دار طبقہ اسلام کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ ان حالات کے ماتحت وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ان کا اپنے مذہب گزیدہ نوجوانوں سے یہ کہنا کہ ان کا مذہب تمام مذاہب عالم سے اعلیٰ و افضل ہے، کس قدر بے نتیجہ اور بے معنی ہے۔ اس لئے انہوں نے اس خطرہ سے بچنے کی وہی راہ نکالی ہے جو زید نے اپنے بچے کے متعلق اختیار کی تھی۔ انہوں نے یہ کوشش شروع کر دی ہے کہ اگر ان کا مذہب اتنا اونچا نہیں جاسکتا جہاں اسلام ہے تو یہی کیا جائے کہ اسلام کو اس کی سطح سے نیچے اتار کر اپنے مذہب کی سطح پر لاکھڑا کیا جائے اور اس طرح ان کے مذہب سے برگشتہ ہونے والوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ مذاہب سب ایک جیسے ہیں اس لئے اپنے مذہب سے یہ سمجھ کر بیزار نہ ہو جائیے کہ اس سے بہتر مذہب بھی دنیا میں موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب کا دائرہ پرستش اور عبادت تک محدود ہے۔ اس اعتبار سے سب یکساں ہیں۔ باقی رہا نظام زندگی، سو وہ مذہب سے الگ شے ہے۔ اسے قوم کی اجتماعیت تشکیل دیتی ہے، اس لئے اس اعتبار سے قومیت ہی وہ نقطہ ہے جس سے متمسک رہنے میں راز حیات ہے۔ ان زیرک حضرات نے اس طرح اس آنے والے خطرہ سے اپنی قوم کو بچا لیا ہے۔ یعنی اپنے مذہب کی کمزوری کو ”وحدت ادیان“ کے نقاب میں چھپا لیا اور قوم کی اجتماعیت کے لئے ایک دوسرا محاذ (قومیت) تلاش کر لیا۔

یہ ہیں وہ مقضیات و عواطف جن کے ماتحت ”یکسانیت مذاہب“ کی یہ تحریک وجود کو شش ہوئی ہے۔ آپ مختار ہیں کہ اس کا نام جو جی میں آئے رکھ لیجئے۔ لیکن ذرا اس شخص کی کیفیتِ قلب کا بھی تو احساس کیجئے جو یہ مانتا ہو کہ یہ زمانہ آنا تھا جس میں تمام مذاہب والے اپنے اپنے مذہب کے ناقص ہونے کے اعتراف پر مجبور ہو جائیں۔ یعنی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات انہیں اس امر کے اعتراف پر مجبور کر دیں کہ ان کا مذہب واقعی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں اسلام کے دین حقیقی ہونے کا دعویٰ علیٰ وجہ البصیرت دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکتا تھا۔ اور یوں اس کی افضلیت و اکملیت کا اقرار لیا جاسکتا تھا۔ یہی وہ حالات تھے جن میں قرآن کے اس وعوے کو ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آنا تھا کہ

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ

كُلِّهِ ۗ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝ (۹/۳۳)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطہ حیات اور نظام خداوندی دے کر بھیجا تاکہ وہ نظام تمام نظاہرہائے عالم پر غالب آجائے۔ خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

جو شخص قرآن کی اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان رکھتا ہو، کہیے کہ جب وہ دیکھے کہ عین اس زمانہ میں خودِ اسلام کے نام لیواؤں کی طرف سے یہ نظریہ پیش ہو رہا ہے کہ ”تمام مذاہب یکساں ہیں“ تو وہ کس طرح اس عقیدہ کو مبنی علیٰ الحقیقت اور اس کی اشاعت کو خدمتِ اسلام قرار دے لے؟

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم یہ دعویٰ کرو گے کہ ہمارا مذہب تمام مذاہب سے ارفع و اعلیٰ ہے اور نجات و سعادت اس سے باہر اور کہیں نہیں، تو اسی قسم کا دعوئے دوسرے اہل مذاہب بھی کرنے لگ جائیں گے اور پھر وہی تقابل و توازن کا سوال پیدا ہو جائے گا۔ سوا اول تو اب مقابلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ دن گئے جب نظری مسائل کی بنا پر مباحثات و مناظرات کی بزم آرائیاں ہو ا کرتی تھیں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ ساری دنیا اپنے اپنے نظریاتِ زندگی سے تنگ آچکی ہے اور انہیں تلاش ہے کہ کہیں سے ایسا نظریہ حیات مل جائے جس کے ماتحت انسان امن و سلامتی کی زندگی بسر کر سکے۔ جن اقوام نے قومیت کو امن و سکون کا ضامن بنایا تھا وہ اب محض

### دستِ تیر سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

کے مطابق طوعاً و کرہاً بنا کر رہے ہیں۔ ان حالات میں تقابل کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ اب تو صرف صحیح اسلام کو اجاگر کرنے کی دیر ہے، تشنہ لب دنیا خود بخود اس چشمہ حیات کے گرد جمع ہو جائے گی۔ لیکن اگر مقابلہ کے سوال کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی مقابلہ سے گھبرانا کون ہے؟ عمر کے لئے تو یہ چیلنج نوید مسرت ہے کہ اس کے اور زید کے بیٹے کو مقابلہ کے امتحان میں بٹھا دیا جاتے۔ اگر دنیا پوچھنا چاہتی ہے تو بڑی خوشی سے پوچھ لے ہم بتائیں گے کہ ان کے نظریاتِ زندگی کہاں کہاں اور کیوں ناکام رہے اور ان کے مقابلہ میں اسلام کون سا ضابطہ زندگی پیش کرتا ہے جو ان تمام اسفام و عیوب سے پاک ہے۔ لیکن اس وقت میرا مخاطب غیر مذہب والوں سے نہیں۔ اس وقت میں صرف انہیں مخاطب کرنا چاہتا ہوں جو مسلمان کہلانے کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اس تخصیصِ مخاطب سے مقصد یہ ہے کہ ہم اس نظریہ کو قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھیں گے۔ غیر مذاہب والوں سے بات کرنے میں طریق استدلال اس سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن حجت نہیں ہوتا۔ لہذا میرا مخاطب ان سے ہے جو قرآن کو حجت مانتے ہیں۔ لہذا اگر قرآنِ کریم سے یہ ثابت ہو جائے کہ شرفِ انسانی کی تکمیل، حال اور مستقبل کی سرفرازی و سر بلندی، ہر قسم کی فلاح و بہبود اور نجات و سعادت، اس بیخِ زندگی (دین) سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا ترجمان قرآنِ کریم

اور جس کے عملی بیکر محمد رسول اللہ میں تو دنیا سے کتنی ہی تنگ نظری پر کیوں نہ محمول کرے، آپ کو دوسروں کے پیالیوں کے مطابق انگاہ کی ہزار وسعتیں اور قلب کی لاکھ کشادگیاں "اس تنگ نظری پر" قربان کر دینی چاہئیں۔ اگر آپ اس کے لئے تیار ہیں تو دامنِ خداوندی کے سایہ رحمت میں آپ کے لئے جگہ ہے۔ اور اگر آپ اسے (معاذ اللہ) فی الواقع تنگ نظری اور کوتاہ ظرفی خیال کرتے ہیں تو اپنی نگاہ کی وسعتوں کے لئے ایسا آسمان تلاش کر لیجئے جہاں جھوٹے کو جھوٹا کہنا تنگ نظری قرار پائے۔ جہاں ناقص کو ناقص کہنا رواداری کے خلاف سمجھا جائے جہاں سچے سے اس لئے اجتناب کیا جائے کہ اس سے جھوٹے کی دل شکنی ہوتی ہے۔ جہاں حقائق کو اس لئے چھپایا جائے کہ ان کے بے نقاب ہوجانے سے مصنوعی نگوں کے چہرے کا رنگ فق ہو جانے کا ڈر ہے۔ اسلام میں تو حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا ہی بڑے گاؤں کو کعبہ المشرفہ کڈنا۔ جب یہ حقیقت ثابتہ ہے کہ آج اس آسمان کے نیچے خدا کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام اپنی اصلی اور مکمل شکل میں قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں تو اس حقیقت کے اعلان سے اس لئے سچا کچھ ہٹ پیدا ہونا کہ اس سے دوسرے تنگ نظری کا طعنہ دیں گے، اگر خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو راضی رکھنے کا عمل شرک نہیں تو اور کیا ہے؟

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكُتُبِ ۗ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّعِينُونَ ۝ (۱۷/۸۹)

جو لوگ ان باتوں کو چھپا لیتے ہیں جو ہم نے سچائی کی روشنی اور ہدایت سے نازل کی ہیں، باوجودیکہ ہم نے لوگوں کے لئے انہیں کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنتیں بھی ان کے حصے میں آتی ہیں۔



**جناب آزاد کے معتقدات** | جناب آزاد کی محولہ صدر تفسیر تقریباً پونے دو صد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس کے اخیر میں انہوں نے ان طولانی مباحث کو چند صفحات

میں سمٹا دیا ہے۔ یہی وہ خلاصہ بحث ہے جس سے پنڈت سندھ لال جی نے اپنے دعوے کے اثبات میں اقتباسات پیش کئے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے ان مقامات کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔ آپ تجزیہ فرماتے ہیں:-

لیکن قرآن نے نوع انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔  
(الف) اس نے نہ صرف یہی بتلایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب

سچے ہیں اس نے کہا دین خدا کی عام بخشش ہے اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت کو دیا گیا ہو اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

(۵) اس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے، ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہو اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو سکتے تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہیں۔

(۶) اس نے بتایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں کو اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے۔ وہ دین حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا اس کے لئے نجات ہے خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

(۷) اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب اپنی مشترک اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں وہ کہتا ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ لیکن ہر دین مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سر نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا اور انہوں نے مجھے قبول کر لیا تمام مذاہب کی مشترک اور متفقہ سچائی یہی ہے جسے وہ اللہ اور اسلام کے نام سے پکارتا ہے۔

(ترجمان القرآن، جلد ۱ صفحہ ۱۶۳-۱۶۲، ۱۹۴ء ایڈیشن صفحہ ۲۱۳-۲۱۲)

دوسرے مقام پر شرع و منہاج کے اختلاف کے ذیل میں لکھتے ہیں:-

لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں یہ اعمال و رسوم نہ تو اصل حقیقت میں نہ ان کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے۔ یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے لیکن روح و حقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی

زندگی یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب  
میں یکساں طور پر موجود ہے۔ (صفحہ ۱۲۷)

(۱۹۲۷ء ایڈیشن، صفحہ ۱۸۹)

متعدد دیگر مقامات پر بھی انہی خیالات کو دہرایا گیا ہے۔ (بہتر ہو کہ تفسیر مذکور کا آپ خود مطالعہ کریں  
اور سیاق و سباق کو ملاحظہ کر لیں کہ جناب آزاد کا نظریہ کیا ہے) اس کے بعد یہ دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو  
سے نجات و سعادت کے لئے صرف خدا پرستی (اللہ کو مان لینے) اور نیک عملی، ہی کی ضرورت ہے یا ان کے ساتھ  
رسالتِ محمدیہ پر بھی ایمان کی ضرورت ہے (جس کے ساتھ ہی قرآن کریم پر ایمان بھی لازم آجاتا ہے۔ اور رسالت  
نبی اکرم اور قرآن پر ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ شریعتِ قرآنی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ اسی کا نام نیک عملی  
ہے)۔ یعنی ساری بحث کا نقطہ ماسکہ یہ ہے کہ نجات و سعادت کے لئے ایمان بالرسالت اور قرآنی شریعت  
کا اتباع بھی ضروری ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں کفار و مشرکین کے علاوہ اہل کتاب کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ وہ  
لوگ تھے جو اللہ پر ایمان کے علاوہ نبی اکرم سے پیشتر کسی نہ کسی رسول اور قرآن سے پہلے کسی نہ کسی کتاب پر ایمان  
رکھتے تھے۔ لہذا اگر بحث کو اور مختصر کر دیا جائے تو وہ اس نقطہ میں سمٹ کر آجائے گی کہ کیا قرآن کریم کی رو سے  
اہل کتاب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ رسالتِ محمدیہ اور اتباعِ قرآن پر بھی ایمان لائیں یا اتنا ہی کافی ہے کہ  
وہ اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر پختگی سے عمل پیرا ہو جائیں۔ اگر قرآن کریم اہل کتاب سے بھی رسالتِ محمدیہ  
اور اتباعِ قرآن کا مطالبہ کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس کے سوا نجات و سعادت کی کوئی اور راہ نہیں تو  
بات صاف ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جب اہل کتاب سے بھی ان چیزوں کا مطالبہ ہو تو غیر اہل کتاب سے یہ  
مطالبہ اور بھی شدید ہو جائے گا۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآن کریم جس چیز کو دین یا اسلام کے نام  
سے پیش کرتا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ قرآنی تعلیم کا اس باب میں

**دین سے کیا مراد ہے؟** مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے  
مختلف زمانوں میں مختلف اقوام و ملل میں حضراتِ انبیاء کرام کی وساطت سے پیغامات آتے رہے۔ ان پیغامات  
کی اصل و بنیاد ہمیشہ ایک رہی۔ یعنی خدائے واحد کی عبودیت، اس کے سوا کسی اور کو اس قابل نہ سمجھنا کہ اس  
کے حکم کی اطاعت کی جائے۔ لیکن اس اصل کو روئے کار لانے کے لئے عملی نظام کی تشکیل میں مقتضیات  
زمانہ کے اعتبار سے فرق ہوتا رہا۔ یہ پیغامات آتے۔ کچھ عرصہ اپنی شکل میں قائم رہتے۔ اس کے بعد یا تو آفاتِ ارضی



و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتے یا خود انسانوں کی دست برد سے ان میں تحریف و الحاق ہو جاتا۔ کہیں یہ فراموش ہی کر دیئے جاتے۔ لہذا کچھ وقت کے بعد ان پیغامات کی پھر سے تجدید ہو جاتی۔ انہی جیسے پیغامات (آیات اللہ) کا پھر نزول ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت بھی تھی۔ یعنی انسانیت خود اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ لہذا اس کے مقتضیات اور ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اس لئے ہر زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق نظام خداوندی کی تشکیل کے عناصر میں بھی ارتقائی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ یعنی ہر رسول کے وقت کچھ تو گزشتہ رسول کے فراموش کردہ یا ضائع شدہ پیغامات (احکام) کی تجدید ہو جاتی تھی اور کچھ ان پر اضافہ بھی ہو جاتا تھا اور ترمیم و تنسیخ بھی۔ لیکن یہ ترمیم و تنسیخ ہمیشہ ارتقاء و عروج کی طرف لے جاتی تھی۔ منزل و مہبوط کی طرف نہیں جاتی تھی۔ ذیل کی آیتِ مقدسہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

مَا نُنسخُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِئُهَا نَاتٍ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا (۲/۱۰۶)

(ہمارا قانون یہ ہے کہ ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں۔

یعنی منسوخ شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس سے بہتر اور فراموش شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس جیسا حکم آجاتا تھا۔ چنانچہ قرآن میں کتب سابقہ میں الحاق و تحریف کی تصریحات متعدد مقامات پر مذکور ہیں وَ لَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ (ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ سو اس میں اختلاف ڈالے گئے) يُخْرِفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَ نَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ (وہ کلمات کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اور جو کچھ انہیں یاد دلایا گیا تھا اس میں سے ایک حصہ انہوں نے بھلا ہی دیا) فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ قَدْ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (۲/۷۹) (افسوس ہے ان پر جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہے)۔

اس قسم کے متعدد مقامات میں تحریف، الحاق، فراموشی، ادالتہ تغیر و تبدل کی تصریحات موجود ہیں۔ نیز اس حقیقت باہرہ پر خود نبی شاہد ہے۔ آج دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس دعوے کو بہ دلائل ثابت کر سکے کہ جس کتاب کو وہ صحیفہ آسمانی سمجھتے ہیں وہ حرفاً و فاداً ہی ہے جو ان کے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اس امر کے لئے بے شمار تاریخی شہادات موجود ہیں کہ ان کتابوں کے اصل نسخوں کا کچھ پتہ نہیں

چلتا بہر حال یہ سلسلہ رشد و ہدایت یونہی جاری رہتا تا آنکہ دنیا اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر سنِ رشید و بلوغ کو پہنچ گئی۔ اب مشیتِ ایزدی کے اندازے کے مطابق وہ وقت آگیا کہ ان تمام حقائق کو جو اس سے پیشتر حضراتِ انبیاء کرام کی وساطت سے دنیا میں بھیجے گئے تھے، اور یا تو بالکل ضائع ہو چکے تھے یا ان میں تحریف و الحاق ہو چکا تھا، ان کی اصلی شکل میں ایک جگہ جمع کیا جائے پھر ان تمام احکامات کی جگہ جو وقتی طور پر آئے تھے ایسے احکامات دے دیئے جائیں جو قیامت تک کے لئے انسانی ضروریات کے لئے مکتفی ہوں۔ اس طرح ان تمام حقائق و اصولات کو یکجا کر کے اسے محفوظ طریقے پر دنیا کو دے دیا گیا اور اسے قیامت تک کے لئے محفوظ رکھنے کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔ مجموعہ حقائق اور ضابطہ خداوندی کے اس (LATEST) اور آخری ایڈیشن کا نام قرآن ہے۔ اب ساری دنیا میں اعلان کر دیا گیا کہ ہماری نعمتیں مکمل ہو گئیں۔ ضابطہ حیاتِ انسانی کو آخری ترتیب دے دی گئی۔ تمام سابقہ سچائیاں اس کے اندر آگئیں۔ اب نجات و سعادت کے لئے صرف یہی ضابطہ قولِ فیصل ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ یہاں ہے، منسوخ ہے۔ اب دین بے توہیٰ اسلام ہے تو اسی کا نام ایمان ہے تو اس پر۔ اس کے باہر نہ کہیں دین ہے نہ اسلام، نہ شریعت ہے نہ منہاج۔ یہ اس خدا کا اعلان ہے جس نے ان پیغامات کو بھیجا جو اس سے پہلے نافذ العمل تھے۔ اسی نے ایک کی جگہ دوسرے کو بھیجا۔ اسی نے ان تمام کو سمٹا کر اس ایک میں جمع کر دیا، اور ان تمام کی جگہ اب صرف اسی ایک کو اپنا ضابطہ قوانین قرار دیا۔ اسی نے اس بات کا حکم دیا کہ اس حقیقت پر ایمان لاؤ کہ اس سے پیشتر جتنے انبیاء کرام تشریف لائے وہ اللہ کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے۔ جو پیغامات انہوں نے دیئے وہ بھی خدا کی طرف سے نازل شدہ تھے۔ نہ نبی ہونے کی حیثیت سے ان حضراتِ انبیاء کرام میں کوئی فرق ہے نہ پیغامات خداوندی ہونے کی جہت سے ان پیغامات میں کوئی اختلاف تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اسی خدا نے فرمادیا کہ اب اتباع و اطاعت صرف اسی مجموعہ قوانین کی ہوگی جس کا نام قرآن کریم ہے۔ یہ ہے الدین اور یہ ہے الاسلام۔ اسی کا ہر انسان سے مطالبہ ہے اور اسی سے نجات و سعادت وابستہ۔ یہ کہنا درست ہے کہ سچائیاں اپنے اپنے وقت میں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود تھیں۔ لیکن یہ کہنا سراسر خلاف حقیقت اور خلاف قرآن ہے کہ اصل دین ہر مذہب میں یکساں موجود ہے۔ (ترجمان القرآن، جلد ۱، صفحہ ۱۳۷)۔

ان امور کی تفصیلات کے لئے "معراجِ انانیت" کا پہلا باب دیکھئے۔

”موجود نہیں“ اور ”موجود ہے“ میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور یہی فرق ہے جس پر اس جدید نظریہ کے توڑ پھول ہونے کا انحصار ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے سے سارا معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔



**ایمان سے مفہوم** اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن کا بنیادی مطالبہ ایمان کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایمان سے مراد صرف ایمان باللہ (خدا پرستی) ہی ہے یا

اس سے زیادہ کچھ اور بھی۔ قرآن نے ایمان کے پانچ اجزاء بتائے ہیں:-

وَلَيْكُنَّ الْيَتْرَمَنْ اٰمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰئِكَةِ وَالْكِتٰبِ  
وَالنَّبِيِّنَ ۝ (۲/۱۷۷)

بلکہ نبی اس کی ہے جو اللہ آخرت کے دن ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان لاتے۔

انہی اجزائے ایمانیہ کا انکار کفر اور صریح کفر ہی ہے۔

وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللهِ وَ مَلٰئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ  
ضَلَّ ضَلٰلًاۢۙ بَعِيْدًا ۝ (۲/۱۳۶)

اور اللہ اس کے ملائکہ، اس کی کتب و رسل اور یوم آخر سے انکار کرے تو وہ بڑی دور

کی گمراہی میں جا پڑا۔

لیکن قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ بعض مقامات پر ان اجزاء کو بالتفصیل بیان کرتا ہے اور بعض مقامات پر اس کی تفصیل کی بجائے اجزائے ایمانیہ کا اجمالی تذکرہ کر دیتا ہے اور سیاق و سباق اور نفس موضوع کے اعتبار سے جس جزو پر زور دینے کی ضرورت ہوتی ہے صرف اسی کو بیان کرتا ہے مثلاً ایک جگہ صرف اللہ پر ایمان کا ذکر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ  
الْمَلٰئِكَةُ ۝ (۲۱/۳۰)

یقیناً جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے تو ان

پر فرشتے نازل ہوں گے۔

متعدد مقامات پر صرف اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کا ذکر ہے۔

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ <sup>بِحَقِّ</sup> (۲/۶۲)

جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لے آیا اور اس نے عملِ صالح کئے تو ان کا اجر ان کے اللہ کے ہاں ملے گا۔

کہیں خدا اور رسولوں پر ایمان کا ذکر ہے فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ (۳/۷۹) (پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ)۔ کہیں ان کے ساتھ ایمان بالکتاب کا بھی ذکر ہے۔ (فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا) (۲۴/۷۶) (پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا)۔

غرضیکہ مختلف مقامات پر مختلف اجزائے ایمان کا ذکر آتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مقصود نہیں کہ ایمان کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ کئے جاسکتے ہیں اور صرف ایک یا دو اجزاء پر ایمان لے آنا مومن ہونے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ مطالبہ تمام اجزائے ایمانیہ کا مشترک ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ یہ شق اول ہے۔



اب شق دوم کی طرف آئیے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ رسل، کتب پر ایمان ایمان باللہ سے مراد

لانے سے مفہوم کیا ہے؟ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان سے مقصود اطاعت ہے۔ اللہ پر ایمان لانے سے مفہوم یہ ہے کہ اس کے احکامات کا اتباع کیا جائے (أَطِيعُوا اللَّهَ)۔ محض اللہ کی ہستی کا اقرار کر لینا ایمان نہیں کہلا سکتا۔ دنیا میں چند دہریوں کے سوا، کون ہے جو اللہ کی ہستی کا قائل نہیں۔ نام میں اختلاف ہوگا، تعین صفات میں اختلاف ہوگا، لیکن اس کی ذات کا اقرار تو ہر جگہ ملے گا۔ سو اگر ایمان سے مراد فقط اللہ کی ذات کا اقرار ہوتا تو قرآن کریم ان لوگوں کو کافر کیوں کہتا جو خدا کی ہستی کا اقرار کرتے تھے۔ قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر اس کی تصریح موجود ہے کہ جب ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ بارش کون برساتا ہے؟ ہو ایں کون چلاتا ہے تو یہ جواب میں کہیں گے کہ اللہ! لیکن اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ حیرت ہے کہ اس اقرار کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لاتے (۶۳-۶۱/۲۹)۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کا

ان تمام تفصیلات کے ساتھ اقرار جو قرآن میں مذکور ہیں (۹۰-۲۳/۸۴)۔ اور اس کے ساتھ اس کے احکامات کی اطاعت۔ یہ ہے ایمان باللہ کا شرعی مفہوم، چونکہ خدا کے احکام حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے ملتے ہیں اور خدا کی وحی میں محفوظ ہوتے ہیں، اس لئے اللہ پر ایمان کے ساتھ اس کے انبیاء اور کتب پر ایمان کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ اس سے بھی یہی مفہوم ہے کہ احکاماتِ خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ خود قرآن کریم کے متعلق فرمایا:

إَتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ

(۴/۳)

جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء کی پیروی مت کرو۔

دین کا مدار ہی اطاعت پر ہے، خالص اور بے لوث خدا کی اطاعت۔ شرآن سے پیشتر کی کتابوں کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی۔ وہ کتابیں ضائع ہو گئیں، محرف ہو گئیں، یا ساقط العمل قرار پائیں۔ لہذا ان کی اطاعت بھی ختم ہو گئی۔ اور جب کتاب ہی اپنی اصلی شکل میں نافذ العمل نہ رہی تو اس کے لانے والے رسول کی رسالت کا زمانہ بھی ختم ہو گیا۔ ان سب کے بعد نبی آخر الزماں تشریف لائے، جن پر نازل شدہ کتاب (قرآن کریم) اپنی اصلی شکل میں قیامت تک کے لئے نافذ العمل ہے۔ اس لئے اب اللہ اور اس کے رسول پر ایمان (یعنی اطاعت) قرآن کریم کے اتباع میں مضمحل ہے۔ اب نبی اکرمؐ سے پیشتر کے رسولوں اور قرآن کریم سے پہلے کی کتابوں پر ایمان سے مفہوم یہ رہ گیا کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کے سچے پیغامبر اور ان کے پیغاماتِ خدا کے سچے احکام تھے، اب وہ تمام احکام قرآن کریم کے اندر آچکے ہیں۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ  
وَمُهَيِّئْنَا عَلَيْهِ (۵/۴۸)

اور ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو پہلی کتابوں (کے دعاوی کو اسچا کر کے دکھانے والی اور ان (سچائیوں) کی محافظ ہے۔

اس لئے ایک نئی کتاب آجانے کے بعد پرانی کتاب کی اطاعت کچھ معنی نہیں رکھتی، ضابطہ قوانین کے ہر نئے ایڈیشن میں جدید اضافوں کے علاوہ سابقہ ایڈیشن کی وہ تمام چیزیں بھی آجاتی ہیں جن کا نافذ العمل رکھت ضروری ہوتا ہے۔ لہذا زندہ قانون اسی آخری ایڈیشن کا سمجھا جاتا ہے۔ بنا بریں قرآن کریم کے بعد مختلف

اہل مذاہب (یا اہل کتاب) کا اپنے اپنے ہاں کی سچائیوں (یعنی اپنے اپنے مذہب کی کتابوں) پر کاربند ہو کر زندگی بسر کرنا اصولاً غلط ہے۔ اب "سچائیاں" ان کے ہاں کی اور ان کے علاوہ وہ تمام جن کی نوع انسانی کو ضرورت ہے، صرف قرآن کریم کے اندر ہیں۔ چونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ہر نئے رسول اور ہر نئی کتاب کے آنے پر اسی رسول اور اسی کتاب کا اتباع ضروری ہوتا تھا۔ اس لئے ہر رسول سے یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ اپنی امت سے کہہ دیں کہ جب رُشد و ہدایت آسمانی کے اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی آجائے، جس کے بعد کوئی اور رسول اور کوئی اور کتاب نہ آئے گی۔ تو تم سب کو اس آخری کڑی کا اتباع کرنا ہوگا۔ سورۃ اعراف کے انیسویں رکوع میں دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ دعا مانگتے ہیں کہ ہا رہا! اُو نے اس قوم (بنی اسرائیل) پر اپنی نوازشات کو یوں عام کیا ہے تو اس سلسلہ کو اسی طرح جاری رکھیو۔ ارشاد ہوتا ہے کہ بیشک ہماری رحمتیں بے پایاں اور ہر شے پر چھائی ہوئی ہیں، لیکن ہمارے نظامِ رشد و ہدایت کے مطابق یہ صرف ان کے حصہ میں آسکیں گی جو ہمارے آخری نبی اور آخری کتاب پر ایمان لائیں گے۔ یعنی ان کا اتباع کریں گے۔

فَسَا كُتِبَ عَلَيْهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا  
يُؤْمِنُونَ ۗ..... اُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۗ (۱۵۷-۱۵۶/۷)

وہ رحمت میں ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو قانونِ خداوندی کی نگہداشت کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے اور ہماری آیات (احکام) پر ایمان لائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو نبی اُمی کا اتباع کریں گے جسے وہ تورات و انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔ وہ انہیں نیک باتوں کا حکم دے گا۔ بُری باتوں سے منع کرے گا۔ پاکیزہ چیزیں ان کے لئے حلال کرے گا۔ ناپاک چیزیں حرام کرے گا۔ اور وہ طوق و سلاسل جو ان پر پڑے ہوئے ہوں گے ان کو ان سے الگ کرے گا۔ جو لوگ اس نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کی عترت کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو اس کے ساتھ نازل کیا جائے گا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔

غور کیجئے کہ فلاح و سعادت کے لئے قرآن کریم نے کیا شرط لازم قرار دی ہے؟ نبی اکرمؐ پر ایمان اور قرآن کریم کا اتباع۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ یہاں صرف حضرت موسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہے۔ دوسرے مقام پر تمام انبیائے کرام کے متعلق بھی ایسا ہی فرمایا ہے:-

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ

ثُمَّ جَاءَكُمْ..... وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَيْرِينَ ۝ (۸۰-۳/۸۴)

جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب و حکمت عطا فرمائی ہے۔ پھر جب تمہارے پاس وہ رسول آئے جو مصدق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے، تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی تائید کرنا۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا؟ اور اس پر میرا عہد قبول کیا؟ انہوں نے کہا، بے شک ہم اقرار کرتے ہیں۔ اس پر اللہ نے کہا کہ اس پر گواہ رہنا۔ اور دیکھو تمہارے ساتھ میں بھی اس پر گواہ ہوں۔ تو اب جو کوئی اس عہد و اقرار کے بعد اس سے روگردانی کرے گا تو یقیناً ایسے ہی لوگ ناسق ہیں۔

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈ نکالیں؟ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی ہے طوعاً و کرہاً سب اللہ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ اور بالآخر سب اسی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اے رسول تم کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ و اسمعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ اور یعقوبؑ کی اولاد پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور تمام انبیاء کو دیا گیا ان کے رب کی طرف سے۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ اور ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔ تو دیکھو جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کی طلب کرے گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور آخرت میں اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے۔

انبیاء سے عہد لینے سے مطلب یہ ہے کہ ان کی وساطت سے، ان کی امتوں سے عہد لیا گیا تھا۔ چنانچہ کتب سماوی کے جو پکے کچھے حصے کہیں آج بھی موجود ہیں، ان میں اس امر کی طرف اشارات ملتے ہیں کہ وہ انبیاء رشد و ہدایت کے اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی (یعنی نبی آخر الزمان) پر ایمان لانے کی تلقین کیا کرتے تھے، کیونکہ یہی اس نظام خداوندی کا تقاضا تھا۔ لہذا نبی اکرمؐ کے تشریف لے آنے کے بعد حضور پر ایمان کے بغیر نجات و سعادت کی کوئی راہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تفریق بین الرسل (رسولوں میں ایک دوسرے

میں فرق کرنے) کو پیکا کفر قرار دیتا ہے۔ (۲/۱۵۰)

شق دوم سے ظاہر ہے کہ:

(۱) رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے سے مفہوم صرف انہیں مان لینا نہیں بلکہ ان کی اطاعت کرنا ہے۔  
 (۲) تفریق بین الرسل کفر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام رسول اپنے اپنے وقت میں اللہ کی طرف سے پیغامِ رشد و ہدایت لاتے رہے اور اپنے اپنے وقت میں ان کی اطاعت فرض تھی۔  
 (۳) نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کے بھی یہی معنی ہیں کہ قرآن کی اطاعت کی جائے اور چونکہ حضورؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ اس لئے قرآن کی اطاعت قیامت تک کے لئے ہے اور تمام نوحِ انسانی کے لئے ہے۔

(۴) اب جو شخص 'خدا' اس کے رسولوں اور کتابوں پر اس طرح ایمان لائے جس طرح قرآن نے بتایا تو وہی ہدایت پر سمجھا جائے گا۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا ۗ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۗ (۲/۱۳۷)

پس اگر یہ لوگ اس پر اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ راہِ ہدایت پر ہوں گے اور اگر یہ اس سے پھر جائیں گے تو پھر یہ مخالفت کی راہ ہوگی۔



**ایمان بالرسالت سے مفہوم** | کہا جاتا ہے کہ جو لوگ تمام مذاہب کو یکساں قرار دیتے ہیں وہ

بین الرسل نہیں یعنی وہ حضورؐ کو بھی خدا کا سچا رسول مانتے ہیں۔ چنانچہ خود جناب آزاد نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے خدا کی توحید کے ساتھ حضورؐ کے درجہ رسالت و عبودیت کا اقرار بھی ضروری ہے۔ (صفحہ ۱۱۹)

یعنی جناب آزاد کے نزدیک

(۱) دوسرے انبیاء کرامؑ کی طرح نبی اکرمؐ پر ایمان لانا ضروری ہے۔

لیکن

(۲) نجات و سعادت کے لئے اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر کاربند ہونا ہی کافی ہے۔

یعنی ان کے نزدیک صورتِ حال یوں ہوتی کہ جس طرح مسلمان حضرت موسیٰ و عیسیٰ و دیگر انبیاءؑ کے کرام



علیہم السلام پر ایمان رکھتے تھے کہ وہ منجانب اللہ تھے، لیکن اتباع صرف اس کتاب کا کرتے ہیں جو محمد رسول اللہ کو ملی تھی، اسی طرح اگر عیسائی اور ژوسائی محمد رسول اللہ کو منجانب اللہ سمجھ لیں، لیکن اتباع اپنے ہی مذہب کا کرتے رہیں تو اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیاد اس اصل پر ہے کہ ان حضرات کے نزدیک محمد رسول پر ایمان سے مفہوم فقط اتنا ہے کہ آپ کے متعلق یہ اقرار کر لیا جائے کہ آپ منجانب اللہ رسول تھے اور بس۔ حالانکہ شق دوم میں، قرآن کریم کی نصوص صریحہ سے واضح کیا جا چکا ہے کہ جب انبیائے سابقہ (علیہم السلام) اور نبی اکرم (یا کتب سابقہ یا قرآن کریم) کے متعلق ایمان کا لفظ بولا جائے گا تو اس کے قرآنی مفہوم میں ایک بنیادی فرق ہوگا۔ یعنی ایک نئے نبی کے آنے کے بعد سابقہ نبی، یا نئی کتاب کے نازل ہونے کے بعد پہلی کتاب پر ایمان کے معنی فقط اتنے ہوں گے کہ وہ نبی یا وہ کتاب اپنے وقت میں منجانب اللہ تھی۔ اور اس نئے نبی اور نئی کتاب کے متعلق ایمان سے مفہوم یہ ہوگا کہ انہیں منجانب اللہ مانا جائے اور اس کی اطاعت بھی کی جائے جس طرح ایک جدید وائسرائے کے آنے کے بعد اس کے پیشرو کے متعلق فقط اتنا ماننا ضروری رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں بادشاہ کا جانشین تھا لیکن اطاعت اس جدید وائسرائے کے ذریعہ دیئے ہوئے احکام ہی کی لازم ہوگی۔ لہذا جب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم تمام انبیائے سابقہ پر ایمان لاتے ہیں تو اس سے مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہم اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ تمام حضرات اپنے اپنے وقت میں اللہ کے پیغامات کے حامل اور ہاذن اللہ مطاع تھے لیکن نبی آخر الزماں کی تشریف آوری کے بعد اطاعت فقط قرآن کریم کی باقی رہ گئی۔ اسی لئے اس کے اندر تمام سابقہ کتب کی سچائی جمع کر دی گئی ہیں اور اس پر جدید احکامات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ لہذا تقریباً بین الرسول سے صرف اتنا ہی مفہوم نہیں کہ اس امر کا زبانی اقرار لیا جائے کہ تمام انبیائے سابقہ (مع نبی اکرم) منجانب اللہ رسول تھے بلکہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمام انبیائے سابقہ کی رسالت کے اقرار کے ساتھ ساتھ اطاعت خدا کی آخری کتاب کی کی جائے اگر نبی اکرم کی رسالت کا زبانی اقرار ہو اور اطاعت اپنے اپنے مذہب کی کی جائے تو یہ قرآنی ایمان نہیں، کفر ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا

لَكُمْ ۗ وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ ۗ وَ

كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ (۴/۱۷۰)

اے نوعِ انسانی! یقیناً تمہاری طرف اللہ کا رسول حق کے ساتھ آگیا ہے۔ سو اگر تم ایمان لے آؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم کفر کرو تو تمہارے کفر سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب اللہ کے لئے ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ ایک شخص مانتا ہے کہ نبی اکرمؐ ایک راستباز اور حق گو انسان تھے۔ وہ خدا کی طرف سے سچے رسول تھے۔ لیکن اطاعت انہی امور کی کرتا ہے جو اس کے اسلاف سے اس کے پاس چلے آتے ہیں اور جن کی نسبت کسی سابقہ رسول کی طرف کی جاتی ہے۔ تو سوچئے کہ اس کے اس زبانی اقرار و ایمان سے مفہوم کیا ہے؟ یعنی وہ مانتا ہے کہ خدا کی طرف سے حضورؐ پر شرآن کریم نازل ہوا اور اس قرآن میں یہ لکھا ہے کہ ہدایت و سعادت قرآن کے اتباع ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، لیکن وہ اتباع و اطاعت کے لئے اور گوشے تلاش کرتا ہے، تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ حضورؐ کو اللہ کا آخری رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب نہیں مانتا۔ اگر وہ ایسا مانتا تو اس کی اطاعت کیوں نہ کرتا؟ جو لوگ اس قسم کی "رواداری" اور "وسعتِ نظر" کی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو خود فریبی میں مبتلا ہیں یا فریب دہی میں۔ اور جو مسلمان انہیں یہ یقین دلاتا ہے کہ از روئے قرآن اس بات کا بھی امکان ہے کہ رسول کو خدا کا سچا رسول مانتے ہوئے پیروی کسی اور مذہب کی کی جائے، تو وہ ان کے اس فریب پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ خود ہندوستان میں برہمن سماجیوں کا فرقہ موجود ہے جن کے عقائد یہ ہیں۔

## برہمن سماجی مسلک

(۱) خدائے واحد کی اور صرف اس کی پرستش کی جائے۔ خدا کا کوئی اوتار نہ مانا جائے۔ بت پرستی کی مخالفت کی جائے۔

(۲) صحیفہ فطرت کو مذہبی اعتقادات کا بنیادی اصول مانا جائے۔

(۳) اگرچہ اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد کسی خاص کتاب پر نہ رکھی جائے لیکن ہر الہامی کتاب کی صداقت و حقانیت کو تسلیم کیا جائے۔

(۴) ہر مذہب کے سچے اصولوں کو اعتقادی اصول مانا جائے۔

(۵) ظواہر و رسوم پر اعتقاد نہ رکھا جائے بلکہ مقصد اصلی قلبی صفائی کو قرار دیا جائے۔

(ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنس، اینڈ ایٹھکس)

رواداری اور "وسعتِ نظر" کے تمام گوشے اس تعلیم کے اندر سمٹے ہوئے ہیں، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا

ہے کہ اس کے باوجود برہم سماجی حضرات ہندو کے ہندو ہیں۔ یہیں ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی الہامی کتاب کی "حقانیت اور صداقت" کے اقرار کے معنی فقط اتنے ہی ہیں کہ زبان سے اقرار کر لیا جائے کہ وہ سچی کتاب ہے۔ ان کے اس ایمان میں اطاعت شامل نہیں ہے۔ قرآنی نقطہ خیال سے یہ حضرات ایک کھلی ہوئی غلطی پر ہیں مگر چونکہ ان کے سامنے قرآن کریم نہیں اس لئے ان کا یہ عقیدہ چنداں درخور اعتنا نہیں لیکن جو شخص قرآن کریم کو اپنے سامنے رکھنے کا مدعی ہو، اگر وہ بھی اس عقیدہ کا ہم نوا ہو جائے تو اس کے متعلق کیا کہا جائے؟ وہ قرآن جو کھلے کھلے الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ  
مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ فَا مَنُوا  
بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَتِهِ وَاتَّبِعُوهُ  
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ٥ (٢/١٥٨)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اے نوعِ انسانی! میں تم تمام کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی مارتا وہی جلاتا ہے پس ایمان لاؤ تم اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر جو خود اللہ پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے اور اس کا اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

لہذا کوئی شخص رسولِ اکرم کو خدا کا سچا رسول اور قرآن کریم کو سچی کتاب ماننے کے دعوے میں سچا نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ وہ قرآن کا اتباع نہ کرے۔ اور یہ خطاب تمام نوعِ انسانی سے ہے کسی خاص فرقہ یا گروہ سے نہیں۔



اب شق سوم کی طرف آئیے یعنی کیا اتباع میں احکامِ کتاب کا اتباع بھی ضروری ہے یا محض اپنے اپنے انداز پر "خدا پرستی اور نیک عملی" ہی نجات و سعادت کے لئے کافی ہے۔ اس باب میں جناب آزاد کے نظریہ پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈال لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں :-

(د) اس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک

ہی طرح ہر سب کو دیا گیا ہے البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جاسکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(۵) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں..... ترجمان القرآن (صفحہ ۱۲۳)

ان اقتباسات کے ساتھ سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۷ کا حسب ذیل تشریحی نوٹ بھی قابل ملاحظہ ہے۔  
(۵) دین حق کی اس اصل عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ یہ نہیں ہے کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے بلکہ وہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔

(صفحہ ۲۹ تفصیل اصل کتاب میں دیکھئے)

یہی اقتباسات پنڈت سندر لال جی نے اپنے خطبہ صدارت میں پیش کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ چونکہ خدا پرستی اور نیک عملی کی تلقین تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے اور یہی اصل دین ہے اس لئے ایک ہندو جو اپنے طور پر یقہ پر اپنے مذہب کی شریعت کا پابند ہے اسی طرح نجات و سعادت کا مستحق ہے جیسے ایک مسلمان قرآنی شریعت کے اتباع سے نجات کا مستحق۔

قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ قرآن کی رو سے شرع و منہاج کو کتنی اہمیت حاصل ہے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جناب آزاد نے اپنے اس نظریہ کی رو سے اسلام کی جڑ پر ایسی ضرب کاری لگائی ہے کہ اس نظریہ کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ شجر مقدس پورے کا پورا اگھڑ کر باہر آجاتا ہے۔ قرآن کی رو سے نبی اکرم سے پہلے جتنے انبیاء کرام تشریف لائے وہ ایک نہ ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔ اور ایک خاص وقت کے لئے ان کا پیغام نافذ العمل رہتا۔ یعنی ان کی رسالت کا دائرہ زمان و مکان کی حدود سے گھرا ہوا تھا اس لئے ان کی رسالت

سے جو احکامات نافذ ہوتے وہ اس خاص قوم کے حالات کے پیش نظر دیتے جاتے جن کی طرف وہ مبعوث ہوتے۔ نبی اکرم کی تشریف آوری سے یہ نظام

قرآن عالمگیر ہے

بالکل بدل گیا۔ حضورؐ کی بعثت کسی خاص قوم، ملک، قبیلہ، گروہ یا کسی خاص وقت کے لئے نہیں، بلکہ آپؐ کا پیغام عالمگیر اور آپؐ کی مخاطب تمام نوع انسانی ہے۔ سارا قرآن اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے۔ حضورؐ کی رسالت کا دائرہ زمان اور مکان کے حدود سے محصور نہیں، بلکہ دنیا کے ہر ملک میں، ہر زمانہ میں قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لئے حضورؐ کی رسالت یکساں ہے۔ اس لئے جو تشریحی احکام قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ کسی خاص قوم کے حالات خاص کو سامنے رکھ کر وضع نہیں کئے گئے، بلکہ وہ عالمگیر ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کریم کے تشریحی احکام صرف نبی اکرمؐ کے زمانہ کے اہل عرب کے حالات و مقتضیات کے مطابق نافذ ہوئے تھے، تو اسلام کی عالمگیریت کا دعویٰ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اسلام کے احکامات نہ ہر زمانہ میں نافذاً عمل ہو سکتے ہیں نہ ہر قوم پر ان کی پابندی لازم قرار دی جاسکتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے تشریحی احکام کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ ہر قوم اور قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں، اسلام کے دعوائے آفاقیت (عالمگیریت) کی کھلی ہوئی تردید ہے۔ اسلام نوع انسانی کا دین ہے اور اس کے احکام و اعمال کسی خاص قوم اور خاص عہد کی حالت کو سامنے رکھ کر اختیار نہیں کئے گئے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ مذہب کے ظواہر و رسوم کو میکاتی طریق سے ادا کر لینے کا نام اتباع احکام نہیں۔ یہ ظواہر و رسوم جسم کی مثل ہیں جس میں رُوح کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کے احکام صرف حضورؐ کے زمانہ کے حالات زندگی کے پیش نظر اختیار کئے گئے تھے اور آج انہیں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ اور نجات و سعادت میں انہیں کوئی دخل نہیں۔ کوئی جاہل ہونا تو ہم اسے ہم سمجھتے بھی! ہم حیران ہیں کہ جناب آزاد جیسے سمجھدار انسان کو کیسے سمجھائیں کہ اسلام ایک نظام کا نام ہے، اور نظام کا ہر جزو، کل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ احکام و شرائط اس نظام اسلامی کے لاینفک اجزاء ہیں اور دنیا کے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا تغیر تبدیل کر سکے، یا اسلام کے دعوے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جائز قرار دے کہ "نجات و سعادت" ان اعمال و احکام کے علاوہ اور طرح سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ نجات و سعادت "اسلامی نظام کا فطری نتیجہ ہے۔ اس نظام کے جزئیات کو بدل دیجئے، یہ نتیجہ خود بخود بدل جائے گا۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام کے سوا کوئی اور دین قابل قبول نہیں تو اس سے مقصود اسلامی نظام ہے نہ کہ "خدا پرستی اور نیک عملی" کے مبہم اور غیر متعین الفاظ۔ قرآن کریم کھولنے اور دیکھنے،

کہ اس میں ان احکام کی پابندیوں کو کتنی اہمیت دی گئی ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اہل کتاب خدا کو بھی  
**اشباعِ وحی** مانتے تھے۔ اور اپنے خیال کے مطابق نیک اعمال بھی کرتے تھے۔ بایں ہمہ مسلمانوں  
 کو (خاص حالات کے ماتحت) جس طرح کفار اور مشرکین سے قتال کا حکم دیا  
 گیا اسی طرح اہل کتاب سے بھی قتال کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کے وقت اہل کتاب کے خلاف جو فوجی جرم (جارج سٹش)  
 عائد کی گئی ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ  
 مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ  
 أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (۹/۲۹)

اہل کتاب جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا  
 اور رسول نے حرام بتایا ہے اور نہ سچے دین کو ہی قبول کرتے ہیں ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ گت  
 ہو کر جزیہ دینا قبول کر لیں۔

اس آیتِ جلیلہ سے حسب ذیل امور کی تصریح ہو گئی۔

(۱) اہل کتاب ہر چند خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی تھے (اور ہیں) لیکن قرآن کریم ان کے اس ایمان کو  
 ایمان ہی قرار نہیں دیتا۔ اس لئے کہ جیسا کہ شق اول میں بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم کی رو سے ایمان وہی ایمان  
 ہے جو اس طریق پر لایا جائے جو قرآن نے بتایا ہے۔

(۲) اہل کتاب کا اس طرح پر ایمان لانے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرام اور حلال میں ان پابندیوں کو ملحوظ نہیں  
 رکھتے جو قرآن کریم نے عاید کی ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اسلام صرف "خدا پرستی اور نیک عملی" (بزرگم خویش) کا  
 نام نہیں۔ بلکہ قرآن کریم کے تشریحی احکام کی پابندی بھی ضروری ہے۔

(۳) تیسرے ٹکڑے میں اس امر کی وضاحت بیان فرمادی کہ ان لوگوں کا اپنے اپنے طریقہ پر خدا پرست  
 بن جانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ان کے لئے دین الحق قبول کرنا نہایت ضروری ہے۔ یعنی اسلام میں داخل ہونا  
 لازمی شرط ہے۔ دین الحق اس مذہب کا نام ہے جو نبی اکرم کی وساطت سے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔  
 قرآن میں جہاں جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اسی دین کے لئے استعمال ہوئے ہیں (ملاحظہ ہو

مندرجہ صد آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔ لیکن چونکہ یہ حقیقت جناب آزاد کے نظریہ کے خلاف جاتی تھی اس لئے انہوں نے اپنے ترجمہ میں ایسا اضافہ فرمایا ہے جس سے اس کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے۔ وہ اس آیت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:-

اہل کتاب میں سے جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ نہ تو خدا پر (سچا) ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرایا ہے اور نہ سچے دین پر عمل پیرا ہیں..... (ترجمان القرآن، صفحہ ۸۲)

ذرا غور فرمائیے۔ ترجمہ میں چار لفظوں کے اضافے نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی؟ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ "یہ لوگ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنہیں اللہ اور رسول نے حرام ٹھہرایا ہے" یعنی قرآن کریم میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یہ لوگ انہیں حرام نہیں سمجھتے۔ لیکن جناب آزاد نے یہ کہہ کر کہ "جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرایا ہے" یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن صرف یہ چاہتا ہے کہ یہ لوگ ان چیزوں کو حرام سمجھیں جو ان کی کتاب میں حرام ٹھہرائی گئی ہیں۔ اندازہ فرمائیے۔ قرآن کریم پر یہ کتنا بڑا اضافہ ہے اور اس اضافہ کی کتنی بڑی جرأت؟ یہ ہے تفسیر کا وہ طریقہ جس سے یہ حضرات اپنے نظریوں کو قرآنی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور نہیں ڈرتے کہ یہ جرأت کس قدر بے باک ہے؟



گزشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) قرآن کریم کی رو سے اجزائے ایمانیہ پانچ ہیں۔ قرآن میں کسی جگہ 'خواہ ان میں سے کسی ایک کا ذکر ہو یا ایک سے زیادہ کا' مقصود اس سے پانچوں اجزاء ہیں۔ ان میں سے ایک کا انکار بھی کفر ہے۔

(۲) ان پانچ اجزائے ایمانیہ میں نبی اکرم کی رسالت اور قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان بھی جزو لاینفک ہے۔

(۳) ایمان سے مفہوم صرف اقرار کر لینا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اطاعت بھی ہے۔

(۴) ہر رسول اور ہر کتاب کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی اور نبی اکرم کی بعثت کے بعد اطاعت خدا کی آخری کتاب قرآن کریم کی ہوگی نہ کہ پہلی کتابوں کی۔

(۵) قرآن کے تشریحی احکام نظام اسلامی کا ضروری جزو ہیں اور ان کی اطاعت لازمی ہے۔ ان تصریحات کو سامنے رکھنے کے بعد اب اس آیت کا مطلب سمجھئے جو اس باب میں اس جدید نظریہ (یکسانیت مذاہب) کے مؤیدین کا عروۃ الوثقی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِيَّانَ مَنَّ آمَنَ  
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ  
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۶۲)

تحقیق جو لوگ ایمان والے ہیں اور یہود و نصاریٰ اور صابین اور جو شخص بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور عمل اچھے کرے ان کا اجر ان کے اللہ کے پاس ہے۔ اور ان کو کسی قسم کا خوف و حزن نہیں۔

**ایک اہم آیت** | اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور صابین سے صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا مطالبہ ہے۔ قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں۔ جو کچھ ہم اس وقت لکھ چکے ہیں اس کے پیش نظر اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے میں دقت نہیں ہوگی۔ پہلی چیز تو یہ کہ ایمان سے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان مقصود نہیں؛ بلکہ ان کے اندر پانچوں اجزائے ایمانیہ شامل ہیں۔ قرآن شریف میں جہاں بھی ایمان کا تقاضا ہے مکمل ایمان کا ہے اور اس مکمل ایمان کے متعلق تصریحاً ارشاد موجود ہے کہ

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا

اگر یہ لوگ ایسا ایمان لائیں جیسا تم لائے ہو پھر یہ ہدایت پر سمجھے جائیں گے۔

دوسرے یہ کہ اگر اس سے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان ہی کا مطالبہ ہو تو آیت میں یہود و نصاریٰ کے علاوہ خود مسلمانوں کا بھی ذکر ہے۔ تو کیا مسلمانوں سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ وہ فقط اللہ اور آخرت پر ایمان رکھیں؟ اگر ان سے بھی یہی مطالبہ ہے، تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن پر ایمان کا مطالبہ کن سے ہوگا۔

آیت کا مطلب واضح ہے۔ اسلام سے پہلے لوگوں نے مذہب کو (نسلوں اور قوموں) کے اندر مقید کر رکھا تھا۔ تو ریت قوم بنی اسرائیل (یہود) کے لئے۔ مذہب عیسوی بھی انہی کے لئے کیونکہ انجیل میں یہ قول حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے آیا ہوں۔



بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالی جاسکتی۔ ہندوؤں کے ہاں انسانوں کی تقسیم ہی پیدائشی ورنوں کی رُو سے ہوتی ہے اور ورنوں کی کیفیت یہ ہے کہ نہ نچلے ورن کا ہندو اوپر کے ورن میں جاسکتا ہے اور نہ ہی خدا کے حرمِ قدس میں اس کے لئے باریابی کی کوئی راہ کھلی ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی مذہبی عقائد میں داخل ہو چکا تھا کہ ایک شخص محض یہودی کے ہاں پیدا ہو جانے سے ابنِ ارشد (خدا کی اولاد میں) داخل ہو کر نجات کا مستحق ہو جاتا ہے۔ عیسائی کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کی نجات کے ذمہ دار حضرت مسیح علیہ السلام بن جاتے ہیں۔ یعنی مذاہبِ عالم میں یہ عقیدہ موجود تھا کہ :-

- (۱) نجات و سعادت محض ایک خاص فرقہ کے گھر میں پیدا ہو جانے سے مل جاتی ہے۔ اور
- (۲) اس فرقہ کے باہر کا انسان چونکہ اس فرقہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ (کیونکہ فرقہ میں داخلہ تو صرف پیدائش کی رُو سے ہوتا ہے) اس لئے اس پر نجات کے سبب دروازے بند ہیں (واضح ہے کہ ہندوؤں اور یہودیوں میں تبلیغ کا تصور ہی نہیں اور عیسائیوں کے ہاں بھی تبلیغ بعد کی چیز ہے) قرآن نے اگر ان نظریات کی تردید کی اور اعلان کر دیا کہ نجات کو پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی کسی کے گھر میں پیدا ہو (یہودی، نصرانی، صائبی وغیرہ) وہ ایمان لانے سے اسلام کے دائرہ میں کھلے بندوں داخل ہو سکتا ہے۔ اور اعمالِ صالحہ کرنے سے جنت کا اہل بن جاتا ہے۔ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۶۲) باقی رہے مسلمان سوا نہیں بھی اس زعمِ باطل میں نہیں رہنا چاہیے کہ وہ محض اس لئے کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں نجات کے حقدار بن جائیں گے۔ انہیں بھی اپنے آپ کو صاحبِ ایمان ثابت کر کے اعمالِ صالحہ کے ذریعہ جنت کا مستحق بنانا ہو گا۔ خود مسلمانوں سے ایمان کا مطالبہ صرف اسی ایک مقام پر نہیں بلکہ اور آیات میں بھی ہے۔ مثلاً سورہ نسا میں ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ  
عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۗ (۴/۱۳۶)

اے مسلمانو! (ایمان والو!) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس کے رسول پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر جو اس سے پیشتر نازل کی گئیں۔

سورہ توبہ میں ایمان کی اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا ایمان

محض زبان تک تھا۔ نہ دل کی گہرائیوں میں اس کا سرچشمہ تھا اور نہ اعمالِ حیات اس کے مصدق۔ (۱) انہیں منافق کہا گیا ہے۔ زندگی کے باقی شعبوں میں تو خیر پھر بھی یہ نقاب پوشانہ روش کسی نہ کسی طرح نبھ جاتی تھی لیکن میدانِ جہادِ ایمان کی بہت بڑی کسوٹی تھی۔ اس موقع پر یہ لوگ ادھر ادھر کی بہانہ تراشیوں سے نچ کر نکل جانے کی کوششیں کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ "اصطلاحی" مسلمان تھے۔ ان کا ایمان کا اقرار زبانی ہی زبانی تھا۔ ان کے مقابلے میں وہ بچے مسلمان تھے جو مشکل سے مشکل مقام پر اپنے ایمان کا زندہ ثبوت پیش کرتے تھے۔ ان ہر دو فریق کے متعلق فرمایا:

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا  
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ ۙ بِالْمُتَّقِينَ ۝ إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ  
الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ  
فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ۝ (۹/۲۴-۲۵)

جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال و جان سے جہاد کرنے کے بارے میں تم سے اجازت نہ مانگیں گے اور اللہ متقیوں کو جانتا ہے (جہاد میں نہ جانے کے لئے) صرف وہی لوگ تم سے اجازت مانگیں گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ سو وہ اپنے شک میں حیران و متردد ہیں۔

اس آیتِ مقدسہ سے دو تین باتیں واضح طور سے سامنے آئیں۔

(۱) ظاہر ہے کہ وہ اہل ایمان (سچے مسلمان) جو جہاد میں مال و جان سے شریک ہوتے تھے اللہ اور آخرت کے علاوہ ملائکہ، کتب اور رسل پر بھی ایمان رکھتے تھے لیکن یہاں صرف ان کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہی کا ذکر کافی سمجھا گیا ہے۔

(۲) منافقین وہ لوگ تھے جو زبان سے تمام اجزائے ایمانیہ کا اقرار کرتے تھے۔ مسلمان کہلاتے تھے۔ انہی میں رہتے رہتے تھے لیکن قرآن ان کے ایمان کو ایمان نہیں تسلیم کرتا اور واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

(۳) لہذا جب مسلمانوں سے کہا جائے گا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لاؤ اور نیک اعمال کرو تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا پیدا نشی مسلمان ہونا یا محض زبان سے ایمان کا اقرار کر لینا کافی نہیں۔ ایمان دل سے ہونا چاہیے

اور اعمالِ زندگی سے اس کی تصدیق ہونی چاہیے۔ یہ ہیں سچے مومن۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا  
وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ  
الصَّادِقُونَ ۝ (۴۹/۱۵)

مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور پھر (اس ایمان میں)  
انہیں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جان سے جہاد  
کریں۔ یہ لوگ ہیں سچے (مسلمان)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لئے "نجات و سعادت" حاصل کرنے کے لئے ایسی کڑی  
شرطیں ہیں کہ وہ اس انداز کا ایمان لائے جیسا قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔ پھر زندگی کے ہر ہر قدم پر اسی  
بارگاہ سے فیصلہ طلب کرے اور ان فیصلوں کو بطیب خاطر منظور کرتا چلا جائے۔ حرام اور حلال کی پابندیاں  
اپنے اوپر عاید کرے اور ان سب کے بعد مال اور جان جیسی عزیز ترین متاع کو ہر وقت ہمتی پر رکھے۔ اللہ کی  
راہ میں قربان کرنے پر آمادہ ہو۔ یعنی اپنے آپ کو ہر وقت شہادت گاہ میں تصور کرے۔ تب جا کر کہیں "نجات و  
سعادت" کا متوقع ہو۔ اس کے برعکس ایک غیر مسلم (مثلاً ہندو) کے لئے فقط اتنا ضروری ہے کہ صبح اٹھ کر  
اپنے ہاں کے مروجہ طریقہ کے مطابق "خدا کی بھگتی کرے اور کبھی کبھار "دان" (خیرات) کر دے۔ مثلاً چڑیوں کو دان  
ڈال دیا۔ سانڈ کے لئے چارہ خرید دیا۔ کیڑوں مکوڑوں کے استھانوں پر آٹا ڈال دیا۔ اس سے آگے بڑھے تو  
کہیں پیادہ بنوا دیا اور استطاعت ہوئی تو کنواں کھدوا دیا۔ سرائے یا ہسپتال بنوا دیا۔ دان (خیرات)  
کی کچھ ایسی ہی مدات ہیں۔ اس کے بعد اپنے اوپر نہ کوئی خاص پابندی عائد کرنے کی ضرورت نہ اسلامی احکام  
کی کمٹن منازل طے کرنے کی حاجت۔ نہ ہجرت کی صعوبات اٹھانا ضروری نہ خدا کی راہ میں سرکٹو دینے کا  
سوال درمیش۔ (بلکہ وہاں تو جہاد کا تصور ہی گناہ ہے کہ یہ چیز اہمسا میں داخل ہے)۔ یہی نہیں بلکہ جہاں  
ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف اس نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے جو خدا کا متعین فرمودہ  
ہے اس غیر مسلم کو کھلی اجازت ہے کہ وہ جو نسا نظام اپنے لئے چاہے وضع کرے اور جس نظام کے ماتحت  
چاہے زندگی بسر کرے وہاں انسانی نظام اور خدائی نظام کا سوال ہی کچھ نہیں۔ اسے بس اتنا ہی کچھ  
کرنے کی ضرورت ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس سے وہ نجات کا مستحق قرار پا جائے گا۔ اب

سوچئے کہ جب انسانی زندگی کی تمام کدو کاوش کا انتہائی بڑھاپا حصولِ نجات اور یہ مقصد ایک طرف اس قدر جاں گسل اور صبرِ آزما مراحل طے کرنے کے بعد حاصل ہو اور دوسری طرف اتنی آسانی سے تو وہ کون سا "صحیح العقل" انسان ہو گا جو اس قدر آسان طریقہ کو چھوڑ کر ایسا کٹھن طریق زندگی اختیار کرے جس میں ایک ایک سانس پر قیامت کا سامنا ہو۔ اگر نجات اسی طرح سے حاصل ہو جاتی تھی تو پھر قرآن کریم میں اس قدر تفصیلی ہدایات اور احکامات کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں فقط اتنا لکھ دینا کافی تھا کہ لوگو! خدا کی ہستی کو مانو اور اپنے اپنے طور پر طریقہ پر نیکی کے کام کرتے رہو تمہارے لئے نجات یقینی ہے۔ اگر "رواداری اور وسعتِ نظر" کی "صلحِ کل" روش اختیار کر لی جاتی تو نہ کہیں سے مخالفت کی آواز اٹھتی اور نہ کوئی برسہا برسہا ہوتا۔ نہ حضور اور آپ کے قبیعین کو اس قدر تکالیف کا سامنا ہوتا۔ نہ مکہ چھوڑنا پڑتا، نہ مدنی زندگی میں اس قدر غم و غوات و ساریا کی ضرورت پڑتی۔ ساری دنیا خوش ہو جاتی اور انسانوں کو نجات کا طریقہ بھی نہایت آسان مل جاتا۔ اور پھر اس کے بعد آج تک جو چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی کی مسلسل ستیزہ کاری چلی آتی ہے، اس کا بھی کہیں وجود نہ ہوتا۔ ساری دنیا (سوائے چند دہریوں کے جو خدا کی ہستی کے منکر ہیں) مومن ہوتی اور کفر و اسلام اور حق و باطل کا کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہوتا۔



**خدا پرستی اور نیک عملی** | "خدا پرستی اور نیک عملی" کے مبہم الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے سوال یہ ہے کہ خدا پرستی کسے کہتے ہیں اور نیک عملی کیا ہے؟ کیا یہی کہ جس انداز پر کسی کا جی چاہے خدا کی پوجا (پرستش) کر لے اور جس کام کو وہ نیک سمجھتا ہے اسے اختیار اور جسے برا قرار دیتا ہے اس سے اجتناب کر لے؟

حقیقت یہ ہے کہ بعض الفاظ (یا مذہبی اصطلاحات) مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں لیکن وہ اس اسلامی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتے جس کے لئے وہ شروع میں اختیار کئے گئے تھے۔ یہی نہیں کہ وہ الفاظ اسلامی تعلیم کے صحیح ترجمان نہیں بلکہ بعض اوقات ان سے ایک ایسا مفہوم مترشح ہوتا ہے جو روحِ اسلام کے یکسر منافی ہوتا ہے۔ انہی الفاظ میں "پرستش" کا لفظ بھی داخل ہے۔ دیگر ادیان میں خدا اور بندے کا پرستش اور پوجا کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں اس کے لئے "عبودیت" کا لفظ ہے جو پرستش سے الگ معنی رکھتا ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کر دینے سے وہ تمام غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی

میں جو یکسانیت مذاہب تک منجر ہوتی ہیں۔

اپنے سے کسی بڑی ہستی کا تصور انسان کے اندر ابتدا سے چلا آتا ہے۔ جب انسانیت اپنے عہدِ طفولیت میں تھی تو انسانوں کی زندگی انفرادی تھی۔ جنگلوں اور فاروں میں رہائش۔ پھل اور شکار ذرائع معاش۔ کسی ایک انسان کو دوسرے سے علاقہ نہیں۔ اس زندگی میں "خدا" کے ساتھ اتنا ہی تعلق سمجھا جاتا تھا کہ مصیبت کے وقت اس کے سامنے جھک گئے۔ خوشی کے وقت اس کے حضور ناچنے کو دینے سے جشن شادمانی منعقد کر دیا۔ خدا، دیوتاؤں کے لباس میں تھا یا بتوں کی شکل میں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ ان دیوتاؤں کو خوش رکھیں۔ اس کوشش کے مظاہر کا نام پرستش یا پوجا پاٹ تھا۔ اس دوران میں جب کبھی وحی آسمانی کی روشنی آگئی۔ اس نے انسانی تصورات کے ان غلط پردوں کو اٹھا کر خدا کا صحیح تصور پیش کر دیا۔ جب وہ روشنی گم ہو گئی تو پھر وہی تاریکی چھا گئی۔ رفتہ رفتہ انسانیت نے کچھ اور اعلیٰ منازل طے کئے اور انسانوں نے بل جل کر رہنے کی طرح ڈالی۔ اب انفرادیت سے قبائل کی طرف رجحان ہوا۔ انسانوں کا ایک دوسرے سے تعاون و تناصر کا تعلق قائم ہوا۔ اشتراکِ عمل کی صورت میں جلوہ پیرا ہوئیں۔ اس سے باہمی حقوق اور ان کی نگہداشت کا سوال پیدا ہوا۔ اور ان کے صحیح تعین کے لئے خدا کی طرف سے احکام بھی آنے شروع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر انسانی مقتضیات ہوتے تھے اسی اندازہ سے احکام ملتے تھے۔ زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ ان مقتضیات میں ترقی اور تبدیلی ہوتی گئی اور ان کے ساتھ ساتھ سلسلہ احکاماتِ الہیہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ان احکام کی رُو سے انسان اور خدا کے درمیان تابع اور متبوع، حاکم اور محکوم کا تعلق قائم ہوا۔ چونکہ آسمانی ہدایت زیادہ عرصہ تک انسانوں کے پاس محفوظ شکل میں نہیں رہتی تھی اس لئے احکامات کی روح مسخ ہو جاتی، خدا کے متعلق حاکم اور فرمانبردار کا تصور کبھی گم ہو جاتا اور پھر وہی پرستش کا ابتدائی تصور غالب آ جاتا۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ انسانوں نے انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کی زندگی اختیار کر لی اور اس کے بعد ان کی تمام جدوجہد کا انتہائی اجتماعیت کی تشکیل قرار پا گیا۔ اب وقت تھا کہ انہیں ایک ضابطہ حیات دے دیا جاتا جس میں نظامِ اجتماعیت کے لئے مکمل ترین صورتوں کے لئے آئین و قوانین موجود ہوں اس ضابطہ نے یہ بتایا کہ نظامِ اجتماعیت کے لئے جس قدر آئین و ضوابط ذہنِ انسانی کی پیداوار ہوں گے وہ انسانیت کی نشوونما کے راستہ میں حائل ہوں گے۔ انسانیت کی نشوونما صرف اس ضابطہ حیات کی رُو سے ہو سکتی ہے جو تشکیلِ اجتماعیت کے لئے خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے اور جسے قرآنِ کریم کہتے

ہیں۔ اس نے بتایا کہ اب خدا پر ایمان رکھنے والے ہر انسان کا فریضہ ہے کہ کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کے وضع کردہ نظامہائے زندگی کی جگہ اس نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد کرے جو خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ یعنی دنیا میں انسانوں کی جگہ 'خدا کی بادشاہت قائم ہو' اور اس طرح انسان اللہ کے سوا کسی اور کا عباد نہ بنے۔ یہ ہے خدا اور بندے کے درمیان صحیح تعلق۔ یعنی عباد اور معبود، محکوم اور حاکم کا تعلق۔ عبودیت سے مراد یہ ہے کہ اپنی تمام قوتوں کو نظامِ خداوندی کے تقاضوں کے مطابق صرف کیا جائے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ پرستش کا لفظ خدا اور بندے کے تعلق کے شرآئی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ صرف ادا ہی نہیں کرتا بلکہ ایک الگ مفہوم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ مفہوم جو انانیت کے عہد طفولیت کا پیدا کردہ اور اس کی انفرادی زندگی کے دور کی یادگار ہے۔ اس معنی میں "خدا پرستی" تو ہر مذہب میں ایک جیسی ہو سکتی ہے لیکن خدا کی عبودیت صرف اسلام میں داخل ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے اس لئے جس ضابطہ خداوندی کی رُو سے خدا کی حکومت اختیار کی جا سکتی ہے وہ آج قرآنِ کریم کے باہر اور کہیں نہیں۔ اسلام کا مطالبہ نظامِ خداوندی قائم کرنے کا ہے۔ خدا پرستی (یعنی خدا کی پوجا یا پرستش کرنے کا نہیں) ایمان کا صحیح مفہوم | لہذا ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں خدا کے علاوہ کسی اور کی حکومت کو جائز نہیں سمجھتا۔ باقی چاروں اجزائے ایمان اسی اصل

کی شاخیں ہیں یعنی :-

- |   |   |
|---|---|
| [ | (۱) خدا کی حکومت اختیار کرنے کا اقرار   |
| { | (۲) یہ حکومت اس ضابطہ کی رُو سے اختیار کی جائے گی جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور جس کی آخری شکل قرآنِ کریم ہے۔            |
| } | (۳، ۴) یہ ضوابط ملائکہ کے ذریعہ حضراتِ انبیائے کرام پر نازل ہوتے رہے۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ |
| { | (۵) اس طرز زندگی کا فطری نتیجہ دنیا کی سرفرازی اور آخرت کی سربلندی ہے اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔                          |

اللہ پر ایمان

کتابوں

پر ایمان

ملائکہ اور

رسولوں پر

ایمان

آخرت پر

ایمان

یہ ہے شرابی ایمان سے مفہوم۔ ان اجزائے ایمانیہ میں سے سب کا ذکر ہو یا کسی ایک جزو کا مقصد پورے کے پورے نظام سے ہے۔

اب رہی ”نیک عملی“ سو روح اسلام سے واقف ہو جانے کے بعد اس کی تعریف بھی کچھ مشکل نہیں رہتی۔ ہر وہ قدم جو دنیا میں نظامِ خداوندی قائم کرنے کے لئے اٹھے نیک ہے اور جو اس کے خلاف ہو بُرا ہے۔ انسان اپنے ابتدائی عہد میں جس طرح ایمان باندھے سے مفہوم صرف خدا کی پرستش (پوجا) لیتا تھا اسی طرح اس نیکی کا تصور بھی بہت ابتدائی تھا۔ اس زمانے میں زندگی انفرادی تھی اس لئے نیکی اور بدی بھی انفرادی اعمال کا نام تھا۔ مثلاً اگر وہ یہ دیکھتا کہ ان میں کا ایک انسان بیماروں سے ہمدردی کرتا ہے، ضعیفوں کی مدد کرتا ہے، جانوروں پر شفقت کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ تو وہ ایسے انسان کو نیک آدمی خیال کرتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انفرادی زندگی میں نیکیاں اسی قسم کی ہو سکتی ہیں۔ لیکن اجتماعی زندگی میں نیکی اور بدی کا معیار اس سے کہیں بلند ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کسی قوم کی تہذیب تمدن کے اساس و مبنائی کیا ہیں؟ وہ انسانوں کے لئے کس قسم کا نظامِ زندگی تجویز کرتی ہے؟ دنیا پر اس تہذیب و نظام کے اثرات کیا ہیں؟ اگر اس کے اثرات انسانیت کش ہیں تو اس قوم کے افراد کی ذاتی ”نیکیاں“ (مثل خیرات وغیرہ) انسانیت کی میزان میں نیکیاں نہیں قرار پاسکتیں، جب تک وہ لوگ اس نظام کے ممد و معاون اور دست و بازو رہیں گے ان کا کوئی عمل عملِ صالح نہیں کہلا سکے گا۔ کسی کی رگ جان پر جو نگیں لگاوینا کہ وہ اس کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیں اور جب اس پر ضعف کے دورے پڑنے لگیں تو اس کے حلق میں شربت ٹپکانا، سطح میں نگا ہوں میں ہی نیکی قرار پاسکتا ہے۔ قرآن کریم، نظامِ عدل کے قیام کی تعلیم دیتا ہے جس کا مفہوم تمام نوعِ انسانی کے مفاد کا تحفظ ہے۔ اس نظام کا نام خدا کی بادشاہت ہے۔ ایک شخص بڑا مخیر ہے۔ اچھے اچھے کاموں میں حصہ لیتا ہے۔ غریبوں کی امداد کرتا ہے۔ عادات و خصائل نہایت عمدہ ہیں۔ لیکن حکومتِ وقت کو تسلیم نہیں کرتا یا اس کی جگہ کسی دوسری حکومت کے قیام کی فکر میں ہے، تو حکومت کی نگاہوں میں وہ جرمِ ایسا سنگین ہے کہ اس کی ذاتی نیکیاں اس کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ اور اگر اس کے خلاف یہ جرم ثابت ہو جائے تو اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔

خدا کی بادشاہت کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا نام ایمان ہے اور اس کے خلاف زندگی کا نام کفر

ہے۔ اب آپ خود ہی اندازہ فرمایا سمجھئے کہ کفر میں زندگی بسر کرنے والے کی ذاتی نیکیاں میزانِ خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتی ہیں؟ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ عزوجل کا واضح ارشاد ہے کہ **أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ** (یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال رائیگاں جاتے ہیں) یعنی جن اعمال کو وہ بزعمِ خویش نیک سمجھتے ہیں وہ دراصل نیک ہوتے ہی نہیں۔ اس لئے ان کا نتیجہ بھی کچھ نہیں نکلتا۔ آپ چاک کو کونین سمجھ کر صبح و شام پھانکتے رہتے، طیر یا کبھی دُور نہیں ہوگا۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمَانُ مَاءً  
..... فَمَالَهُ مِنْ ثَوْرٍ ۝ (۲۴/۴۰-۳۹)

جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے اعمال ایک صحرا میں سراب کی طرح ہیں جسے ایک پیاسا پانی سمجھتا ہے (اور اس کی طرف جاتا ہے) لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو وہاں کوئی (اصلی) چیز سے نظر نہیں آتی البتہ وہاں اللہ نظر آتا ہے جو اسے پورا پورا حساب دیتا ہے کیونکہ وہ بہت سریع الحساب ہے۔ یا ان کے اعمال) ایک بحرِ زخار میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کی طرح ہیں جہاں موج پر موج منلاطم ہو اور ان کے اوپر (سیاہ) بادل، تو بر تو ظلمات (ایسا کہ) جب وہ اپنا ہاتھ باہر نکالے تو سمجھائی نہ دے (اور حقیقت یہ ہے کہ) جسے اللہ روشنی نہ دے اسے کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی۔

اس لئے کہ یہ لوگ نظامِ حیات کو اعمالِ حیات سے الگ سمجھتے ہیں، حالانکہ اعمال وہی نتیجہ خیز ہیں جو صحیح نظام کے تابع ہوں۔ نظام سے الگ ہٹ کر انفرادی اعمال کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ سورۃ توبہ کے تیسرے رکوع کو دیکھئے، کیسے دل نشین انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَنَ  
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهِدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ  
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ (۹/۱۹)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانا (سبیلیں لگوانا) یا خانہ کعبہ کی خدمت (کرنیوالا) اس شخص کے برابر ہے جو اللہ اور آخرت (نظامِ خداوندی) پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے راستہ میں جدوجہد کرتا ہے (تمہاری سطح میں نگاہیں کچھ ہی کہیں) اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ ظالمین کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔



قرآن کریم کے متعدد مقامات میں ان امور کی تصریحات موجود ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ قرآنی معیار کے مطابق نیک عملی کسے کہتے ہیں۔



ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر غور فرمائیے کہ یہ نظریہ کہ نجات و سعادت کے لئے کسی خاص نظام زندگی کی ضرورت نہیں۔ "خدا پرستی اور نیک عملی" جو اصولی طور پر ہر مذہب میں یکساں موجود ہے، نجات کے لئے کافی ہے، کس قدر شرآنی تعلیم کے خلاف ہے؟ واضح رہے کہ یہ دعویٰ کہ اسلام کو باقی ادیان پر افضلیت و فوقیت حاصل ہے کسی مذہب کے خلاف عداوت پیدا کرنے کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اسلام محض اختلافِ مذاہب کی بنا پر عداوت نہیں سکھاتا۔ وہ تو امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ اس کے اس دعوئے کا اعلان و تبلیغ، نوع انسان کی ہمدردی اور ہی خواہی ہے۔ جیسے آپ کسی مریض سے کہیں کہ بھائی تمہارا مرض ادھر ادھر کے بے قاعدہ علاج سے نہیں جائے گا۔ اس کے لئے فلاں طبیب کی طرف رجوع کرو۔ وہی ان امراض کا ماہر ہے اور اسی کے ہاں اصلی نسخے مل سکتے ہیں۔ یہ مشورہ مریض سے عداوت نہیں بلکہ محبت پر مبنی ہے۔ عداوت تو اس کی طرف سے ہوگی جو یہ کہے گا کہ نہیں سب دو خانے ایک ہی جیسے ہیں جہاں سے جی چاہے نسخہ لکھو اور دوائی خرید لو۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب دوائی خانوں کے اصلی مالک نے اعلان کر دیا کہ اب صحیح نسخے صرف فلاں دو خانے سے مل سکیں گے (باقی دو خانے ہمارے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دھوکا دیتے ہیں) تو ہر دو خانے کو ایک جیسا بتانا مالک کے اس اعلان کی تکذیب اور مریض سے کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ دَ فِيهَا آيَةٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ



اس مقالہ میں اسلام کے لئے بھی مذہب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسلام درحقیقت مذہب نہیں دین ہے۔ اس لئے اسلام کا مذاہبِ عالم کے ساتھ مقابلہ ہی غلط ہے۔ جب یہ مذہب ہے ہی نہیں تو مذاہب کے ساتھ مقابلہ کیسا؟ یہ دین ہے اور دین کے معنی میں نظامِ حیات۔ اس لئے اسلام کا مقابلہ کرنا ہو تو دنیا کے دیگر مذاہب کی حیات کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ ابوالکلام صاحب آزاد اور ان کے اتباع میں اور لوگوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام کو بھی مذہب تصور کرتے ہیں۔ جب اسے ایک مذہب تصور کر لیا جائے تو پھر واقعی اسلام

میں اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس صورت میں اسلام کی افضلیت ثابت کرنا بے سود کوشش ہے۔ جب مقصد پوجا پاٹ ٹھہرا تو پوجا مندر میں کر لی تو کیا، اور مسجد میں کر لی تو کیا؟ جب مقصود یا تراہوجا تو ہر دو ارچلے گئے تو کیا اور مکے ہو آئے تو کیا؟ جب مطلب دان (خیرات) سے ہو تو کسی کو بھیک دے دی تو کیا اور زکوٰۃ دے دی تو کیا۔ اس تصور کے ماتحت فی الواقع ”خدا پرستی اور نیک عملی“ سب جگہ ایک جیسی رہ جاتی ہے۔ بلکہ اس کے لئے ”خدا پرستی“ کی شرط بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔ ضوابط اخلاق (سچ بولو، جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، حرام نہ کھاؤ، زنا نہ کرو) ہر جگہ یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں وہ بھی ان ضوابط کو اچھا کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے خدا پرستی بھی کچھ ضروری نہیں رہتی۔ ان ضوابط اخلاق کا نام ”سچا دین“ قرار پاتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں ایک مدت سے یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ اسلام بھی ایک مذہب ہے۔ اس لئے ان کے ہاں بھی خدا سے صرف پوجا پاٹ کا تعلق باقی رکھا جاتا ہے اور نیک عملی ان ضوابط اخلاق کا نام رکھ لیا جاتا ہے۔ چند عقائد، چند عبادات کی شکلیں اور وہ اخلاقی احکام جو ہر جگہ عام ملتے ہیں، بس ان کے مجموعہ کا نام ہے اسلام۔ اس اسلام میں اور دیگر مذاہب میں کچھ فرق نہیں ابوالکلام صاحب کے پیش نظر بھی اسلام کا یہی تصور تھا اس لئے ان کا نتیجہ مستخرج بھی ٹھیک تھا کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور باقی مولوی صاحبان میں فرق صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اس بات کا اعلان کر دیا اور دوسروں نے اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پائی۔ ورنہ عملاً ہر مولوی کا یہی عقیدہ ہے، خواہ وہ زبان سے اس کا اقرار کرے یا نہ کرے، یا یوں کہیں کہ ان کے عقیدے کا لازمی نتیجہ وہی ہے جس کا اعلان آزاد صاحب نے کر دیا ہے۔

لیکن جب یہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام مذہب نہیں ایک نظام حیات ہے، تو پھر اس بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اس اسلام سے بالکل مختلف ہوتی ہے جس کا تصور آزاد صاحب پیش کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر نظام حیات ایک خاص ذہنیت کا متقاضی ہوتا ہے جب تک وہ ذہن پیدا نہ ہو اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ ایمان اس خاص ذہنیت کو کہتے ہیں جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ قرآن کی رو سے تمام نوع انسانی کے لئے ایک ہی نظام حیات ہے۔ لہذا تمام نوع انسانی کے لئے ایک ہی انداز ایمان ہے۔ اسلام کے اس قرآنی تصور کی رو سے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ نظام ہر قوم اور ہر مذہب میں ایک جیسا ہے۔ یہ نظام شرآن کے علاوہ کہیں نہیں۔ اس لئے لغت بل کا سوال ہی سنا

فرد میں لم کشند

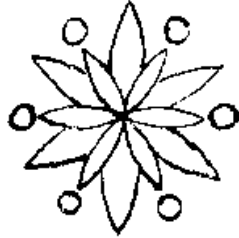
۱۶۳

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

نہیں آتا۔

یہ ہے وہ بنیادی غلطی جس پر ابوالکلام صاحب آزاد کی برہم جو سماجی تفسیر کی پوری عمارت

اٹھتی ہے۔



# وراثتِ ارض کا ابدی قانون

(نوشتہ اپریل ۱۹۴۹ء)

نظام کائنات ایک معینہ قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ذرہ خاک سے لے کر بڑے سے بڑے کڑے سماوی تک ہر شے زندانی تقدیر ہے۔ آفتاب جہاں تاب ایک مقررہ قاعدہ کے مطابق ہر صبح دیکھ مشرق سے بھانکتا ہے اور ایک متعین شاہراہ پر چل کر ہر شام جگہ مغرب میں روپوش ہو جاتا ہے۔ اس کے دوران سفر میں ہر وہ شے جس میں زندگی کی صلاحیت ہوتی ہے اس کے نور و حرارت سے اپنے سینہ کو بھر پور کر لیتی ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۳۶/۳۸)۔ چاند ایک خاص قاعدہ کے مطابق ایک غوطہ خور کشتی سیہیں کی طرح دریائے نیل سے ابھرتا ہے اور ایک خاص نظام کے تابع پھیلتا اور سمٹتا ہوا اپنے سفر کی منازل طے کئے جاتا ہے۔ وَالْقَمَرَ قَدَّارُنُهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ (۳۶/۳۹)۔ جب خراں کی دست درازیاں صحن گلستاں سے شگفتگی و شادابی کے تمام آثار و مظاہر کو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے متاع حیات کی طرح ختم کر دیتی ہیں، تو فطرت کے ایک معینہ قاعدہ کے مطابق نسیم بہار، مسرت اور شادمانیوں کی ایک رنگین و عطر آگین دنیا اپنے جلو میں لئے آتی ہے اور زمین کے حسرت زدہ، غم آلود چہرے کو پھر سے بستم نشاں و قہقہہ بار بنا دیتی ہے (وَ كَذَٰلِكَ) اللهُ يُخَيِّرُ الْأُمَّمَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۵۷/۱۸)۔

۱۔ تشکیل پاکستان کے وقت 'مشرقی پنجاب' ہندوستان کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے بری طرح تہ تیغ کیا تھا۔ بقیۃ السیف خاندان برباد، پاکستان کی طرف آگئے تھے۔

وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّنْ نَّجِيلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّ فَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ ۝ (۲۶/۲۴)

جس طرح یہ تو زمین و ضوابط خارجی و بنیادیں جاری و ساری ہیں اسی طرح انسان کی داخلی دنیا میں بھی ان کی حکمرانی ہے اور جس طرح انسان کی انفرادی زندگی کی جوئے رواں انہی سواصل میں محصور ہے اسی طرح اس کی حیاتِ اجتماعیہ کا اہم بیکراں بھی انہی حدود و ثغور میں مقید ہے۔ انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ میں سب سے اہم شعبہ نظامِ حکومت اور آئینِ مملکت کا ہے جسے قرآن ”وراثتِ ارض“ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ حکومت کسے ملتی ہے اور کس طرح ملتی ہے اور کس سے چھنتی ہے اور کیوں چھنتی ہے؟ اس کے لئے بھی خدا کا ایک ابدی قانون مقرر ہے۔ جو سورہ انبیاء کے ان بصیرت افروز الفاظ میں مرقوم ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ مَنۢ بَرٰثَتُهَا  
عِبَادِي الصّٰلِحُوْنَ ۝ اِنَّ فِيۢ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝

(۲۱/۱۰۶-۱۰۵)

اور ہم نے تورات کے بعد زبور میں (بھی) اس حقیقت کو لکھ دیا تھا کہ زمین کی وراثت ہمارے ”صالح بندوں“ کے لئے مقدر ہے (اس عظیم الشان قانونِ خداوندی میں) عبودیت اختیار

کرنے والی قوم کے لئے ایک (عظیم القدر بصیرت افروز حقیقت کشا) پیغام ہے۔

امانتِ حکومت و مملکت کی تفویض اور متاعِ جہان داری و جہان بینی کی وراثت کے متعلق یہ وہ ابدی قانون اور سرمدی اصول ہے جس کا نوشتہ خداوندی کی حیثیت سے اعلان کیا گیا ہے اور اس میں قوموں کے عروج و زوال اور اُمتوں کے استخلاف و استبدال کے متعلق ایک ایسے بنیادی معیار کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں ہر صاحبِ بصیرت کے لئے پیغامِ عظیم اور بلاغِ مبین مضمون ہے۔ یہ بنیادی اصول کیا ہے؟ یہی کہ وراثتِ ارض کے لئے صلاحیت شرط ہے۔ یعنی وہی قانون جو عالم آفاق میں بفتابِ للا صلح کے محکم اصول کی حیثیت سے جاری و ساری ہے۔

**صَلٰح کے معنی** | ”صلاح“ دیکھنے کو تو چار حروف کا ایک مختصر سا لفظ ہے لیکن اپنی جامعیت کے اعتبار سے ایسا ہمہ گیر ہے کہ اس میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر

آگے ہیں۔ صلح کے معنی ہیں صحیح و سالم تندرست و توانا، مستوی الجسم اور متناسب الاعضاء زندگی کی تمام صلاحیتوں کو لئے ہوئے۔ چنانچہ سورہ اعراف میں ہے کہ جنین کی پیدائش سے پہلے میاں بیوی دونوں

خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ اَتَيْتُنَا صَالِحًا لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۵ (۴/۱۸۹) 'خدا یا! ہمیں صحیح و سالم تندرست و توانا بچہ عطا کر دے تاکہ ہم تیرے شکر گزار بنیں فَلَمَّا اَتَيْتُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا ءَاتَا (۴/۱۹۰) لیکن جب اللہ انہیں تندرست و توانا بچہ عنایت کر دیتا ہے تو اس بارے میں اللہ کے ساتھ اوروں کو بھی شریک بنانے لگ جاتے ہیں۔ اس جگہ صحیح و سالم اور تندرست و توانا بچہ کے لئے سَلِحًا کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اس کے مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔ سورہ انبیاء میں ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں اولاد نہ تھی۔ انہوں نے اس کے لئے دعا کی تو اللہ نے ان کی رفیقہ حیات کو جو عقیم تھیں، اولاد کے قابل بنا دیا۔ وَ اَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهَا (۲۱/۹۰) لہذا اصلاح کے معنی ان قابلیتوں اور استعدادوں کا پیدا ہونا ہے جن سے تعمیری نتائج مرتب ہوں۔ ان ہی معنوں میں یہ لفظ سورہ النور میں استعمال ہوا ہے جہاں فرمایا کہ تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے (جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں میں موجود تھے) جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہیں وَ الصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اَمَارِكُمْ (۲۴/۳۲) ان کے نکاح کر دو۔

ان آیات سے صلاح و صالح کے معانی ہمارے سامنے آگئے جن سے واضح ہو گیا کہ اس قانونِ سرمدی کی رُو سے جو ہمارے موضوع کا محور اور اس زندگی بخش داستان کا زریبِ عنوان ہے، زمین کی وراثت (حکومت و مملکت) کے مستحق وہی ہیں جو اس کی صلاحیت و قابلیت رکھتے ہوں۔ جن میں زندگی اور اس کی توانائیاں تڑپ رہی ہوں، جن کے سینوں میں دم اور جگر میں خون، بازوؤں میں قوت، پاؤں میں استقامت، ذہنوں میں جلا، نگاہوں میں روشنی، ارادوں میں بلندی اور عزائم میں پختگی ہو، جو دنیا میں عزت اور شوکت کی زندگی بسر کرنے کی تمنا رکھتے ہوں اور اس تمنا کی تکمیل اور اس آرزو کے حصول کے لئے ایسی قوت فراہم کریں کہ جو قوم مخالف ان کے عزائم کی راہ میں مزاحم ہو اسے خص و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائیں۔ دنیا میں جس کے پاس قوت نہیں، اس کا کوئی دعوے سچا نہیں۔

عصا نہ ہو تو کلیبی ہے کارِ بے بنیاد

جو اپنی قوتِ بازو سے زندہ رہنے کا حق قائم نہیں کرتا اسے کوئی زندہ رہنے نہیں دیتا۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جسمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ قانون جس کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو و عطا اور اپدیش بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی لئے اُس قانون کے ساتھ

جسے دنیا میں دین کی حیثیت سے متکثر رہنا مقصود ہو فولاد کی شمشیر جگر دار کی بھی ضرورت ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ اَہم نے ضوابطِ دین اور میزانِ عدل کے ساتھ فولاد بھی نازل کیا جس میں بڑی شدت کی سختی ہوتی ہے لَيَقْوَمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷/۲۵) تاکہ لوگ جادہ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔

ایں دو قوت حافظِ یکدیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند

ہی وہ قوت ہے جس کے متعلق فرمایا کہ

وَاعْتَدُوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّن قُوَّةٍ وَ مِّن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ  
بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَ عَدُوَّكُمْ (۸/۶۰)

جس قدر قوت کے ساز و سامان اور گھوڑوں کے پرے باندھ رکھنے کی تم میں استطاعت ہو اسے

تم اٹھا اور اپنے دشمن کے مقابلہ کیلئے ہر وقت تیار رکھو۔

قوت اور رباطِ الخیل کی جامعیت میں تمام سامان و آلاتِ حرب و ضرب ساز و یراقِ جنگ و قتال اور وسائل و اسبابِ مدافعت و محاربت شامل ہیں۔ زمانہ کے مقتضیات اور احوال و ظروف کے تبدیل و تغیر سے ان اسباب و ذرائع کی نوعیتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن قوت کی وہ روح جو زندگی کی اصل ہے، ہر جگہ بدستور قائم رہتی ہے۔ گوپتے کے پنجر سے لے کر ایٹم بم کے گولے تک، تمام اسبابِ قوت کی روح کے مظاہر، فلہذا ایک ہی اصل کی شاخیں ایک جان کے پیکر اور ایک ہی تلوار کی نیام میں زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان پیکروں کا بدلنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ جس قوت کی نوعیتیں وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں، وہ قوت مصائبِ زندگی میں اس صورت کی رہ جاتی ہے جس طرح فلکِ پیمایا رہ کے مقابلہ میں "راجہ جی کی بہلی"۔

بہر حال دنیا میں زندہ وہی رہتا ہے جس میں زندہ رہنے کی استعداد ہو، آگے وہی بڑھتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی قوت ہو۔ لہذا حکومت و مملکت اسی کی تقدیر میں ہوتی ہے جس میں جہان بنانی و جہان داری کی صلاحیتیں ہوں اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ۔



یہاں تک صالحیت کا صرف ایک گوشہ ہمارے سامنے آیا ہے جس کا نام خالص مادی قوت

(PHYSICAL POWER) ہے۔ لیکن قرآن کی رو سے فقط مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہو جاتی۔ اس میں تو کافر و مومن کی کوئی تمیز نہیں۔ حرب اللہ اور حرب الشیطان کی کچھ تفریق نہیں۔ جو کبھی مادی قوت حاصل کر لے وہ غلبہ و استیلا حاصل کر سکتا ہے اور اس طرح صاحب حکومت و سلطنت بن سکتا ہے۔ آج دنیا میں جس طرف نگاہ ڈالئے انہی مادی قوتوں کا باہمی مقابلہ نظر آئے گا۔ جس کے پاس قوت اور اس سے حاصل کردہ سامان و ذرائع زیادہ ہیں وہی سب سے بڑی سلطنت و حکومت کا مالک ہے۔ اور یہ صرف آج ہی پر کیا موقوف ہے؛ دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ ہر صفحہ پر یہی حقیقت فولاد کے اُبھرے ہوئے آتشیں الفاظ میں آپ کے سامنے آئے گی۔

لیکن جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے قرآن کی رو سے فقط مادی قوت سے **فساد اور صلاح** صالحیت کی شرط پوری نہیں ہو جاتی اور صرف اس کے زور پر قائم کردہ غلبہ و استیلا اور تسلط و تمکن سے اصلاح پیدا نہیں ہوتی۔ اس نے بتایا ہے کہ اصلاح و فساد دو الگ الگ نتائج ہیں جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ جو نظام سلطنت فقط مادی قوتوں کے استیلا پر قائم ہوتا ہے اس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔ سورہ شعرا میں دیکھئے، اس حقیقت کو کس قدر واضح طور پر بے نقاب کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ  
وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۲۶/۱۵۲)

حدود فراموش سرکش قوتوں کے نظام کی اطاعت مت کرو۔ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ اصلاح نہیں کرتے۔

سورہ نمل میں اسی ضمن (قصہ حضرت صالحؑ) میں ارشاد ہے کہ

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا  
يُصْلِحُونَ ۝ (۲۷/۴۸)

اور اس شہر میں نو اکابر (ارکانِ مملکت) تھے جو ملک میں فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کی ابتدائی آیات میں کہا گیا ہے کہ



وَ إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ  
مُصْلِحُونَ ۝ (۲/۱۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت برپا کرو۔ تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے قرآن نے ان چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ عہدِ قدیم نمازید و فراعنہ سے لے کر عہدِ حاضر کے "ہٹلران و چرچلان" میں سے کسی سے پوچھئے "ہر پیکر فساد و استبداد یہی کہے گا کہ ہماری غرض اصلاح ہے۔ مفسدین دوسرے ہیں۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں ہر فریق متخاصم کی زبان پر یہی تھا کہ ہم حق و صداقت اور عدل و انصاف کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور اب کبھی مغربی بساطِ سیاست کے ہر بہرہ باز کا یہی اعلان ہے کہ **إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ** لیکن قرآن کی رو سے ہر وہ نظام جو انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتا ہے باطل کا نظام ہے جس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہیں۔ (فساد کے معنی ہی ناہمواری ہے)۔ اصلاح (معاشرہ میں ہمواریاں) صرف اس نظام کا نتیجہ ہے جس میں قوت کا استعمال آئینِ خداوندی کی تنفیذ و ترویج کے لئے ہوتا ہو۔ اس نظام کا فطری نتیجہ "ربوبیتِ عامہ" ہوتا ہے جس سے مفہوم ہے ایسی فضا جس میں ہر شخص کی فطری صلاحیتوں کے اُبھرنے، نشوونما پانے اور تکمیل تک پہنچنے کے لئے یکساں مواقع میسر ہوں۔ شرفِ انسانیت اسی نظام میں ارتقائی منازل طے کر کے اپنی انتہا تک پہنچ سکتا ہے۔

اگر بائیں نہ رسیدی تمام بولہبی است

اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت، اطاعت، صرف احکامِ خداوندی کی ہوگی۔ اور اس اطاعت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص کی کامل نشوونما ہوتی جائے گی۔ اس ایمان کی بنیاد پر جو عمارت قائم ہوگی اس کا نام عملِ صالح ہے۔ اور ان دونوں (یعنی زندگی کے اس نصب العین اور اس کے مطابق پردِ گرام) کا نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔ وہ استخلاف (دراثتِ ارض) ہے جس کے لئے صالحیت کی شرط ہے۔ یا یوں کہیے کہ جب اور جہاں اس قسم کی صالحیت پیدا ہوگی، دراثتِ ارض اس کا فطری نتیجہ ہوگا۔ اسی کا نام "اللہ کا وعدہ" ہے جس کا ذکر سورہٴ نور کی ان درخشندہ آیات میں کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴/۵۵)  
 اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ تم میں سے جو بھی ایمان لائیں گے اور صالح العمل ہوں گے انہیں  
 اللہ زمین میں حکومت عطا کرے گا جس طرح ان شرائط کے پورا کرنے والوں کو اس سے پہلے  
 وراثتِ ارض کی نعمتوں سے مالا مال کیا گیا۔

یہ استخلاف (وراثتِ ارض) کس غرض کے لئے ہوگی؟ لیمکنن لہم دینہم الذی ارتضیٰ لہم  
 (۲۴/۵۵) تاکہ وہ نظام نہایت مضبوطی سے قائم کر دیا جائے جو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور ولیدنا لہم  
 من بعد خوفہم آمنًا (۲۴/۵۵) تاکہ ان کی حالت خوف کو کامل امن و سکون سے بدل دیا جائے اور  
 یعبدونی لا یشرکون بی شیئاً تاکہ یہ صرف قوانین الہیہ کے مطیع و محکوم ہوں۔ دنیا کی کوئی قوت  
 ان سے اپنی حاکمیت نہ منوا سکے۔

یہ ہے وہ استخلاف (حکومت) جو وراثتِ ارض کے قانونِ سرمدی کی رو سے حاصل ہوتی ہے۔

لیکن اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ سوال اس قدر اہم ہے  
**ایک بنیادی فرق** کہ اگر اس کا صحیح جواب سامنے نہ آئے تو اصلاح اور فساد کا فرق  
 نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے اور انسان تباہی و بربادی کے جہنم میں جا گرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ صالحیت  
 کی اس شرط کو پورا کرنے سے جو حکومت و مملکت عطا ہوتی ہے وہ اگر خدا کی طرف سے ملتی ہے (بیرئہا  
 عبادی الضلیحون) تو جو حکومت و سلطنت فقط مادی قوتوں کے زور سے حاصل کی جاتی ہے کیا  
 وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتی؟ اگر وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتی تو اسے کون دیتا ہے؟ اگر آپ بغور دیکھیں  
 گے تو اس سوال کے ڈانڈے مسئلہ تقدیر سے جا ملیں گے مسئلہ تقدیر کی بحث بڑی تفصیل طلب ہے  
 اور اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس مقام پر صرف اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ جس انداز سے یہ مسئلہ  
 عام طور پر مسلمانوں کے قلوب و اذہان پر مستولی ہے اور جس کی وجہ سے یہ قوم گزشتہ ایک ہزار برس سے  
 راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے، اس سوال کا محرک بھی وہی خیال ہے۔ تقدیر کا یہ مفہوم ہمارے دورِ ملوکیت کی  
 تخلیق ہے جسے (من جملہ دیگر اغراض و مقاصد) ملوکیت کے استبداد کے (شرعی جواز) کی غرض سے

وضع کیا گیا اور پھر سیاسی جیلہ کاریوں سے اس طرح پھیلا یا گیا کہ یہ ایک حقیقت ثابت بن کر اُمت کے قلوب کی گہرائیوں میں سرایت کر گیا اور وہاں سے آج تک نہیں نکل سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ہر قسم کی دولت اور قوت، حکومت و سطوت خدا کی نعمت اور اس کی "عطا فرمودہ" قرار پانچکی ہے، بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ دولت و قوت کس طریق سے حاصل کی گئی ہے اور اسے کس مصرف میں لایا جا رہا ہے؛ ہم جس دولت مند کا ذکر کرتے ہیں، بلا تامل کہہ دیتے ہیں کہ اس پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ ہر صاحب شوکت و سطوت کے متعلق یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ "اللہ کی دین" ہے۔ اس غیر محسوس عقیدہ کی رو سے ہمارے نزدیک "دولت" خدا کی نعمت ہے۔ خواہ وہ کسی نے ڈال کر حاصل کی ہو یا اپنی محنت سے کمائی ہو۔ ہمارے ان قدیمی تصورات کی رو سے "حکومت" اللہ کا انعام ہے خواہ اسے اہلیسی تغلب اور طاغوتی سیاست کے بل بوتے پر قائم رکھا ہو یا ایمان و عمل صالح کی بنا پر۔ غور کیجئے؛ ہماری زبان میں "اللہ کی دین" کے مقابلہ میں کسی اور کی دین کے لئے کوئی اصطلاح ہی موجود نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک ڈالو کو بھی خدا دیتا ہے اور ایک مرد کا سب کو بھی۔ لہذا طاغوتی قوتوں کی حکومت بھی خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور اس لئے اس کے قانون وراثت (يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ) کے تابع۔ اور اس بنا پر صالحین کے معنی ہو جاتے ہیں ہر وہ گروہ جو حکومت قائم کرنے کی قوت پیدا کر لے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر فرعون کی حکومت بھی قانون خداوندی کی رو سے ملی تھی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کے خلاف اتنی بڑی ہم کے لئے کیوں مامور کیا گیا؛ اگر باطل کا وولتی نظام بھی اسی ابدی قانون وراثت کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس کی جگہ حق کا نظام قائم کرنے کے لئے اس قدر سرفروشیوں اور جاں سپاریوں کی تاکید کیوں کی جاتی ہے؛ حق و باطل کی یہ کشمکش و پیکار تو اسی بنا پر ہے کہ باطل منجانب اللہ نہیں ہوتا۔ اگر "قانون وراثتِ ارض" صرف حصولِ قوت ہی کا دوسرا نام ہے تو اس کے لئے عرشِ عظیم سے آنے والے پیغامات کی کیا ضرورت ہے؛ اسے تو دنیا کا ہر ہلا کو اور چنگیز خاں از خود جانتا ہے۔ اگر نینٹے کا مافوق البشر، قرآنِ کامر و مومن ہے تو پھر حکمتِ فرعون اور حکمتِ کلیبی میں کیا فرق ہے؛ لہذا یہ ظاہر ہے کہ خالص قوت کی بنا پر جو نظام حکومت قائم کر لیا جاتا ہے اسے خدا کے متعین فرمودہ قانون وراثت کا نتیجہ؛ فلہذا من جانب اللہ نہیں کہا جاسکتا۔ من جانب اللہ استخلاف فی الارض وہی ہوتا ہے جو اس کے قانونِ سرمدی کا نتیجہ اور قرآنی صالحیت کا ثمرہ ہو۔ اور یہی وہ استخلاف ہے جو ہمارے موضوع کا عنوان ہے۔ صالحیت کا قرآنی مفہوم متعین کرنے کا بعد اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ وراثتِ ارض (یعنی قوانینِ الہیہ

قوم کی مختلف حالتیں | کے مطابق حکومت قائم کرنے سے پہلے عام طور پر قوم کی حالت یہ ہوگی کہ (۱) یا تو ان پر کسی دوسرے کی حکومت نہیں ہوگی یعنی ان کی اپنی

حکومت ہوگی لیکن اسی آئین کے مطابق جس کی رو سے عام انسانی حکومتیں قائم ہوتی ہیں یا (۲) سرے سے کسی دولتی نظام کا وجود ہی نہ ہوگا اور قوم قبائلی قسم کی زندگی بسر کر رہی ہوگی اور یا (۳) وہ قوم کسی غیر حکومت کی محکوم ہوگی۔ اول الذکر صورت میں (یعنی جب حکومت اپنی ہو یا سرے سے کسی منظم حکومت کا وجود ہی نہ ہو) اس قوم کو اس کی امکانی قدرت حاصل ہوگی کہ وہ چاہے تو اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے آئینِ خداوندی کے مطابق وراثتِ ارض کی دولت سے متمتع ہو جائے۔ اس صورت میں مقابلہ ان لوگوں سے ہوگا جو اس انداز کی حکومت کے قیام میں اپنی ذاتی اغراض کا نقصان و زیاں سمجھتے ہوں اور اس لئے اس تحریک کی مخالفت میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ ایسی صورت میں وہ قوم یا تو فطرتی مخالفت پر غلبہ حاصل کر لے گی اور اگر اس کا فوری امکان نہ ہوگا تو کسی اور خطہٴ ارض کی طرف ہجرت کر کے اسے اس آئین حکومت کی قرار گاہ بنا لے گی۔ یہ وراثتِ ارض فطری نتیجہ ہوگی ان کی صالحیت کا۔ نبی اکرمؐ کی دعوت کے وقت قوم مخاطب کی یہی حالت تھی۔ عرب کسی غیر حکومت کے تابع نہیں تھے۔ قبائلی زندگی بسر کرتے اور اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے تھے۔ اس لئے انہیں امکانی قدرت حاصل تھی کہ وہ چاہتے تو اپنے اندر داخلی تبدیلیاں پیدا کر کے وراثتِ ارضی کے مستحق بن جاتے۔ نبی اکرمؐ کی بصیرت افزا تعلیم اور حقیقت کشا عمل سے اس قوم نے وہ تربیت حاصل کر لی جس سے ان کے خفتہ جو ہر بیدار ہو گئے اور وہ اصلح بن کر استخلاف فی الارض کے مقام تک پہنچ گئے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ وذلک الفوز العظیم۔

دوسری صورت کی مثال ہمارے سامنے قوم بنی اسرائیل کی ہے | بنی اسرائیل کی مثال

میں گرفتار تھی ان پر فرعون کی حکومت کے مستبد قوانین مسلط تھے اس لئے وہاں رہتے ہوئے انہیں اس کی امکانی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے جوہرِ خوابیدہ کو بیدار کر کے ان میں نمود و بالیدگی پیدا کر سکیں۔ اس کے لئے آزاد فضا کی موجودگی نہایت ضروری تھی۔ یعنی بالفاظِ دیگر، صورت یہ پیدا ہو چکی تھی کہ

(۱) جب تک وہ اپنے اندر صالحیت نہ پیدا کر لیں آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔

(۲) لیکن صالحیت پیدا نہیں ہو سکتی تھی جب تک وہ فرعون کے پختہ استبداد سے آزاد نہ ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں بنی اسرائیل کے لئے فرعون کی محکومیت سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن بعض اوقات ایسے غیر متوقع حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن سے اگر بروقت فائدہ اٹھایا جائے تو قوم کی گردن سے غلامی کی غلامی کا جوا اتر جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس طرح سے آزادی کا حاصل ہو جانا اس قوم کی صلاحیتوں کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ بیگامی صورتِ حالات سے فائدہ اٹھالینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کو فرعون کی محکومیت سے نجات اسی انداز سے ملی تھی۔ یعنی ایسا نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے اپنے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کر لی تھیں جن سے غلامی کی زنجیریں کٹ گئی تھیں۔ ہو اصراف یہ تھا کہ حضرت موسیٰ آئے اور اپنی غیر معمولی قوتوں کے زور پر قوم کو مصر سے نکال کر باہر لے گئے۔ اسی لئے قرآن نے اسے "عدل" سے تعبیر نہیں کیا بلکہ "احسان" سے تعبیر کیا ہے، جہاں فرمایا کہ

وَشَرِيحًا أَنْ تَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتَضَعُّوْا فِي الْأَرْضِ وَ تَجْعَلَهُمْ  
أَيْمَةً وَ تَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ؕ وَ نَمَكِّنْ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَ  
نُرِي فِرْعَوْنَ وَ هَامَانَ وَ جُنُودَهُمَا مِنْهُمَا مَا كَانُوا يَحْتَدِرُونَ ه

(۶-۲۸/۵)

اور ہم نے چاہا کہ وہ لوگ جنہیں ملک میں غلامی و محکومی کے شکنجوں میں جکڑ کر بے حد کمزور کر دیا گیا تھا ان پر احسان کریں اور انہیں امام (قوموں کی قیادت کرنے والے) بنائیں اور انہیں (حکومت و مملکت کا) وارث بنائیں اور (اس طرح) انہیں زمین میں متمکن کر دیں۔

لہذا انہیں فرعون کی غلامی سے نجات بطور العام دلادی گئی اور انہیں ایمن کی وادیوں میں پہنچا دیا گیا جہاں ان پر کسی غیر کی حکومت نہ تھی اور اس طرح ان کے لئے امکانی قدرت پیدا کر دی گئی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو تربیت دے کر وراثتِ ارض کے مستحق بن جائیں۔

**پاکستان کے مسلمان** | ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان بالکل اسی طرح ملا ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وراثتِ ارض یا استخلاف ہے وہ حقیقت سے بیخبر ہیں۔ وراثتِ ارض بلا مزد و معاوضہ نہیں ملا کرتی۔ وہ فطری نتیجہ ہوتی ہے قوم کی صلاحیتوں کا۔ انعاماً اور احساناً صرف غیروں کی غلامی سے رستگاری عطا ہوتی ہے تاکہ اس سے صلاحیت پیدا کرنے کی امکانی قدرت نصیب ہو جائے۔ ہمیں اس وقت صرف ایک خطہ زمین ملا ہے جس پر کسی کی حکومت نہیں۔ اب ہم چاہیں تو

(۱) اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے اس زمین پر خدا کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھادیں۔  
 (۲) صرف مادی قوتوں کے زور سے غلبہ و استیلا پیدا کر کے اس قسم کی سلطنت متشکل کر لیں جس قسم کی سلطنتیں دوسری قوموں نے قائم کر رکھی ہیں اور یا  
 (۳) موجودہ جمود و تعطل اور بے عملی اور بے حسی کی زندگی سے اس امکانی قدرت کو بھی کھویٹیں اور پھر کسی اور کی غلامی سے بدستور سابق جہنم کی لعنتی زندگی میں گرفتار ہو جائیں۔  
 ہم نے کہا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہی ہے جیسی اس وقت بنی اسرائیل کی تھی۔ آئیے دیکھیں کہ اس حالت میں بنی اسرائیل نے کیا کیا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ و فیہا بصائر لِقَوْمٍ یَعْقِلُونَ۔



بنی اسرائیل کو اللہ کی اس موبستِ عظمیٰ پر قدم قدم پر تشکر و امتنان کے سجدے کرنے چاہئیں تھے۔ یہ انعام کچھ چھوٹا انعام اور یہ احسان کچھ کم احسان نہ تھا۔ فرعون جیسے مجسمہ استبداد و قہرمانیت کے دستِ جوہر سے دستکاری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لیکن صدیوں کی غلامی سے بنی اسرائیل کے جوہرِ انسانیت قریب قریب مردہ ہو چکے تھے۔ نہ ان کے سینہ میں زندہ آرزوؤں کی مقدس قندیل تھی نہ ان کی نگاہوں میں بلند مقاصد کی عالمتاب درخشندگی۔ دنیا میں غلامی ہزاروں لعنتوں کی ایک لعنت اور لاکھ نخوتوں کی ایک نخوت ہے۔ غلامی میں وہ تمام عیوب و نقائص جنہیں جسدِ انسانیت کے لئے جذام کہنا چاہئے اس انداز سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس قوم بنی اسرائیل کی حالت

## قوم بنی اسرائیل کی حالت

حلول کر گئے۔ غلامی میں انسان زندگی کے مقابلہ سے جی جراتا اور قفس کے خوگر پرندے کی طرح اس عافیت کو ششی کی زندگی کو عین حیات سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ  
 نے تیر کہاں میں ہے نہ صیا و مکین میں  
 گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

صدیوں کی غلامی سے ان میں عزم و استقلال کے جوہر بہت کم رہ گئے تھے۔ محکومی سے تن آسانی اور بہل انگاری کی افسردگی ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اور وہ اس بیخ زندگی کے اس درجہ عادی ہو چکے تھے کہ ان پر

### قفس ہوا تھا حلال اور آشیانہ حرام

نتیجہ اس کا یہ کہ وہ ہر انقلاب آفریں تدبیر میں مصائب و مشکلات کے طوفان پوشیدہ دیکھتے تھے۔ تبدیلی احوال کے تصور سے ان کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ حضرت موسیٰ انہیں بار بار تاکید کرتے کہ ذرا ہمت اور استقلال سے کام لو اور پھر دیکھو کہ اللہ کی تائید و نصرت کس طرح تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔ راستہ کی مشکلات کو استقامت سے برداشت کر جاؤ! انجام کار میدان تمہارے ہی ہاتھ رہے گا۔ ذرا اپنے اندر صلاحیت پیدا کر لو! وراثتِ ارض تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ قَفَا  
يُؤْتِيهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (۷/۱۲۷)

تب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا۔ قوانین خداوندی سے فتح و نصرت کی مدد مانگو اور (اس راہ میں) ججے رہو۔ بلاشبہ زمین (کی بادشاہت) صرف خدا کے لئے ہے جسے وہ اپنے بندوں میں سے نہیں دیتا ہے جو اس کے قانون کے مطابق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ بندے جنہیں آخر الامر حکومت حاصل ہوتی ہے وہ ہوتے ہیں جو قانون خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔

لیکن اس تذکیر و تنذیر سے ان پیکرانِ آب و گل کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑنا آسان نہ تھا۔ حضرت موسیٰ انہیں عزم و استقلال کے لئے ابھارتے اور اُلٹے شکوہ سنج ہوتے کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبتوں میں رہے اب تمہارے آنے کے بعد ان میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اب آرام سے گزرے گی لیکن تم نئے دن ایک نیا مرحلہ سامنے لے آتے ہو۔ تم اچھے چارہ ساز بن کر آئے؟

قَالُوا أُوذِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِنَا وَ مِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۗ قَالَ  
عَلَىٰ رَبِّكُمْ أَنْ يَتُفَلَكَ عَدُوُّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ  
فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۝ (۷/۱۲۱)

انہوں نے کہا کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہمیں اذیتیں پہنچ رہی تھیں اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ موسیٰ نے کہا کہ قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن

کو ہلاک کر دے اور تمہیں استخلاف فی الارض عطا فرمائے پھر دیکھے کہ تم کیسے کام کرتے ہو!

لیکن جن لوگوں کی ہڈیوں کے گودے کے اندر تک حکومت کے جراثیم گھر کر چکے ہوں۔ جو خونے غلامی میں پختہ

ہو چکے ہوں ان پر بھلا ان حیات اور خطبات اور زندگی بخش پیغامات کا کیا اثر ہوا؟ جب حضرت موسیٰؑ انہیں مصر سے نکال کر لے چلے تو وہ اس طرح پاجولاں جا رہے تھے جیسے کہیں بیگار میں پکڑے جا رہے ہوں یا جب وہ سمندر کے کنارے پہنچے اور پیچھے سے فرعون کا لشکر تعاقب میں آیا تو انہوں نے چلانا شروع کر دیا کہ ہمیں موت کے منہ میں دھکیل کر لے آئے ہو؟

فَلَمَّا تَرَاءَ الْجَمْعَيْنِ قَالَ اصْطَبُّ مَوْسَىٰ اِنَّا لَمُدْرِكُوْنَ ۝ (۲۶/۶۱)  
جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم یقیناً  
(پھر) قلاو آگئے۔

تورات میں ہے:-

اور جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اوپر کیں اور مصریوں کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تو وہ شدت سے ڈرے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند کریم سے فریاد کی اور موسیٰؑ سے کہا کہ مصر میں قبروں کی جگہ نہ کھتی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لایا ہے؟ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا ناگم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا۔

(خروج ۲-۱۲/۱۰)

میں مرنے سے بہتر تھا۔

## غلامی کے اثرات

غور کیجئے! غلاموں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح چھلک کر باہر آرہی ہے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ مصریوں کی خدمت گزاری اس سے کہیں بہتر کھتی؟ اس سے بڑی بد بختی اور کس کی ہوگی جو نفس کو آشیانہ سے بہتر سمجھے؟ اور اس کے لئے دلیل یہ دے کہ آشیانہ میں کہیں خوفِ برق ہے کہیں خوفِ صرصر کہیں فکرِ معاش ہے اور کہیں خدشہِ صیاد۔ نفس کی زندگی میں یہ تمام تفکرات و خدشات آقا کے ذمہ ہوتے ہیں۔ اللہ اکبر! حکمران کی ساحری بھی کس درجہ کامیاب ہوتی ہے جو انسان کی قلبِ ماہیت کر دیتی ہے وہ بصیرتِ صحیحہ جو انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ

حیاتِ جاوداں اندر ستیزا ست

اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ خطرہ نہیں بلکہ خطرہ کا تصور بھی اسے مرگِ ناگہانی بن کر دکھائی دیتا ہے۔ محکومیت



کی ایفون سے اس کے قوائے عمیہ اس درجہ مخدر ہو جاتے ہیں کہ جدوجہد اور سعی و کادوش کی زندگی اس کے لئے مصیبت بن جاتی ہے۔ عافیت کوشی اور سہل انگاری سے، کہ جس کے لئے حاکم قوم کی طرف سے خاص طور پر اسباب و ذرائع مہیا کئے جاتے ہیں، ان کی قوت برداشت بالکل سلب ہو جاتی ہے اور وہ بات بات پر جھٹلا اٹھتے ہیں۔ محکومیت کا زہر کس قدر میٹھا، خواب آور اور چپکے چپکے غیر محسوس طور پر موت کی طرف لے جانے والا ہوتا ہے۔ یہی زہر تھا جو بنی اسرائیل کے خون کے ہر ذرہ میں سرایت کر چکا تھا اور انہیں ذرا سی تکلیف پر اس کا دلی افسوس ہوتا تھا کہ ہم مصر کی محکومیت سے کیوں آزاد ہو گئے؟ چنانچہ تو رات میں دوسری جگہ ہے۔

پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے۔ اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت نہ بن مصر سے خارج ہو کر دوسرے مینے کے بندرہوں دن ستین کے بیابان میں جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے پہنچی اور ساری جماعت بنی اسرائیل کی اس میدان میں موسیٰ اور ہارون پر جھنجھلائی اور بنی اسرائیل بولے کہ کاش! ہم خدا کے ہاتھ سے زمین مصر میں، جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھے تھے اور ردی من بھر کے کھلتے تھے مارے جلتے کیونکہ تم ہم کو اس بیابان میں نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کر دو۔ (خروج ۳-۱۶/۱)

آپ نے دیکھا کہ انہیں کس چیز کی یاد ستارہی تھی؟ گوشت کی ہانڈیوں کی۔ یعنی جیل خانے کی روٹیوں کی یاد! یا اللعجب! سحر حکمرانی کس قدر ذہنیت مسح کر دیتا ہے کہ اس سے دیدہ شاہین میں نگر خفاش رکھ دی جاتی ہے جو جہنم کے شجرۃ الزقوم کو ثمر بہشت بنا کر دکھاتی ہے۔ یہی کیفیت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی۔ وہ ایک میدان میں پہنچے جہاں ذرا پانی کی قلت تھی، تو پھر وہی واویلا مچانا شروع کر دیا کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لئے ہو؟

نبی بنی اسرائیل کی جماعت نے قیدم میں ڈبرہ ڈالا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا، سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ ہم پیئیں۔ موسیٰ نے ان سے کہا کہ تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو اور خداوند کا کیوں امتحان کرتے ہو؟ اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے۔ سو لوگ موسیٰ پر جھنجھلائے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں کو اور ہمارے مویشی

کو پیاس سے ہلاک کر دے (خروج ۳-۱۶/۱)

غرضیکہ وہ قدم قدم پر رڈ ٹھکتے تھے اور ہر بار یہی طعنہ دیتے تھے کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لئے؟ و شان کریم نے اس قوم کی داستانِ زندگی کو اس لئے اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے اور مختلف مقامات پر اسے بار بار

سامنے لاتا ہے کہ اس کے اندر ہر دیدہ بینا کے لئے عبرت و موعظت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں چہنچہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ اللہ کی وہ موبہبت و نعمت جو انہیں بلا محنت و مشقت مل گئی تھی کس طرح ان کے لئے وہاں جان اور بلائے بے درمان بن رہی تھی۔

بخود کے ٹی رسیداں راہ پیمائے تن آسانے

ہزاراں سال منزلِ درمقامِ آذری کر وہ

انہیں مصر کی لعنتی زندگی سے نکال کر سینا کے میدانوں میں اس لئے لایا گیا کہ وہ اپنے جو ہر خودی کی تربیت کریں اور اس طرح اپنے اندر ایسی فولادی سیرت پیدا کر لیں جس سے مصائبِ زندگی میں ہر مشکل کا مقابلہ ہو سکے اور یوں اپنے پیکرِ خاکی کے ذرات کہن کو ترتیبِ نودے کر اس سے ایک جہانِ دیگر کی تعمیر کر لیں جو دراشتِ ارض کی قرار گاہ پائے۔ لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ قدم قدم پر حضرت موسیٰ کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے اور عجیب و غریب مطالبات پیش کرتے۔ سینا کی داویلوں سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کسی بُت کی پوجا کر رہے ہیں۔ یہ حضرت موسیٰ کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے کہ ہمیں بھی ایسا ہی بُت بنوادیجئے! **تَا نُؤَا بِمُوسَىٰ اجْعَلْ لَنَا آلِهَةً كَمَا لَهُمُ الْآلِهَةُ** (۱۳۸/۷) حتیٰ کہ جب حضرت موسیٰ چند روز کے لئے طور کی چوٹیوں پر تشریف لے گئے تو انہوں نے گنوسا سامری کی پرستش شروع کر دی۔ جب ان سے کہا گیا کہ تورات کے احکام کی پابندی کرو کہ یہ احکام تمہارے خدا نے دیئے ہیں، تو اڑ کر بیٹھ گئے کہ **لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ مَنَرَىٰ اِلٰهَ جَهَنَّمَ** (۲/۵۵) ہم کبھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم خدا کو کھلے طور پر نہ دیکھ لیں۔ وادیِ امین میں صحرا کی صاف و سادہ غذا مادہ فطرت پر کھانے کو ملتی تھی، لیکن انہیں رہ رہ کر شہر کے چٹلے کھانوں کی یاد ستاتی تھی۔ چند روز کے بعد منہ بسور کر بیٹھ گئے، **لَنْ نَصُومَ عَلٰی طَعَامٍ وَّ اَحِلِّ** (۲/۶۱) ہم سے ہر روز ایک ہی چیز نہیں کھانی جائے گی۔

جب محکوم قوم کے قوائے عملیہ مضمحل اور ان کے جو ہر مردانگیِ مسلوب ہو جاتے ہیں تو ان کے پاس فقط باتیں ہی باتیں رہ جاتی ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں عمل کے بجائے شاعری شروع کر دیتی ہے۔ بات بات پر منطقی موثکافیاں، قدم قدم پر فلسفیانہ نکتہ آریاں، زندہ قوموں کا شیوہ زندگی ہوتا ہے **سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا** سنا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ وہ کام زیادہ کرتے ہیں اور باتیں بہت کم لیکن محکوم قوم باتیں ہی باتیں کرتی ہے۔ کام بالکل نہیں کرتی۔ یہی حالت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ ایک گائے (یا سانڈ) ذبح

کر لو۔ کس قدر صاف اور سیدھی بات تھی۔ لیکن سورہ بقرہ کو اٹھا کر دیکھتے انہوں نے اس پر بھی کتنی باتیں بنائی ہیں اور کس طرح بال کی کھال نکالنی شروع کی ہے۔ یہ ہوتی ہے محکوم کی ذہنیت!



جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، مصر سے خروج بنی اسرائیل کے لئے مقصود الذات نہ تھا۔ فرعون کی محکومیت سے رستگاری اس مقصد کے لئے ہوئی تھی کہ یہ قوم صحرائے سینا کی تربیت گاہ میں اپنے اندر صالحیت کے جوہر پیدا کر لے تاکہ ارضِ مقدس (فلسطین) کی وراثت ان کے حصہ میں آجائے۔ حضرت موسیٰ انہیں سرزمینِ فلسطین کے کنارے تک لے گئے اور ان سے کہا کہ یہ ہے وہ زمین جو تمہارے خدا نے تمہارے نام لکھ دی ہے۔ اٹھو اور اس پر قبضہ کر لو۔

يَقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا  
عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خِيسِرِينَ ۝ (۵/۲۱)

لوگو! اس مقدس سرزمین میں جسے خدا نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے (یعنی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے عزم و ہمت کے ساتھ) داخل ہو جاؤ اور اٹھو اور اٹھو پچھے کی طرف نہ مٹو (کہ کامیاب ہونے کے بجائے نقصان اور تباہی میں پڑ جاؤ گے۔

لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ ضعفِ خودی سے ان پر خوف طاری تھا۔ سپاہیانہ عزم کے تصور سے ان پر رعشہ چھا رہا تھا۔ فریقِ مقابل کے آدمی انہیں دیو نظر آتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا۔

قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا فِئَةٌ قَوْمًا جَبَّارِينَ قُلْ وَإِنَّا لَنُؤْتِيكُمْهَا حَتَّىٰ  
يَخْرُجُوا مِنْهَا ۚ فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ۝ (۵/۲۲)

لوگوں نے اس کے جواب میں کہا اے موسیٰ اس سرزمین میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بہت ہی زبردست ہیں (ہم میں ان کے مقابلہ کی تاب نہیں)۔ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر وہ وہاں سے از خود نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔

ذرا غور کیجئے اس منطق پر کہ فریقِ مقابل از خود وہاں سے نکل جائے تو پھر ہم آگے بڑھیں گے! حضرت موسیٰ نے بہتیرا سمجھایا، لیکن ان پر اس پند و موعظت کا کیا اثر ہو سکتا تھا؟

قَالُوا يَمْوَلِيٰ اِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا اَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ  
اَنْتَ وَرَبُّكَ فَتَاتِلَا اِنَّا هُمْ نَا قِعْدُوْنَ ۝ (۵/۲۴)

وہ بولے لے موٹی! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں  
(اور اگر تم وہاں جانے پر ایسے ہی مصر ہونو) تم خود چلے جاؤ اور تمہارا خدا بھی تمہارے ساتھ چلا جائے  
تم دونوں وہاں اُن کے ساتھ لڑنا (جب تمہاری فتح ہو جائے میں آواز دے دینا) ہم یہاں  
بیٹھے ہیں۔

لیجئے! جو اب مل گیا کہ ہماری بہبود کی ایسی ہی تڑپ ہے تو جائیے ان لوگوں سے لڑیے اور اپنے ساتھ  
(معاذ اللہ) اپنے اس خدا کو کبھی لے جائیے جس نے فتح و کامرانی کا وعدہ دے رکھا ہے۔ ہم یہاں انتظار کرتے ہیں۔  
جب دشمن مغلوب ہو جائے تو ہمیں آواز دے لینا۔ ہم پہنچ جائیں گے۔ اللہ اکبر! کیا ذہنیت ہے غلام کی؟  
اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کیا وہ لوگ بلا محنت و مشقت وراثتِ ارض کے مستحق ہو گئے؟ کیا انہیں وہ سرزمین  
یونہی اتفاقاً مل گئی؟ بالکل نہیں۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَلْتَمِعُوْنَ فِي الْاَرْضِ  
فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ؕ (۵/۲۶)

اللہ کا حکم ہوا کہ (جب ان لوگوں کی حالت یہ ہے تو) اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان  
پر حرام کر دی گئی ہے۔ یہ اسی بیاباں میں سرگرداں رہیں گے۔ سولے موٹی تم ان نافرمان  
لوگوں کے اس مال پر غمگین مت ہو (وہ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرنا چاہتے تھے اس لئے  
وہ اس محرومی کے مستحق ہیں)۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ آب و گل کے ان تیکروں کو چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے تاکہ اس  
افیون خوردہ جماعت کا کوئی فرد باقی نہ رہے اور جب ان کی نئی نسل جن کی تربیت مصر کی محکومی کی فضا سے  
الگ کر کے کی گئی تھی، بڑھ کر جوان ہو اور وہ اپنے اندر اس صالحیت کو پیدا کر لے جو وراثتِ ارض کے لئے شرط  
ہے تو پھر ان کے ہاتھوں خدا کا نوشتہ پورا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب اس نئی پود نے اپنے اندر صالحیت

پیدا کر لی تو وہ ایک ہی جہت میں تمام منازل طے کر گئے اور استخلاف فی الارض کی مسند پر متمکن ہو گئے۔  
كَذٰلِكَ وَاوَدَّتْهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (۲۶/۵۹)

وَ اَوَدَّتْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضَعُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ  
مَغَارِبَهَا الَّتِي بَرَكْنَا فِيْهَا ۗ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى  
بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ ۗ بِمَا صَبَرُوْا ۗ (۴/۱۳۷)

اور جس قوم کو حقیر و کمزور خیال کیا جاتا تھا اسی کو ناک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے، وارث کر دیا اور اس طرح تیرے اللہ کی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی اس لئے کہ وہ ہمت اور استقامت سے جھے رہے تھے۔

یہ وراثت، صالحیت کا فطری نتیجہ تھی اور صالحیت، جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، ایمانِ محکم اور عملِ بہم سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو قرآن نے "ایقان و صبر" کی جامع اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اٰیٰتًا يُّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا فَتَّ وَ كَانُوْا  
بِاٰیٰتِنَا يُوقِنُوْنَ ۝ (۳۲/۲۴)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی قیادت کرتے تھے اور یہ اس لئے تھا کہ انہوں نے ثبات و استقامت کا ثبوت دیا اور وہ ہماری آیات پر محکم یقین رکھتے تھے۔

یہ میں داستانِ بنی اسرائیل کے وہ اجزاء جو ہمارے موضوعِ زیرِ نظر سے براہِ راست متعلق نہیں۔ اس میں استخلاف فی الارض (وراثتِ زمین) کے سلسلے کی دو متمیز کڑیاں سامنے آتی ہیں ایک وہ جسے ابتدائی حصہ کہنا چاہیے جس میں غیروں کی محکومیت سے اس لئے رستگاری ملتی ہے کہ اس قوم کو اپنی صلاحیتوں کے نمود و ارتقا کے لئے امکانی مواقع مل جائیں۔

## بخوشن نگر

لہ داستانِ بنی اسرائیل اپنے اندر عبرت و موعظت کے ہزار سامان رکھتی ہے اور ہمارے حالات پر تو یہ اس طرح منطبق ہوتی ہے کہ جو باریک بین نگاہ سے دیکھے گی، میا ختہ پکار اٹھے گی کہ — "ارے دل یہ تو اپنی داستانِ معلوم ہوتی ہے" — اس داستان کی تفصیل "بروقطود" میں ملیں گی۔

اور دوسرا حصہ وہ ہے جس میں صالحیت کی پختگی کے بعد وہ قوم دراثتِ ارض کی مستحق قرار پاجائے۔ حصولِ صالحیت کا ابتدائی مرحلہ ہوا استخلاف و وراثت کا ثانوی حصہ دونوں میں مواقع اس لئے ہم پہنچائے جاتے ہیں کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ قوم اس قدرت و اختیار سے کس طرح فائدہ اٹھاتی ہے۔ پہلے مرحلہ میں یہ دیکھ لیا جائے گا کہ وہ قوم اپنے اندر حکومت کی صلاحیت پیدا کرتی ہے یا نہیں۔ اور دوسرے میں یہ کہ قوت و اختیار ملنے کے بعد وہ قوم اس کا استعمال صحیح طور پر کرتی ہے یا نہیں۔ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے جبکہ وہ ابھی فرعون کے زیرِ حکومت تھی کہا: **وَاسْتَخْلَفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُونَ** ۵ (۱۲۹/۷) قریب ہے کہ اللہ تمہیں استخلاف

فی الارض عطا کر دے پھر دیکھے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو، اور قوم محمد رسول اللہ سے کہا گیا کہ **وَلَقَدْ أَهَلَكْنَا الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۗ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۗ كَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۝** (۱۲-۱۱۳/۱۰)

اور یقیناً ہمارے قانونِ مکافات عمل نے تم سے پہلے کئی نسلوں کو ہلاک کر دیا۔ جب ان کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ (جہادِ عدل و انصاف سے ہٹ کر) ظلم کرنے لگ گئے (حالانکہ ان کے رسولؑ کے پاس واضح حقائق لے کر بھی آئے لیکن بایں ہمہ ایسا نہ ہوا کہ وہ ایمان لے آتے۔ اس طرح ہم مجرم اقوام کو سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین کی حکومت عطا کی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح کا عمل کرتے ہو۔

لہذا امکانی مواقع یا قوت و اختیار کے خزانے اس لئے ملتے ہیں۔ **لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ**۔ تاکہ دیکھا جائے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

**ہماری حالت** | ان اصول و مبادیات کو سمجھ لینے کے بعد اب اپنی موجودہ حالت کی طرف آئیے اور اسی آئینے میں اسے بھی دیکھئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی سر زمین ہمیں بغیر صلاحیت کے مل گئی ہے۔ یہ ہماری سعی و عمل اور تگ و تاز کا نتیجہ نہیں، ہمارے اندر قطعاً وہ داخلی تبدیلیاں پیدا نہیں ہوئیں جن کا مظہر خارجی تبدیلیاں ہوا

کرتی ہیں۔ کیا عوام اور کیا خواص ہم سب اسی سطح پر کھڑے ہیں جہاں اس سے پہلے تھے۔ صلاحیت تو بڑی چیز ہے، ہم میں تو وہ صلاحیت و استعداد بھی پیدا نہیں ہوئی جو محض مادی قوتوں کی بنا پر حصولِ مملکت و سلطنت کے لئے زندہ رہنے کی متمنی قوموں میں پیدا ہو کرتی ہے۔ ان قوموں کی تاریخ پر نگاہ ڈالنے جنہوں نے اپنے اغراض و منافع اور ذاتی مقاصد و مطامع کی خاطر دوسروں کے نظامِ سلطنت سے رستگاری حاصل کرنے یا اپنے تصورات کے مطابق بساطِ حکومت بچھانے کے لئے جدوجہد کی اور پھر دیکھتے کہ اس باب میں انہیں کیا کیا مصائب برداشت کرنے پڑے اور انہوں نے ان سب شدائد و نوائب کا کس یا مردی و استقامت، حوصلہ اور ہمت، عزم و استقلال سے مقابلہ کیا۔ اور اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر کس طرح مستانہ و جانفروشانہ انداز سے ہر مخالف قوت کی صفیں چیرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ابھی کل کی جنگِ عمومی کو دیکھتے۔ محض ملکی حفاظت اور قومی اجارہ داریوں کی حصارت کے لئے مختلف اقوامِ مغرب نے کس کس ایثار و قربانی سے نامساعدتِ حالات کا مقابلہ کیا۔ ان سب حقائق کو سامنے رکھتے اور ————— بازجویشتن نگر۔۔۔ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ہم میں فی الواقع عام قومی خصائص بھی پیدا نہیں ہوئے، چہ جائیکہ ہمارے اندر صفاتِ الہیہ منعکس ہوں اور ہم صہغۃ اللہ کے مشہود پیکر دکھائی دیں۔

بادمے نہ رسیدی خدا چہ می جوئی!

گذشتہ ابتلا و انتشار (یعنی تقسیم ہند کے قیامت خیز حوادث) میں ہم نے ایک طرف جس عدم تدر اور افلاسِ نظر اور دوسری طرف جس فقدانِ ضبط و استقامت اور صرمانِ عزم و ثبات کا مظاہرہ کیا ہے۔ نہیں! اس سے بھی آگے بڑھتے۔ ہم نے ایک طرف جن کفن دزدیوں اور مردار خوریوں جن یوسف فریڈل اور یعقوب فریڈل اور دوسری طرف جن افراتفریوں اور نفسا نفسیوں جن ضابطہ شکنوں اور آئین فراموشیوں کا ثبوت دیا ہے وہ اس حقیقت کی زندہ شہادتیں ہیں کہ ہم اس وقت زندہ قوموں کے زمرہ میں شمار ہونے کے قابل اور حکومت و مملکت کے مستحق کہلانے کے اہل قطعاً نہیں۔ لہذا غیروں کی محنت سے نجات اور اس خطہٴ زمین کی موہبت محض انعاماً و احساناً ہوتی ہے جس طرح بنی اسرائیل کی فرعون کی غلامی سے رہائی اور سینا کی وادیوں میں پرچم کشائی محض اعزازاً و اکراماً ہو گئی تھی۔ اس کے لئے خدا کی طرف سے کیا اسباب و ذرائع پیدا کئے گئے اور احوال و ظروف کس طرح ایک خاص بیج و ترتیب پر تشکیل ہوتے چلے گئے یہ ایک الگ بحث ہے۔ حقیقت یہی ہے (جو اس وقت ہمارے سامنے ہے) کہ یہ

نتائج جو اس طرح مرتب ہوئے ہیں ہماری استعداد و اہلیت کا ماحصل اور ہماری سعی و کوشش کا ثمرہ نہیں ہیں۔ یہ ہمیں بلا مزد و معاوضہ اور بلا محنت و مشقت خدا کی طرف سے احساناً ملے ہیں۔ اور ملے اس لئے ہیں لہذا نظر کیف تعامون (تاکہ دیکھا جائے کہ ہم کیسے کام کرتے ہیں)۔ غیروں کی حکومت میں ہمیں وہ مواقع حاصل نہیں ہو سکتے تھے جو اس صلاحیت کو پیدا کر سکیں جو دراثتِ ارض کے لئے بنیادی شرط ہے۔ یہ خطہ زمین انہی مواقع (OPPORTUNITIES) کو بہم پہنچانے کے لئے عطا ہوا ہے۔ یہ کھلا میدان اس لئے دیا گیا ہے کہ لہذا نظر کیف تعامون (تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ ہم کیسے کام کرتے ہیں)۔



جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، صلاحیت مشروط ہوتی ہے ایمان اور عملِ صالح سے۔ چنانچہ سورہ عنکبوت میں ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ۝

(۲۹/۹)

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور (اس کے ساتھ) صالح العمل ہوتے ہیں تو ہم ان کو لقیلاً صالحین کے زمرہ میں شامل کریں گے۔

ایمان کے معنی ہیں زندگی کا متعین نصب العین، منتہائے نگاہ، مطمح نظر، منزل مقصود اور اس نصب العین کے برسرِ حق ہونے پر یقین محکم۔ اور اعمالِ صالح کے معنی ہیں ایسا عملی پروگرام جو اس نصب العین کے حصول کے لئے ضروری صلاحیتیں پیدا کر دے اور جس سے معاشرہ میں بہواریاں پیدا ہوتی چلی جائیں۔

اس حقیقت کو قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ ایک برسرِ حق نصب العین کے حصول کی راہ پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کی روش ہے۔ اس میں بڑی بڑی تکالیف کا مقابلہ اور شدید مصائب کا سامنا ہوگا۔ مومن وہی ہے جو ان مصائب کو مردانہ وار برداشت کرے۔ جو اس راہ میں تکالیف سے جی چراتے وہ مومن نہیں۔ قرآن کی رو سے منافق ہے۔ چنانچہ آیہ مندرجہ صدر کے ساتھ ہی فرمایا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ ۗ وَلَئِن جَاءَ نَصْرٌ مِّن رَّبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۗ أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ۝



وَلْيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلْيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِينَ ۝ (۱۱-۲۹/۱۰)

اور لوگوں میں سے وہ کبھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں لیکن حالت یہ ہوتی ہے کہ جب اللہ (کی راہ) میں دکھ اٹھانا پڑتا ہے تو لوگوں کی طرف سے آنے والی مصیبتوں کو اللہ کا عذاب سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر تیرے اللہ کی طرف سے نصرت آئے تو اس (فتح و کامرانی کے وقت) پکار اٹھتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں کیا اللہ نہیں جانتا جو اہل جہان کے سینوں میں ہے (ضرور جانتا ہے)۔ اور اللہ یقیناً مومنین کو بھی دیکھ لے گا اور منافقین کو بھی۔

لہذا صالحیت کے لئے پہلی شرط جسمانی قربانی ہے اور دوسری شرط مالی ایثار جس کے متعلق فرمایا۔  
وَأَنْفَقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَنَّكُمْ الْمَوْتُ  
فَيَقُولُ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ لَّفَاصَّدَقَ وَ أَكُنُّ  
مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ (۱۰-۶۳)

اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اسے اس کے نظام کے قیام کے لئے کھلا رکھو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو اور وہ اس وقت کہے کہ یا اللہ! تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی تاکہ میں مال خرچ کرتا اور اس طرح صالحین میں سے ہو جاتا۔

ظاہر ہے کہ یہ اذیتیں اور مشقتیں مخالفین کے مقابلہ سے پیدا ہوں گی۔ یہ مخالفت دو اطراف سے ہوگی۔ ایک تو خارجی دشمنوں کی طرف سے جو اس امکانی قدرت کو بھی گوارا نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس خطہ زمین پر خدا کے قانون کے مطابق حکومت متمکن ہوگئی تو ان کا باطل آگیاں نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ باطل اپنی بنیادی کمزوریوں سے خوب واقف ہوتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ نظام حق و صداقت کے قیام کی مخالفت میں پوری سعی و کوشش سے کام لیتا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفوی سے شرار بولہبی!

لہذا پاکستان کے مسلمانوں کو سب سے پہلے ان خارجی اعدا کی مکارانہ سازشوں اور محارباتِ مخالفت منصوبوں کے مقابلہ کے لئے ہر وقت مستعد رہنا ہوگا اس لئے کہ اگر ان کی کمزوری یا لاپرواہی سے خدا نہ کردہ ان کے مشنوم عوام برے کار آگئے تو یہ امکانی قدرت جسے صالحیت یعنی دراشت

ارضی کے حصول کا ذریعہ بننا ہے، یہیں ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اور کس قدر سوختہ سماں اور شوریدہ بخت ہے وہ قوم جس کی جھولی میں پڑی ہوئی ایسی متاعِ گراں بہا اس طرح سے چھن جائے!

خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بدنہ دکھلائے  
و یلیت نی مت قبل ہذا و کنت نسیا منسیا

لیکن ان خارجی دشمنوں سے کہیں زیادہ شدید مخالفت خود اپنوں کی طرف سے ہوگی جو اس انقلاب سے اس لئے مخالف ہوں گے کہ اس میں انہیں اپنی ملمع کارانہ سیادت اور ابلہ فریبانہ قیادت کی موت نظر آئے گی۔ یہی وہ گروہ ہے جو ہر زمانہ اور ہر قوم میں ہر دعوتِ انقلابِ حق و صداقت کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے اور قرآن نے جسے مترفین کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ مترفین کے عناصر ترکیبی ان کے نفسیاتی میلانا اور ذہنی رجحانات، ان کے خصائص و لوازم، ان کے مقاصد و عزائم کیا ہوتے ہیں، یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ سہر دست صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ مترفین کے مفہوم میں 'تن آسان' سہل انگار، نفس پرست، عیش پسند، دوسروں کی کمائی پر آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے کے عادی، سب داخل ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ ہر رسول کی دعوتِ انقلاب کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهُمْ إِنَّا بِمَا  
أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝ (۲۴/۲۴)

ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا۔ مگر اس کے مترفین نے کہا کہ ہم تمہارے پیغامِ صداقت سے انکار کرتے ہیں۔

سرداعی حق و صداقت کا پیغام انقلاب آفریں و حریت بخش ہوتا ہے۔ وہ انسانی ذہنوں کے تراشیدہ نظامِ ہائے زندگی کو الٹ کر ان کی جگہ قوانینِ خداوندی کے مطابق نظامِ حیات قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نظام کے ممکن ہیں ان مترفین کو جو پستہا پستہ سے دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی نرم و نازک زندگی بسر کرتے چلے آتے ہیں، اپنے لئے پیغامِ موت نظر آتا ہے، اس لئے کہ ان کی تن آسانیاں اور سہل انگاریاں انہیں کسی تبدیلی حالات کے قابل نہیں چھوڑتیں۔ بنا بریں ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس نہج و اسلوب پر قوم کا نظامِ معاشرت و تمدن چلا آ رہا ہے اسی پر چلتا جائے۔

وَكَذَلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّنْ ذُنُوبٍ إِكْثَارٍ  
 قَالَ مُتْرَفُوهَا « إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ  
 مُّقْتَدُونَ » (۲۳/۲۳)

اور اس طرح ہم نے (اے رسولِ عربی) تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا کہ  
 اس کے مترفین گروہ نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آباء اجداد کو جس روش پر چلتے دیکھا ہے اسی  
 کی تقلید میں ہم (نجات و سعادت کی راہ دیکھتے) ہیں۔

یہی وہ قوم کے اکابر ہیں جو ہر دعوتِ انقلاب کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز اٹھاتے ہیں، اس لئے کہ  
 انہوں نے اپنی ساحرانہ فسول طرازیوں اور شاطرانہ فریب سازیلوں سے قوم کو کھایا یا یہ ہوتا ہے کہ تم  
 مرو تا کہ ہم زندہ رہیں، تم کماؤ تا کہ ہم تن آسانی کی زندگی بسر کریں، تم دکھ جھیلو تا کہ ہم شکر اٹھائیں، تم سنو  
 تو ہمارے قانون سے، دیکھو تو ہماری آنکھوں سے، سوچو تو ہمارے دماغوں سے، سمجھو تو ہمارے دلوں کی راہ  
 سے۔ چراغِ تمہارے ہوں، راتیں ہماری، زبان تمہاری ہو باتیں ہماری۔ تمہارے پسینے سے ہمارے  
 گلستانوں میں آبیاریاں ہوں اور تمہارے خون کی رنگینی سے ہمارے ایوانوں میں گلکاریاں۔ اس لئے ہر  
 وہ تبدیلی جس میں سر بخاکِ غریب کے لئے سامانِ زیست میسر ہو، ان کے لئے پیامِ موت ہوتی ہے۔ لہذا ان  
 کی طرف سے مخالفت یقینی۔ یہی ازل سے ہوتا آ رہا ہے، یہی ابد تک ہوتا رہے گا۔ آج سے پانچ ہزار سال  
 پیشتر جب صحرا زمین میں سب سے پہلی مرتبہ یہ آواز، حضرت نوح کی زبان سے  
**مترفین کا گروہ** اٹھی، تو انہی اکابر نے اس کی مخالفت کی۔

قَالَ الْمَلَأُ مِنَ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرُكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۷۶/۷۶)

اس کی قوم کے اکابر نے کہا کہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تو (اس دعوتِ انقلاب میں) ایک  
 کھلی ہوئی گمراہی پر ہے۔

اسی پیغام کو جب حضرت ہود نے دہرایا تو مخالفت کی اس صدائے بازگشت نے اسی دعوت کی مزاحمت  
 کی۔

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرُكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا  
 لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ (۷۶/۷۶)

اس کی قوم کے اکابر نے جنہوں نے اس دعوت کی صداقت سے انکار کیا تھا کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ تو حماقت میں مبتلا ہے اور جو کچھ کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔

یہی وہ اکابرین قوم تھے جنہوں نے حضرت صالح کی اس پکار کی مخالفت میں آواز اٹھائی۔

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا اِنَّا بِالَّذِي آمَنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۷۶/۷۶)

اس قوم کے متکبرین نے کہا کہ جس بات پر تم ایمان لاتے ہو ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔

یہی جواب حضرت لوطؑ کو ملا (۷۶/۸۳) اور اسی رنج سے حضرت شعیبؑ کی دعوتِ انقلاب کا استقبال ہوا۔ یہی وہ اکابر و جبار قوم تھے جنہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جھونک دینے کی ٹھانی تھی اور یہی قوم فرعون کے وہ مشکبرین و مترفین تھے جنہوں نے فرعون کو حضرت موسیٰؑ کے قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہی وہ سیادت و قیادت کے اجارہ دار تھے جنہوں نے جناب مسیحؑ کو حوالہ دار و رسن کرنے کی سازش کی تھی، اس لئے کہ وہ خدا کی بادشاہت کو غریبوں کا حصہ بتاتے تھے اور یہی وہ رؤساء و امارا عرب تھے جنہوں نے تمام عمر اس دعوتِ آسمانی کی سخت ترین مزاحمت و مخالفت کی جو حکومت و سلطنت کی کنجیاں مترفین سے چھین کر متقیوں کو دینے کے لئے بلند ہوئی تھی۔ یہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہوگا۔ اس خطہ زمین پر جسے ہم پاکستان سے تعبیر کرتے ہیں، جب اس انقلابِ صحیحہ کی آواز اٹھے گی جو قوم میں صالحیت کا موجب بنے گا اور جس میں عزت و تکریم اور سیادت و امارت کے پیمانے بدل جائیں گے، تو اس کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز انہی مترفین کی طرف سے ہوگی جو آج اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق از خود واجب الاحترام بنے بیٹھے ہیں اور جن کی کیفیت یہ ہے یحبون ان یحبوا و یا یحبوا بما لہم یفعلوا (۳/۱۸۹) وہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ وہ محض زبان سے کہتے ہیں لیکن کرتے نہیں ان کے لئے ان کی تعریف کی جائے انہیں مستقلاً مسانیدِ عظمت و منابر عقیدت پر بٹھائے رکھا جائے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کی طرف سے اس نظامِ نُو کی طرف دعوت دینے والی ہر آواز کی مخالفت ہوگی۔ چونکہ اس زمانہ کی فضا میں عہدِ کھن کے شخصی استبداد کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے سیاستِ حاضرہ کے تقاضے یہ ہیں کہ زبان سے تغلب و تفوق اور استیلاء و استبداد کی مخالفت کی جائے لیکن نظام اس قسم کا قائم کیا جائے جس میں وہی تغلب و استیلاء موجود ہو۔ یعنی روح وہی ہے لیکن اس کے پیکر بدل چکے ہیں۔ لات و منات وہی ہیں فقط ان کے لباس میں تبدیلی آگئی ہے۔

بے وہی سازِ کھن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیواستبدادِ جمہوری قبائیں پائے کوب  
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے یہ سلم پری

فلہذا پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے یہ دوسرا مرحلہ پہلے سے بھی زیادہ ہمت طلب اور حوصلہ آزما ہے۔ اگر انہوں نے اس باب میں جرات و بسالت اور ثبات و استقامت سے کام نہ لیا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکے گا کہ یہ بھی اس قسم کی حکومت قائم کر لیں جیسی دنیا کی اور قومیں قائم کئے بیٹھی ہیں۔ لیکن یہ قرآنی استخلاف فی الارض نہیں ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی حکومت بہر حال وہہر کیفیت غیروں کی حکومت کے مقابلہ میں ہزار آئیں سو دمند ہوتی ہے، اس لئے وہ زندگی اس سے پیشتر کی زندگی سے یقیناً بہتر ہوگی۔ لیکن قرآنی زندگی نہ یہ پہنچے تھی نہ یہ دوسری ہوگی۔ پہلی زندگی میں یہ معذوری تھی کہ ہمیں وہ امکانی مواقع میسر نہیں تھے جن سے ہم اپنے تصوراتِ صحیحہ کے مطابق نظامِ حکومت قائم کر سکتے، لیکن اب امکانی قدرت کے میسر آجانے سے وہ عذر باقی نہیں رہا۔ اب ہمارے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہ ہوگا کہ ہم نے اپنی زندگی کی عمارت کو قرآنی خطوط پر استوار کیوں نہ کیا؟ قرآنی نقطہ نگاہ سے حکومت تبدیل بہ استخلاف و "وراثت" اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ اس نظام کے قیام کا ذریعہ بنے جسے خالق کائنات نے نوعِ انسانی کے لئے تجویز کیا ہے اور جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

الَّذِينَ إِذَا مَنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ  
وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَبِاللَّهِ عَاقِبَةُ  
الْأُمُورِ (۲۲/۴۱)

یہ (صالحین) وہ لوگ ہیں کہ جب ہم انہیں تمکن فی الارض عطا کریں گے تو وہ نظامِ صلوة و زکوٰۃ کو قائم کریں گے۔ معروف احکام نافذ کریں گے اور نواہی سے روکیں گے۔ اور تمام امور کا آخری فیصلہ خدا کے قوانین کے مطابق ہوگا۔

نظامِ صلوة و زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایسی محیط کل اور ہمہ گیر اصطلاحات ہیں جن میں سے ہر ایک بتبیین و تشریح اور تفصیل و توضیح کے لئے مستقل ابواب کی محتاج ہے۔ اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ قرآنی نظام کی پوری کی پوری بساطِ حکومت اپنی چار گوشوں کے اندر سمٹ کر آگئی ہے۔ نظامِ صلوة ان میں عمودی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے درحقیقت وہ معاشرہ قائم ہوتا ہے جو تا نوعِ انسانی

کی ربوبیت کا فیصل اور عالمگیر نشوونما کا ضامن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مقام پر قرآن کے نظامِ صلوة کے ضائع ہوجانے کو نعمائے الہیہ کے چھن جانے کا موجب قرار دیا ہے۔ سورۃ مریم میں دیکھئے، منعّم علیہ حضرات (علیہم السلام) کے تذکارِ جلیلہ کے بعد فرمایا۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ  
فَسُوفَ يَلْقَوْنَ عَذَابًا ۝ (۱۹/۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین ہوتے جنہوں نے نظامِ صلوة کو ضائع کر دیا اور اپنی خواہشات ہی کا اتباع کرنے لگ گئے۔ سو وہ ہلاکت اور بربادی کو پالیں گے۔

یہی ہیں وہ جن سے استخلاف فی الارض کی سی نعمت چھن جاتی ہے۔ اور کیسے سوختہ بخت ہیں وہ لوگ جن سے ایسی متاعِ عزیز اس طرح چھن جائے؟ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبِ  
مِّنَ اللَّهِ۔



یہ ہے صالحیت پیدا کرنے کا نظام جس کا فطری نتیجہ وراثتِ ارض ہوتا ہے۔ اسے پیش نظر رکھتے اور پھر ایک نگاہ اپنے اوپر ڈالنے اور ایسا کرتے وقت بنی اسرائیل کی اس واژگوں بخت قوم پر بھی نگاہ ڈالنے جس کے مقدرات کے ڈوبتے ہوئے ستارے ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں۔ ان کی یہ حالت تھی کہ ذرا سی تکلیف آئی اور وہ لگے بڑبڑانے۔ کوئی بات خلافِ منشا پیش آگئی اور وہ بیٹھ گئے منہ بسور کر۔ قدم قدم پر یہ طعن کہ ہمیں خواہ مخواہ مصر سے نکال کر لے آئے اس سے تو ہم فرعون کی غلامی میں اچھے تھے۔ اور یہاں کیا حالت ہے؟ اگلے دنوں میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ کالی جھنڈیاں لئے "پاکستان مر وہ باد" کے نعرے لگاتے جلوس کی شکل میں چلے جا رہے تھے۔ ایک سے پوچھا کہ کیوں؟ کیا پات ہے؟ کہنے لگا "میاں! تین دن ہو گئے پانی کا نل بند پڑا ہے، کوئی سنٹا ہی نہیں جہنم میں گیا ایسا پاکستان اور بھاڑ میں گئی اسلامی حکومت، کچھ وہاں مر گئے اور جو باقی رہ گئے ہیں یہاں مارے جا رہے ہیں" دیکھئے یہ داستان کس طرح صرفاً عرفاً بنی اسرائیل کی داستان سے ملتی ہے اور قوم کس طرح ذرعاً ذرعاً اور شبراً شبراً ان کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ جس شخص سے بات کیجئے ایسا معلوم ہوگا گویا اس نے پاکستان میں آکر کسی کی بھفت پشت ہفتاد نسل پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوم کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن ان مصیبتوں کی برواشت میں ان کی طرف سے کچھ اس قسم کی ذمہ داری کا مظاہرہ ہو رہا

ہے گویا یہ مصیبتیں کسی اور کی خاطر مفت میں جھیل رہے ہیں۔ انہیں قطعاً اس کا احساس نہیں کہ انہیں ایک ملکِ عظیم عطا ہوا ہے تاکہ وہ اس پر اپنی حکومت قائم کریں اور اگر انہوں نے ان مصائب اور تکالیف کو ہمت اور حوصلہ سے برداشت کر لیا تو دنیا بھر کی سرفرازیوں اور سر بلندیاں ان کے قدم چومیں گی۔ یہ عوام کا حال ہے۔ خواص کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس خطہ زمین کے مل جانے سے سب کچھ مل گیا ہے۔ اب کچھ کرنے کا کام باقی نہیں رہا۔ ہندوؤں کی یہ چند روزہ غوغا آرائی ختم ہو جائے تو وہ تختِ جہانداری و سریرِ جہان بینی پر کامل امن و سکون سے متمکن ہو جائیں گے۔ وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر  
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دُعا کے بعد

یاد رکھتے! یہ خطہ زمین بجائے خویش کوئی شے نہیں۔ نہ یہ اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہے نہ ہی ہم اس کی مٹی میں دفن ہونے سے جنت الفردوس کے مستحق بن سکتے ہیں۔ یہ محفوظ اسی صورت میں رہ سکتا ہے کہ آپ اپنے خون سے اس کی حفاظت و صیانت کا سامان بہم پہنچائیں اور پھر اس طرح محفوظ و مصون ہونے کے بعد یہ جنتِ ارضی میں اسی صورت میں تبدیل ہو سکتا ہے جب آپ اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے اس پر خدا کی حکومت کا تختِ اجلال بچھائیں۔ یہی وراثتِ ارض کا ابدی قانونِ صالحیت ہے اور خوف و حزن سے مامونیت و مصونیت صرف اس کے لئے مقدر کی گئی ہے جو قانونِ الہیہ کی نگہداشت کرے اور اس طرح اصلاح بن جائے۔

فَمَنْ اتَّقَىٰ وَاصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۷/۲۵)

پس جو کوئی (قوانینِ خداوندی کی) نگہداشت کرے اور اپنے اندر صالحیت پیدا کر لے اس کے لئے نہ کوئی خوف ہے نہ غم۔

وَذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔



# قرآن اور تاریخ

(نوشتہ اکتوبر ۱۹۵۷ء)

دنیا نے انسانیت میں جو اہمیت تاریخ کو حاصل ہے وہ اربابِ فکر و بصیرت سے پوشیدہ نہیں حقیقت یہ ہے کہ حیوان اور انسان میں ایک بڑا امتیازی نشان تاریخ ہے۔ حیوانات کی حالت یہ ہے کہ وہ ہزار ہا سال گزرنے کے بعد بھی اسی مقام پر ہوتے ہیں جہاں ان کی نوع کا پہلا حیوان تھا (مثلاً) جو ہرن آج ہمارے سامنے آتا ہے وہ انہی صلاحیتوں اور خاصیتوں کا حامل ہوتا ہے جو دس ہزار سال پہلے کے ہرن میں پائی جاتی تھیں۔ لیکن (اس کے برعکس) آج کا انسان (صلاحیتوں اور خاصیتوں، نیز احوال و ظروف کے اعتبار سے) دس ہزار سال پہلے کے انسان سے یکسر مختلف ہے۔ دس ہزار سال پہلے کا انسان آگ تک جلانا نہیں جانتا تھا۔ اسے گھر بنانا نہیں آتا تھا۔ اس کے پاس نہ کسی قسم کے ادرا اور ہتھیار تھے نہ آلات و ادوات۔ اس کی زندگی قریب قریب حیوانات کی سی زندگی تھی۔ لیکن آج کا انسان چاند تک پہنچنے کی فکر میں ہے۔ آج ہمارے بچے اتنا کچھ جانتے ہیں جتنا آج سے سو سال پہلے کے عالم نہیں جانتے تھے۔ سو سال تو ایک طرف جو باتیں ہمارے بچپن میں طلسم بوش ربا کے افسانے اور الہ دین کا چراغ معلوم ہوا کرتی تھیں، وہ آج روزمرہ کا معمول بن چکی ہیں انسان کی یہ ترقی کس بنا پر ہے؟ محض اس بنا پر کہ ایک نسل یا ایک زمانہ کا انسان اپنے تجربات اور مشاہدات کو اگلی نسل تک منتقل کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (اور حیوانات میں یہ صلاحیت نہیں) اسی کو تاریخ کہتے ہیں۔ انسان کی تمام ترقیوں کا راز اسی میں مضمر ہے۔ زمانہ اپنے ارتقائی منازل اسی کے سہارے طے کرتا آ رہا ہے۔ تہذیب و تمدن کی متاع گراں اور علم و ہنر کی شمع فروزاں جب اور جہاں نظر آئے گی تاریخ ہی کی رہین منت ہوگی۔ تاریخ کیا ہے؟ قرنہا قرن کی انسانی جدوجہد کا حاصل۔ ہزار ہا سال کی



**تاریخ کیا ہے؟** | مسلسل تگ و تاز کا پھوڑا۔ اقوام و ملل کی سینکڑوں پشتوں اور نسلوں کا اندوختہ انسان کے قلب و دماغ کی کاوشوں کا سیلِ رواں ہوا اپنے سرچشمہ کے قریب ایک جوئے کم آب سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا حد و فراموش ہوتا گیا۔

خارجی مشاہدات و تجربات سے ہٹ کر انسانی معاشرہ کی طرف آئیے تو اقبال کے الفاظ میں 'ایک قوم کے لئے تاریخ کی حیثیت وہی ہے جو ایک فرد کے لئے حافظہ کی ہے۔ اگر کسی فرد کا حافظہ گم ہو جائے تو اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی قوم کی تاریخ صفحہ ہستی سے محو ہو جائے تو خود اس قوم کا وجود بہ حیثیت قوم ختم ہو جاتا ہے۔ قومیں اپنے ماضی کے پشتارے کو اپنی کمر پر لادے لادے آگے بڑھتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انسان اپنے تاریخی سرمایہ یعنی ماضی سے مسلسل چلے آنے والے اور بڑھتے رہنے والے اندوختہ سے جو اس قدر فیضیاب ہوتا ہے تو کس طرح ہوتا ہے؟ اس کا راز کیا ہے؟ اس کا راز یہ ہے کہ

**تاریخ کی افادیت کا راز** | کائنات میں خدا کے غیر تبدیل قوانین کا فرمایاں اس لئے جس بات کا جو نتیجہ آج سے ہزار سال پہلے برآمد ہوا تھا، وہی بات اگر آج دہرائی جائے گی تو اس کا وہی نتیجہ مرتب ہو جائے گا۔ آج سے (مثلاً) پانچ ہزار سال پہلے کے انسان نے دیکھا کہ جو شخص سنکھیا کھا لیتا ہے، مر جاتا ہے۔ اس نے اس تجربہ (یا مشاہدہ) کو آگے منتقل کر دیا۔ لہذا ہم حتم و یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر آج بھی کوئی شخص سنکھیا کھائے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔

پھر جو کیفیت طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) کی ہے، وہی ان قوانین کی ہے جن کا تعلق انسان کی حیات اجتماعیہ سے ہے۔ جن قوانین کی خلاف درزی سے آج سے دو ہزار سال پہلے کی قومیں تباہ و برباد ہوتی تھیں، ان سے رُوگردانی کا نتیجہ آج بھی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ جن قوانین کے اتباع سے اس زمانے میں زندگی اور توانائی ملتی تھی ان سے متمسک رہنے کا نتیجہ آج بھی سر بلندی و مرفراز ہوگا۔

یہ کلیہ کہ جو عمل ایک دفعہ ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس سے ہر بار ویسا ہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے، سائنس کہلاتا ہے۔ آج ہم تاریخ کی سائنس (SCIENCE OF HISTORY) یا تاریخ بہ حیثیت سائنس کے الفاظ عام طور پر سنتے ہیں۔ لیکن دنیا میں سب سے پہلے جس نے تاریخ کو اس حیثیت سے پیش کیا، وہ قرآن تھا۔ قرآن سے پہلے ازل تو تاریخ مرتب کرنے کا عام رواج ہی نہ تھا۔ مورخین یونہی

کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ پھر ان کے نزدیک تاریخ سے مقصود وقائع نگاری (یعنی واقعات و حوادث کو اکٹھا کر دینے) سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ تاریخ کو بحیثیت ایک سائنس کے پہلی مرتبہ قرآن نے پیش کیا ہے۔ اور ایک تاریخ ہی پر کیا منحصر ہے۔ قرآن نے اپنے ہر دعوے کو سائنس کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ کالرج نے کہا ہے کہ شاعری (POETRY) کی بدمقابل (ANTI-THESIS) نثر (PROSE) نہیں سائنس

سائنس آف ہسٹری ہے۔ قرآن نے جب اپنے متعلق کہا ہے کہ میرے ہاں شاعری نہیں تو اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ کتاب نثر میں لکھی گئی ہے۔ شعر میں نہیں

لکھی گئی۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس کا ہر دعوے سائنس کے اصولوں پر پورا اترے گا یونہی شاعرانہ ادعا ثابت نہیں ہوگا۔ بہر حال ہم کہہ رہے تھے کہ تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآن نے پیش کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن تاریخ کے مطالعہ پر اس قدر زور دیتا ہے۔ اس نے کہا کہ

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِّمَنْ يَتَّقِيهَا مِنْ الْقَوْمِ سَابِقَةَ الْأَنْبِيَاءِ لِيُذَكِّرَ الَّذِينَ نَسُوا مَا فِي الْقُرْآنِ مِنْ حِكْمٍ ۚ وَكَانَ الْبَاقِيَ

مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝ (۲۴/۳۴) یعنی ان لوگوں کے لئے جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچنا چاہتے ہیں، سامانِ عبرت و موعظت۔ یعنی خدا کے غیر تبدیل قوانین جنہیں نوعِ انسان کے لئے ضابطہ ہدایت بنا رہے اور ان کے ساتھ تاریخی امثال و نظائر دونوں منزل من امتدیں۔ اس سے آپ نے اندازہ لگایا کہ قرآن کی رو سے اقوام سابقہ کی تاریخ کی اہمیت کیا ہے؛ قرآن میں اہم گذشتہ کے احوال و ظروف کا

مذکرہ جو اس شدت و تکرار سے آیا ہے تو اس سے مطلب

قرآن اور تاریخ کا مطالعہ

ہی یہ ہے کہ وہ اُس ضابطہ ہدایت کی زندہ شہادت ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کامیا بیاں اور کامرانیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اور جن کی خلاف ورزی سے تو میں ہلاکت اور تباہی کے جہنم میں جا گرتی ہے۔

اسی حقیقت کو قرآن نے سورہ حجر میں ایک اور انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ نے یہ الفاظ اکثر و بیشتر

سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي سنے ہوں گے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے" (HISTORY REPEATS ITSELF) اس کے یہ معنی نہیں کہ تاریخ کے

واقعات اسی شکل و صورت میں بار بار سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ بار بار اس

حقیقت کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ فلاں انداز زندگی کا نتیجہ فلاں قسم کا ہوگا اور فلاں روش کے عواقب فلاں نوعیت کے۔ تاریخ کے اپنے آپ کو اس طرح دُہرانے کا تصور بھی پہلے پہل قرآن نے پیش کیا۔ سورہ حجر میں اقوام سابقہ کا تذکرہ اسی زاویہ نگاہ سے پیش کرنے کے بعد کہا ہے کہ **وَلَقَدْ أَتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَلِيَّاتِ وَ الْقُرْآنِ الْعَظِيمِ (۱۵/۵۷)**۔ مَثَلِيَّاتِ کے معنی ہیں وہ چیز جو بار بار دہرائی جاتے یعنی تاریخی شواہد۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہم نے تجھے ایک تو زندگی کے وہ بنیادی اصول دیئے جن کے مطابق اعمالِ حیات اپنا نتیجہ مرتب کرتے ہیں اور دوسرے وہ متعدد تاریخی واقعات جو اس امر کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ ان قوانین سے فی الواقعہ اسی قسم کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

یہ تاریخی نظائر اس لئے دیئے ہیں تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ فلاں قوم نے اس قسم کی روش اختیار کی تو اس کا انجام کیا ہوا۔ سورہ مومن میں ہے **أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ**۔ کیا یہ لوگ دنیا کے مختلف حصوں میں چلے پھرے نہیں کہ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ جو قومیں ان سے پہلے گزری ہیں ان کا انجام کیا ہوا تھا؟ اس میں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن کے نزدیک تاریخ کا مطالعہ لائبریریوں کے اندر کتابیں پڑھنے ہی سے نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ کا طالب علم ان قوموں کے دیار و امصار میں جائے اور ان کے اُجرے ہوئے کاشانوں کے کھنڈرات سے ان کے عروج و زوال کی داستانیں مرتب کرے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ **كَانُوا أَكْثَرًا مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَ أَثَارًا فِي الْأَرْضِ**۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اگر کوئی قوم کسی طرح دولت اور قوت جمع کر لے اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہو تو اسے زوال نہیں آسکتا۔ وہ اپنی مادی ذرائع کے بل بوتے پر زندہ و پابندہ اور صاحبِ غلبہ و اقتدار رہ سکتی ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ غلط ہے قوموں کی زندگی اور استحکام کے لئے صرف اسباب و علل کافی نہیں۔ اس کے ساتھ اس قوم کو ان اصولوں کا حامل بھی ہونا چاہیے جن کے مطابق معاشرہ قائم کرنے سے استحکام اور بقا حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ جن اقوام سابقہ کی طرف قرآن نے مذکورہ صدر آیت کی طرف اشارہ کیا ہے ان کے متعلق کہا کہ وہ تعداد کے لحاظ سے بھی اس قوم مخاطب سے زیادہ تھے۔ اور طاقت اور زمینی استحکامات میں بھی ان سے بڑھ کر۔ لیکن اس کے باوجود **فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ**۔ ان کا

کسب و ہنر جس پر انہیں اس قدر ناز تھا ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن عواقب سے انہیں بالکل نہ بچا سکا۔ وہ ان کے کسی کام بھی نہ آیا۔ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ۔ ان کے پاس فرستادگان خداوندی صحیح اور واضح ضابطہ حیات لے کر آئے لیکن وہ اپنے خود ساختہ آئین و ضوابط ہی پر نازاں رہے اور جس روش زندگی کی طرف وہ رسول دعوت دیتے تھے اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حَقَّ بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِؤْنَ۔ ان کی غلط روش خدا کے قانون مکافات عمل کے مطابق (جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے) تباہ کن نتائج مرتب کرتی رہی۔ لیکن یہ کچھ غیر محسوس طور پر ہو رہا تھا۔ اور اسی لئے وہ باوجود سخت تنبیہ اور تاکید کے اپنی غلط روش سے باز نہیں آتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ جو ان سے کہا جا رہا ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کے نتائج تمہیں تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لئے جا رہے ہیں تو یہ محض ڈراوا ہی ڈراوا ہے۔ لیکن اس کے بعد (جب یہ عبوری وقفہ ختم ہوا اور) ان کے غلط معاشرے کے تباہ کن نتائج محسوس شکل میں ان کے سامنے آ گئے۔ فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ تُو اس وقت وہ پکار اٹھے کہ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ خدا کے قوانین واقعی سچے ہیں۔

اس مقام پر فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا کہا ہے یعنی انہوں نے جب ہمارے عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دوسری جگہ کہا ہے فَلَمَّا أَحْسَبُوا بَأْسَنَا (۱۱-۲۱/۱۵) جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں سامنے دیکھ لیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ عذاب اس سے بہت پہلے سے متشکل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن پہلے وہ غیر محسوس اور غیر مرئی

## تباہی کا احساس

منازل میں تھا۔ اس کے بعد وہ محسوس و مرئی شکل میں سامنے آ گیا۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یہ وقفہ درحقیقت اُس عبوری دور کا نام ہے جس میں اعمال کے تباہ کن نتائج وجود کوش ہو رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ہنوز محسوس ہیکر میں سامنے نہیں آتے۔ اسی کو عام الفاظ میں مہلت کا وقفہ کہتے ہیں۔ یعنی اس وقفہ میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ اگر وہ قوم اپنی روش درست کر لے تو اس کی صحیح روش کے زندگی بخش نتائج سابقہ روش کے تباہ کن عواقب کے اثر کو زائل کر دیں۔ لیکن جب ہلاکت محسوس شکل میں سامنے آجائے تو اس وقت اس حقیقت کا اقرار کہ خدا کے قوانین سچے تھے کچھ فائدہ نہیں دیتا فَالَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا۔ جب سنکھیا ان کے جسم کی دریدیں اور شراب میں پھاڑے۔ اور زندگی کے خلیات

کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تو اس وقت اس امر کا اعتراف کہ ڈاکٹر کا کہنا ٹھیک تھا کہ سنکھیا (LIFE CELLS)

تہیں مار دے گا زندگی واپس نہیں لاسکتا۔

**سُنَّةِ اللّٰهِ** | یہ کچھ کہنے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ سُنَّةِ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ  
یہ بات یونہی اتفاقی طور پر (BY CHANCE) نہیں ہو گئی۔ یہ ہمارا قانون ہے

جو اقوام عالم میں اسی طرح چلا آ رہا ہے اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ وَخَيْرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ  
(۸۵-۸۲/۵۰) جس قوم نے بھی اس کی صداقت سے انکار کیا وہ تباہ و برباد ہو گئی۔

غور کیجئے۔ قرآن نے اسے سنتہ اللہ کہا ہے۔ یعنی خدا کا قانون۔ لہذا قرآن کی رو سے تاریخ کا مطالعہ

درحقیقت سنتہ اللہ کا مطالعہ ہے جو شروع سے آخر تک ایک ہی بیج سے چلی جائے گی۔ اس میں کبھی اور کبھی

تبدیلی نہیں ہوگی سُنَّةِ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَقْنَا مِنْ قَبْلُ ۗ وَلَنْ نَّجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا

(۳۳/۶۲) خدا کا یہی قانون تھا جو ان لوگوں میں جاری و ساری تھا جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں (اور یہی قانون

اب ان لوگوں میں جاری ہوگا) اس لئے کہ قانونِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ دوسری جگہ ہے وَلَنْ

نَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۗ (۳۵/۴۳) اس قانونِ خداوندی کے نتائج و عواقب میں تبدیلی تو ایک طرف

تم اس کے رُخ اور سمت میں بھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ خدا کا قانون آندھی کا جھکڑ یا دریا کا سیلاب نہیں کہ

جدھر جی میں آیا رُخ کر لیا یہ ٹھیک اسی سمت میں جائے گا جس طرف اسے جانا چاہیئے۔

یہ سنت اللہ یا قانونِ خداوندی کیا ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی یا استثناء نہیں ہوتی؟ اس کے متعلق قرآن

نے مختلف مقامات میں بڑی شرح و بسط سے تفصیل دی ہیں۔ لیکن ان تفصیل کا ملخص یہ ہے کہ بَلْ

نَقُذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ كَاسْنَاتٍ فِي حَقِّ اٰوْبٰطِلِ كِي كَشْمَشِ كَاسْلَسَلِهٖ جَارِي هٖ۔ حق کے معنی

میں خدا کے وہ محکم اصولِ زندگی جن کا نتیجہ تعمیری ہوتا ہے اور جو کائنات

**كشماشِ حَقِّ وِبٰطِلِ** | اور انسان کی نشوونما کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں باطل

کے معنی میں وہ تمام غیر خداوندی قوانین و ضوابط جو کائناتی اور انسانی نشوونما کے راستے میں حائل ہوتے ہیں

اور جن کا نتیجہ تخریب ہی تخریب ہوتا ہے۔ لہذا کائنات میں ایک کشماش یہم جاری ہے جس میں حق اور باطل

برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

پھر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ کہ کبھی اتفاق سے حق غالب آ گیا۔ اور کبھی باطل کا مہاب ہو گیا؟ قرآن

کہتا ہے کہ نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ فَيَذْمَعُهُ ۗ حَقُّ بٰطِلِ كَاسْرٍ تُوْزَكْرُكُمۡ دِيْتَابِهٖ فَاِذَا هُوَ زٰهِقٌ (۲۱/۱۸)

سو دیکھو کہ وہ کس طرح نیست و نابود ہو جاتا ہے یہ اس لئے کہ خدا نے کائنات کا یہ سلسلہ عظیم یونہی کھیل اور اور مذاق کے طور پر پیدا نہیں کر دیا کہ اس میں کبھی کچھ ہو جائے کبھی کچھ (۲۱/۱۶) کائنات کا ذرہ ذرہ اس مقصد جلیل کے لئے سرگرم عمل ہے کہ ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہوتا رہے۔ وَرَبُّهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَىٰ (۵۳/۳۱) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے اللہ کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروف عمل ہے۔ تاکہ ناہمواریاں پیدا کرنے والے کاموں کا نتیجہ انہی کے مطابق مرتب ہو اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے کا نتیجہ حسین و خوشگوار ہو۔

## قانون مکافات

دوسرے مقام پر ہے إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ (۱۱۰/۴) اس نے کائنات کے سلسلہ تخلیق کی ابتدا کی ہے۔ اور پھر وہ اسے گردشیں دیتا رہتا ہے تاکہ وہ لوگ جو اس کے قانون کو سچا مان کر صلاحیت بخش کام کریں انہیں حق و انصاف سے پورا پورا بدلہ ملتا رہے۔ اسی طرح سورہ سبأ میں ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کا ایک ایک ذرہ خدا کے سامنے ہے اور اس کے قانون کے مطابق مصروف تک و تازہ ہے۔ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (۳۴/۴) تاکہ وہ ایمان و عمل صالحہ کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دیتا رہے۔ لہذا ہونہیں سکتا کہ کوئی قوم غلط روش زندگی اختیار کرے اور اس کا نتیجہ زندگی کی مرفہ الحالیاں اور سرفرازیاں ہوں۔ اور کوئی قوم صحیح ضابطہ حیات پر عمل پیرا ہو اور وہ تباہ و برباد ہو جائے۔



ہمارے زمانہ میں تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت سے (مشہور فلاسفر) ہیگل نے پیش کیا اور اسی نظریہ پر بعد میں مارکس نے اپنے معاشی نظام کی عمارت اٹھائی۔ لیکن ہیگل کے تصور اور قرآن کے پیش کردہ ہیگل اور مارکس کے نظریات میں ایک تصور (IDIA) پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے زلزلے کی فضا میں بڑھتا، پھولتا اور پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ عین شباب تک پہنچ جاتا ہے تو اسی کے اندر سے ایک اور تصور ابھرتا ہے جو اس (پہلے تصور) کی ضد ہوتا ہے۔ یہ نیا تصور اس سابقہ تصور کو مٹا کر اس کی جگہ آپ لے لیتا ہے۔ پھر یہ تصور اسی طرح بڑھتا، پھولتا، پھلتا اور جوان ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس میں سے اس

کی ضد دوسرے تصور اُبھرتا ہے۔ تصورات کی یہ کشمکش شروع سے مسلسل چلی آرہی ہے اور اسی طرح چلی جائے گی۔ تاریخ اسی کشمکش پیہم کی داستان ہے۔

آپ نے دیکھا کہ میگل کے نظریہ کی رُو سے دنیا میں ثبات اور دوام کسی تصور کو نہیں۔ ہر تصور کچھ مدت کے لئے جلوہ بار ہوتا ہے اور پھر مَر جھا کر گر پڑتا ہے اور اس کی جگہ اس سے متضاد تصور لے لیتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ (میگل کے نزدیک) کوئی تصور نہ اپنی ذات میں خیر ہے نہ شر۔ نہ حق ہے نہ باطل۔ اس کے برعکس، قرآن نے جو اصول پیش کیا ہے اس کی رُو سے ایک تصور اپنی ذات میں حق اور صداقت کا جوہر پنہاں رکھتا ہے۔ اور اسی میں اس کے ثبات و دوام کا راز مضمر ہے۔ اس کے برعکس، دوسرے تصور اپنی تعمیر میں خرابی کی صورت پوشیدہ رکھتا ہے اور جب بھی حق کے مقابلہ میں آتا ہے۔ خامر و نامراد رہ کر فرار ہو جاتا ہے۔ تاریخ حق و باطل کی اسی کشمکش کی داستان ہے۔

مارکس نے میگل ہی سے تاریخ کا نظریہ لیا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس نے کہا ہے کہ دنیا میں ایک نظام پیدا ہوتا ہے۔ (میگل نے تصور کہا تھا۔ مارکس نے اس کی جگہ نظام کہا)۔ کچھ عرصہ تک وہ نظام چلتا ہے۔ جب وہ شباب تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد دوسرے نظام اُبھرتا ہے۔ جو پہلے نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ خود مسلط ہو جاتا ہے۔ جب یہ نظام انتہائی عروج تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی ضد دوسرے نظام پیدا ہوتا ہے جو اس کی جگہ متمکن ہو جاتا ہے۔ تاریخ انہی مختلف نظاموں کی آمد و شد کی کہانی ہے۔

قرآن کی رُو سے یہ نظریہ بھی غلط ہے۔ اس کا پیش کردہ اصول یہ ہے کہ جو نظام حق کی بنیادوں پر مشکل ہوگا، اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوگی جو باطل کے خطوط پر قائم ہو گا وہ حق کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں اسی نتیجہ تک پہنچاتا ہے۔

تاریخی وجوب | جب میگل یا مارکس سے پوچھا گیا کہ ایک تصور کی جگہ دوسرے تصور اور ایک نظام کی جگہ دوسرے نظام کس قوت کے بل پر آتا اور چھا جاتا ہے تو ان کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایسا تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) سے ہوتا ہے اسی کو زمانے کا تقاضا

کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جواب ایک اصطلاح کی آڑ میں پناہ لینے سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن کے الفاظ میں اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا اَنْتُمْ وَاَبَاءُكُمْ (۱۲/۴۰) یونہی کچھ نام ہیں جو تم نے یا تمہارے اسلاف نے رکھ لئے ہیں۔ ان کی حقیقت کچھ نہیں۔ اس کے برعکس، قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ کارگہ کائنات کا ایک ایک پرزہ اس





یعنی کائنات میں ثبات و دوام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُتُ فِي الْأَرْضِ ہر وہ نظریہ، ہر وہ تصور، ہر وہ نظام جو کسی خاص گروہ، خاص ملک یا خاص قوم نہیں۔ بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہو اسے بقا اور استحکام ہوگا۔ جو اس کے خلاف جائے گا وہ فنا ہو جائے گا۔ بالفاظِ دیگر حق کی عملی پہچان یہ ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش (تعمیری نتائج کا حامل) ہوتا ہے اور باطل ضرر رسا (یا تخریبی نتائج کا حامل) یہی ہے وہ بنیادی معیار جس کے مطابق قوموں کی موت و حیات کا فیصلہ ہوتا ہے۔ تاریخ اسی کی زندہ شہادت کا نام ہے۔

لیکن قرآن محض میکانیکی طور پر ایک نظام ہی نہیں دیتا بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ نظام قائم کیسے ہوگا۔ اس کے لئے وہ ایک ایسا بلند اور عمیق اصول سامنے لاتا ہے کہ جوں جوں ننگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے انسان وجد میں آجاتا ہے وہ کہتا ہے کہ اصل شے یہ نہیں کہ تم نے یونہی خارجی اسباب کچھ اس قسم کے پیدا کر دیئے جن کا نتیجہ نفع رسا ہو گیا۔ اصل چیز یہ ہے کہ کیا تمہاری داخلی دنیا تمہاری **داخلی انقلاب** نفسیاتی کیفیت میں بھی اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے جس کا فطری مظاہرہ خارجی نظام کی شکل میں ہوتا ہے؛ بالفاظِ دیگر، قرآن کا کہنا یہ ہے کہ اصلی اور حقیقی انقلاب وہ ہے جو انسان کی داخلی دنیا میں پیدا ہو۔ جو خارجی انقلاب انسان کی داخلی تبدیلی کا مظہر نہیں، اسے انقلاب کہہ ہی نہیں سکتے۔ باہر کی دنیا کی تمام تبدیلیاں، منحصر ہوتی ہیں انسان کی داخلی دنیا کی تبدیلیوں پر۔ اس باب میں خدا کا اٹل قانون یہ ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (۷/۵۳: ۱۱۳/۱۱)

خدا کا قانون یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے اندر (نفسیاتی) تبدیلی پیدا نہیں کرتی اس کی خارجی دنیا میں تبدیلی نہیں آسکتی۔

**ایمان کے معنی** | یہ داخلی دنیا کی تبدیلی۔ یہ "انقلاب اندر شعور" ہے جسے قرآن "ایمان" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے (مثلاً) ایک قوم مسلسل محنت اور بہیم مشقت سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ ان قوتوں کو اپنی قومی خوشحالی اور سر بلندی کے لئے صرف کہے، انہیں نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے کیوں عام کر دے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ چیز صرف ایمان (انقلاب اندر شعور) سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یعنی ان حقائق کو تسلیم کرنے سے کہ

- (۱) انسان صرف جسم کا نام ہی نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔  
 (۲) جسم کی پرورش ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے انسان خود اپنے لئے استعمال کرے۔ لیکن انسانی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی پرورش اور نشوونما کے لئے دے دے۔  
 (۳) انسانی زندگی کا مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔

جب کوئی قوم ان حقائق پر ایمان لے آئے گی تو اس کی نگاہ کا زاویہ بدل جائے گا۔ وہ انتہائی کوشش کرے گی کہ دوسروں کی نشوونما کے لئے زیادہ سے زیادہ اسباب و ذرائع ہم پہنچائے۔ اس سے وہ نظام قائم ہوگا جو نوع انسانی کے لئے منفعت بخش ہوگا۔ وہ اس نظام کے قیام و استحکام میں دوسروں کی منفعت سے کہیں زیادہ خود اپنی ذات کی منفعت بہنماں دیکھے گی۔ یہ ہے وہ داخلی انقلاب جس کا لازمی نتیجہ خارجی انقلاب ہوگا۔ لیکن اگر کسی وقت اس قوم کا یہ ایمان نہ رہے تو پھر یہ نظام قائم نہیں رہ سکے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ (پہلے سے قائم شدہ نظام) محض اپنے زور و دروں (MOMENTUM) یا عادت (FORCE OF HABIT) سے کچھ وقت کے لئے چلتا رہے۔ لیکن تھوڑی دُور جا کر یہ رُک جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم اپنے سیاسی مصالح یا اسی قسم کے اور محرکات کی بنا پر بعض منفعت بخش سامان زندگی میں دوسروں کو بھی شریک کرے۔ لیکن اسے آپ نوع انسانی کے لئے نفع بخش نظام نہیں کہہ سکتے۔ اس قسم کے نظام کا قیام بغیر اندرونی انقلاب کے ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تمام صلاحیت بخش اعمال (اعمالِ صالحہ) کے لئے "ایمان" کو لازمی شرط قرار دیا ہے۔

قرآن پورے حتم و یقین سے کہتا ہے کہ یہ ہونہیں ہو سکتا کہ کوئی قوم اس قسم کے صلاحیت بخش متوازن نظام کی حامل ہو اور وہ تباہ و برباد ہو جائے وَ مَا كَانَ سَأْبُكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَّ أَهْلُهَا مُصِلِحُونَ (۱۱/۱۱۷) یاد رکھو! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ تیرا نشوونما دینے والا آبادیوں کو ناحق ہلاک کرے دراصل ایکہ اس کے رہنے والے مصلحین ہوں ہلاکت تو ہوتی ہی ہلاکت کس کے لئے ہے؟ اس وقت ہے جب وہ قوم صحیح راستہ کو چھوڑ کر غلط روش اختیار کر لیتی ہے۔

فَهَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الْفَاسِقُونَ (۳۶/۳۵)  
 تو کیا غلط روش اختیار کرنے والوں کے علاوہ کوئی اور قوم بھی ہلاک

کی جاسکتی ہے؟

ہرگز نہیں! اس لئے کہ کائنات میں اندھی قوتیں کام نہیں کر رہیں کہ جسے جی چاہا پستی کے گڑھے میں دھکیل دیا جسے چاہا آسمان پر چڑھا دیا۔ یہاں ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ یہاں موت اور

**موت اور حیات عَنْ بَيِّنَةٍ** | حیات کے فیصلے دلیل و برہان کی رُو سے کئے جاتے ہیں۔

عَنْ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) کہ جسے تباہ ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے ہلاک ہو۔ اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہے۔ خدا (معاذ اللہ) ”بھیروں ماتا“ یا ”کالی دیوی“ نہیں جو انسان کے خونِ ناحق سے خوش ہوتی ہے۔ وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ قوموں پر تباہی ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے آتی ہے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۲۹/۴۱)

ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ خدا ان پر ظلم کرتا۔ لیکن وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ جو قوم ظلم و ستم اور جور و استبداد کی روش اختیار کرتی ہے، بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ دوسروں پر زیادتی کرتی ہے اور اپنے مفاد کا تحفظ۔ بلکہ یوں کہتے ہیں کہ وہ دوسروں سے لوٹ کھسوٹ کر سب کچھ اپنے لئے جمع کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان کا یہ ظلم اور زیادتی دوسروں کے

**ظلم خود اپنے خلاف ہوتا ہے** | اختلاف نہیں ہوتا۔ خود ان کی اپنی ذات کے خلاف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ غلط اعمال ہیں جن کا فطری نتیجہ اس قوم کی تباہی

بربادی ہے۔ وہ قوم دوسروں پر زیادتی کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اس سے ہمارا کچھ نہیں بچتا۔ لیکن قانونِ مکافات عمل ان کے ان جرائم کا تباہ کن نتیجہ مرتب کئے چلا جاتا ہے۔ جس کے بعد وہ قوم ایک دن ہلاکت کے ہبتم میں جا گرتی ہے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ تباہ ہونے والی قومیں خود اپنے

آپ پر ظلم اور زیادتی کرتی ہیں۔ خدا نے کسی پر ظلم کر کے کیا کرنا ہے؟

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَدَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ

شَاكِرًا عَلِيمًا (۴/۱۳۸)

اگر تم قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر شناسی کرو تو اس نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ وہ تو انسانوں کے اچھے کاموں کا قدر شناس اور ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔

یعنی یہاں سوال ”خدا کے ناراض ہو جانے یا اس کے خوش ہو جانے“ کا نہیں۔ یہاں سوال اس کے قانون اور اس کے فطری اور حتمی نتیجہ کا ہے۔ یہاں نہ تو کوئی قوم خدا کی چھٹی اولاد ہے کہ وہ جو جی میں آئے کرتی رہے، حکومت و سطوت اور دولت و ثروت کی مالک وہی رہے گی۔ اور نہ ہی کسی قوم سے یونہی ”خدا واسطے کا بیز“ ہے کہ وہ جتنے اچھے کام جی چاہے کرے اسے ذلیل و خوار ہی رکھا جائے گا۔ خدا کے ہاں تو (قانون مکافات کی) میزان گڑھی ہے۔ جس میں ہر فرد اور ہر قوم کے اعمال کا ایک ایک ذرہ تلتا ہے وَ مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَ مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ (۹۹/۸-۷)۔ کسی سے رعایت ہوتی ہے نہ کسی سے بے انصافی ہر عمل اپنا نتیجہ (بلا کم و کاست) مرتب کرتا رہتا ہے۔ جب تک کسی قوم کے ایسے اعمال حیات جو قوانین خداوندی کے مطابق، نوع انسانی کے لئے منفعت بخش ہوں زیادہ ہوں (یعنی اُن کا پلڑا اُجھکا رہے) وہ قوم زندگی کی خوشگوار یوں اور سر بلندیوں سے فیضیاب رہتی ہے (فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۝ (۱۰۱/۸-۷) اور جس کا یہ پلڑا ہلکا ہو جائے وہ تباہی اور بربادی کے جہنم میں جاگرتی ہے۔ (وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۝ (۱۱۱/۹-۸)۔

قرآن نے اس مقام پر قوموں کی موت اور حیات کے متعلق ایک عظیم اصول بیان کیا ہے۔ دنیا میں اچھی سے اچھی قوم سے بھی بعض اوقات غلطیاں اور لغزشیں ہو جاتی ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ جو نہی کسی قوم سے کوئی لغزش ہوئی وہ نباہی کے جہنم میں جاگری۔ اُس قوم کے خوشگوار نتائج پیدا کرنے والے اعمال (حسنات) اس قسم کی لغزشوں کی تلافی کر دیتے ہیں (جیسے تندرست و توانا آدمی سے اگر کوئی چھوٹی موٹی بد پرہیزی ہو جائے تو اس سے اس کی موت واقع نہیں ہو جاتی) یہی وہ اصول ہے جس کے مطابق قرآن نے کہا ہے کہ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴) لیکن جب کسی قوم کی حالت یہ ہو جائے کہ اس کی حسنات کا پلڑا برابر اوپر کو اٹھتا جائے اور سیئات کا پلڑا اُجھکتا جائے تو اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی قوم کی ہلاکت فوراً نہیں واقع ہو جاتی۔ اس کی غلط روشیں غیر محسوس طور پر اپنے ہلاکت آفریں

نتائج مرتب کرتی چلی جاتی اور اسے بتدریج فنا کے گھاٹ کی طرف لئے جاتی ہے۔ قرآن میں ہے فَذُرْنِي وَ  
**بِتَدْرِجٍ بِلَاكَتِ كِي طَرَفٍ** | مَنْ يُكَذِّبْ بِهَذَا الْحَدِيثِ جِوَا س حَقِيقَتِ ثَابِتِه  
 کو جھٹلاتا ہے (اے رسول) تو اُسے میرے حوالے کر دے۔ میرا قانون

مکافات ایسے لوگوں سے خود نیٹ لے گا۔ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ (۶۸/۴۴) ہم  
 انہیں بتدریج ایسے مقام تک لے جائیں گے جس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے۔

اگر وہ قوم بلاکت کی آخری منزل تک پہنچنے سے پہلے اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر لیتی ہے (جسے  
 قرآن کی اصطلاح میں تَابٌ وَ اَصْلَحَ کہتے ہیں) تو وہ بلاکت سے بچ جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں  
 کرتی اور اپنی غلط روش پر بدستور آگے بڑھتی جاتی ہے تو وہ آخر الامر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہلاک  
 کہ پھر دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتی۔

وَ حَرَامٌ عَلٰی قَرِيْبَةٍ اَهْلَكْنَهَا اَنْهُمْ لَا يُرْجَعُوْنَ ۝ (۲۱/۹۵)

اور اس قوم کے لئے جسے ہم نے (ان کے جرائم کی پاداش میں) ہلاک کر دیا۔ یہ تہی فیصلہ ہے  
 کہ وہ دوبارہ لوٹ نہیں سکتے گی۔

چونکہ اس قوم کی یہ تباہی اس کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے اس دروانِ نیکز انجام  
 پر کائنات کی آنکھ میں آنسو تک نہیں آتا۔

فَمَا بَلَّكَ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوا مُنظَرِيْنَ ۝ (۴۴/۲۹)

(ان کے اس انجام پر) نہ آسمان رویانہ زمین۔ اور نہ ہی انہیں ہدایت دی گئی۔

یہ مدت جس میں کوئی قوم باہم عروج پر پہنچتی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ قعرِ مذلت میں گر کر ہلاک ہو جاتی ہے،  
 اس قوم کی اجل (معیاد) کہلاتی ہے۔ بِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (۱۰/۴۹) ہر قوم کی ایک میعاد ہوتی ہے۔ اِذَا

اَجَاءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۰/۴۹) اور  
**اجل معینہ** | جب اس کی یہ میعاد ختم ہو جاتی ہے (اجل آجاتی ہے) تو پھر اس میں نہ ایک گھڑی

بہر کی تاخیر ہو سکتی ہے نہ تقدیم یعنی جب خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اس قوم کی بلاکت کا وقت آجاتا ہے تو  
 پھر دنیا کی کوئی طاقت اس میں ذرا بھی دیر سویر نہیں کر سکتی۔

بِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ قوم کی مدتِ حیات پہلے سے متعین ہوتی ہے یعنی



تو وہ سمجھ لے کہ وہ کسی اور کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ خود اپنی ذات کو سامانِ نشوونما سے محروم رکھتا ہے۔ باقی رہا اللہ، سو اس کی کیفیت یہ ہے کہ **وَ اللّٰهُ الْغَفِيْرُ وَاَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ** تم اس کے محتاج ہووہ تمہارا محتاج نہیں۔ وہ کسی کا بھی محتاج نہیں۔ **وَ اِنْ تَسْأَلُوْا اِن سَلَّوْا** ان سے کہہ دو کہ اگر تم اس طرح قانونِ خداوندی کی اطاعت سے روگردانی کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ **يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ** وہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا۔ **ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ** اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

یہ ہے قوموں کی ہلاکت سے مفہوم۔ مندرجہ بالا آیت کا آخری ٹکڑہ **(ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ** قابلِ غور ہے۔ یعنی یہاں ہیگل اور مارکس کا فلسفہ تاریخ کا فرما نہیں کہ ایک قوم (تصور یا نظام) کی جگہ بہر حال دوسری قوم نے لینی ہے خواہ یہ دوسری قوم کسی قسم کی کیوں نہ ہو۔ یہاں قانون یہ ہے کہ تبدیل وہ قوم کی جاتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رہتی اور اس کی جگہ وہ قوم لیتی ہے جو اس (جانے والی) قوم سے بہتر ہوتی ہے۔ **اِنَّا لَعَدُوْدٌ عَلٰى اَنْ تُبَدَّلَ خَيْرًا مِنْهُمْ** (۴۰/۴۰) ہم اس پر قادر ہیں کہ ان سے بہتر قوم کو ان کی جگہ بدل کر لے آئیں۔

یہ ہے خدا کا وہ اٹل قانون جس کی شہادت تاریخ کے صفحات پیش کرتے ہیں۔ اور یہی ہے وہ حقیقت

جس تک پہنچنے کے لئے اس نے تاریخ کے مطالعہ پر اس قدر زور دیا ہے۔

## اقوام سابقہ کی تاریخ

وہ اقوام حاضر کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

**اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبُوْۤا الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا مِنْ قَبْلُ فَاَقْوَامٌ وَّ بَالٍ  
اَمْرِهِمْ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُ كَانَتْ تَاْتِيْهِمْ  
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَعَالُوْۤا اَبْشٰرًا يَّهْدُوْنَۤا وَّنَا نَا فَاكْفَرُوْۤا وَّ تَوَلَّوْۤا  
وَ اسْتَغْنٰى اللّٰهُ ۝ وَ اللّٰهُ غَفِيْرٌ حَمِيْدٌ ۝ (۵ - ۶۴/۶)**

کیا تمہارے پاس اقوام سابقہ کی تاریخ نہیں پہنچی۔ یعنی ان اقوام کی جنہوں نے توہینِ خداوندی سے انکار کیا سو انہوں نے اپنی غلط روش کا تباہ کن انجام دیکھ لیا۔ یعنی وہ درد انگیز سزا کے مستوجب بن گئے۔ یہ اس درجے سے جو کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح قوانین لے کر آتے رہے (لیکن وہ ایک ایک کی تکذیب کرتے رہے) اور کہتے رہے کہ "واہ! اب ہمارے جیسے انسان ہماری راہ نمائی کریں گے؟" سو انہوں نے اس کا انکار کیا اور ان قوانین سے روگردانی

کی۔ (سوا اس سے اللہ کا کچھ نہیں بجز ا) اللہ تو سب سے مستغنی ہے۔ بالکل مستغنی اور ہر قسم کی حمد و توصیف کا مالک۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ استبدالِ قومی (ایک قوم کی ہلاکت اور اس کی جگہ دوسری قوم کا تمکن فی الارض یونہی سوتے سوتے نہیں ہو جاتا۔ تباہ ہونے والی قوم کے اندر معاشرتی فساد رونما ہوتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے جس سے ان کی قوت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ یہ بھی خدا کا عذاب (یعنی ان کے اعمال کے نتائج اور ان کے جرائم کی پاداش) ہوتی ہے۔ اس عذاب کی کئی شکلیں ہیں۔ لیکن ان میں سب سے نمایاں شکل وہ ہے

جسے قرآن نے سورۃ النعام میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے

**عذاب کی شکل** | قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا  
مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبَسَكُمْ لُطُفًا وَيُذِيقْ  
بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ۗ أَنْظُرْ كَيْفَ نَصَرْتُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ

(۶/۶۵)

ان سے کہہ دو کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ تمہارے اعمال کی سزا مختلف انداز میں وارد کر دے۔ (مثلاً) اس طرح کہ تمہارے اوپر مستبد اور جاہر حکام مسلط ہو جائیں جو اپنے جور و ستم سے تمہیں روند ڈالیں۔ یا معاشرہ کے عوام نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اس طرح نظم و نسق کو تہس نہس کر دیں۔ یا اوپر کا طبقہ (لیڈر) عوام کو اپنے ساتھ ملا کر مختلف پارٹیاں بنالے اور اس طرح یہ پارٹیاں آپس میں سر پھٹول شروع کر دیں۔ یہ ہیں باہمی جنگ و جدال کی وہ مختلف شکلیں جن سے معاشرہ میں فساد برپا ہو جاتے اور اس طرح تم سے حکومت و سطوت چھین کر کسی دوسری قوم کے ہاتھ میں چلی جاتے۔ اس قسم کی فساد جنگیوں میں یا مختلف (مستبد) اقوام کی باہمی آویزشوں میں ہوتا ہے کہ جو زیادہ قوت فراہم کر لیتا ہے وہ دوسروں پر بزور مسلط ہو جاتا ہے۔

وَكَذَلِكَ نُؤَيِّدُ بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۶/۱۶۹)۔ لیکن مستبد قوتوں کا اس قسم کا غلبہ و تسلط انہیں ثبات و دوام عطا نہیں کر دیتا۔ یہ محض وقتی اور مہنگامی تغلب ہوتا ہے۔ اگر محض قوت کی بنا پر قوموں کو دوام نصیب ہو جاتا تو دنیا کی کئی قومیں آج تک برسرِ اقتدار ہوتیں۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ چونکہ ان کا تصورِ حیات غلط اور نظریہ زندگی باطل تھا اس لئے وہ اپنی قوت و سطوت کے باوجود تباہ

**محض قوت سے دوام نہیں ملتا**



برباد ہو گئیں۔ وَكَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۳۰/۹؛ ۴۰/۲۱؛ ۴۰/۸۲؛ ۳۱/۱۵؛ ۴۴/۱۳) یہ بھی نہیں کہ یہ قومیں جاہل اور گنوار وحشی اور غیر مہذب تھیں۔ وہ علم و بہنر کی مالک اور تہذیب و تمدن کی حامل تھیں۔ وہ سب کچھ دیکھنے بھالنے والی تھیں۔ (وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ (۲۵/۳۸) ان کے پاس ذرائعِ علم سب موجود تھے۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَ أَبْصَارًا وَ آفْئِدَةً (۲۵/۳۸) وہ سماعت و بصارت اور قلب سب کچھ رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ قاذونِ خداوندی کی صداقت سے انکار کرتے اور اس کے خلاف زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے ان کا علم و بہنر ان کے کسی کام نہ آیا۔ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَتَاعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا آفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ (۴۶/۲۶)

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ سب سے پہلے خرابیاں قوم کے اوپر کے طبقہ سے شروع ہوتی ہیں جو

**سرمایہ پرستوں طرف سے ابتدا** | مرفہ الحال اور دولت مند ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی کمائی پر عیش اڑاتے ہیں اور اسی روش پر چلے جانا چاہتے

ہیں۔ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ (۱۱/۱۱۶) انہی کو دوسری جگہ اکابر مجرمین کہا گیا ہے جو مختلف قسم کی سازشیں کرتے رہتے ہیں تاکہ نچلا طبقہ ان کی ہوسنائیوں کا آلہ کار بنا رہے۔ حالانکہ یہ سازشیں خود ان کی اپنی ذات کے خلاف ہوتی ہیں لیکن وہ اس بات کو سمجھتے نہیں (۶۱/۳۳) اس سے معاشرہ میں خرابیاں عام ہوتی چلی جاتی ہیں اور کوئی قوت ایسی نہیں رہتی جو ان ناہمواریوں کا سدباب کر سکے (۱۱/۱۱۶)۔ جب حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو وہ قوم اپنے سامانِ معیشت کی فراوانیوں کے باوجود (بَطْرَاتٍ مَعِيشَتَهَا) (۲۸/۵۸) نباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ تباہی کہیں باہر سے نہیں آتی۔ یہ خانہ ویرانی ان کے اپنے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ (يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ) (۵۹/۲) اس سے قوم قرآن کے الفاظ میں "کئے ہوئے کھیت اور کچھے ہوئے انگارے کی طرح ہو جاتی ہے" (وَجَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ) (۲۱/۱۵) اور تاریخ کے صفحات پر اس کی فقط داستانیں باقی رہ جاتی ہیں (وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ) (۲۳/۴۴) ان کی آبادیاں ویران ہو جاتی ہیں۔ ان کے کنوئیں بے کار ہو جاتے ہیں۔ ان کے محلات کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں (۴۲/۴۵) یہی ہیں وہ کھنڈرات جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان کا مشاہدہ کرو۔ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ (۲۴/۶۹) اور دیکھو کہ مجرمین کا انجام کیا ہوا۔ لیکن یہ انجام انہی کو نظر آ سکتا ہے جو آنکھیں رکھتے ہیں۔ وہ آنکھیں نہیں

جو ماتھے میں گڑھی ہوتی ہیں۔ بلکہ وہ آنکھیں جو دل کے اندر ہوتی ہیں۔ (فَإِنَّهَا لَا تَعْمَىٰ إِلَّا بَصَارٌ وَلَكِنَّ تَعْمَىٰ الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۲۲/۴۶) اس لئے کہ جب انسان اندھا ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کے ماتھے کی آنکھیں جاتی رہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل کی آنکھوں کی بصارت جاتی رہی۔

خوش بخت ہیں وہ قومیں جو تاریخی شواہد سے اپنے اعمالِ حیات کا محاسبہ کرتی رہتی ہیں کہ قرآن نے تاریخ کے مطالعہ کا یہی مقصد بتایا ہے۔ لیکن جو قوم محض مُردوں کو "ثواب" پہنچانے کی خاطر قرآن پڑھے، وہ اس سے کیا فائدہ حاصل کر سکتی ہے؟



# مُسلماں کی زندگی

(اکتوبر ۱۹۳۹ء)

جب انسان پر مایوسی کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں، ظلمت کدہ عالم میں اُمید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہتی، تمام اسباب و علل ایک ایک کر کے جواب دے دیتے ہیں تو اس کا دل بیٹھ جاتا ہے۔ زندگی کے تمام ناکام تجارب کی یاد پھر سے تازہ ہو جاتی ہے۔ عمر بھر کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے نقوش خاک کے ذروں سے اُبھرتے چلے آتے ہیں۔ وہ اُن کی طرف ٹکٹکی لگاتے بیٹھ جاتا ہے۔ زندگی اسے مسلسل مصائب و تکالیف کی اندوہناک داستان معلوم ہوتی ہے۔ انسان اسے ایک بے کس و بے بس مجبور و مظلوم قیدی کی طرح نظر آتا ہے جسے فطرت کی چیرہ دستیوں نے جور و ستم اور ظلم و استبداد کی المناک صعوبتیں جھیلنے کے لئے اس وحشتناک کڑہ میں بھیج دیا ہے۔ چونکہ دنیا کی ہر شے وہی کچھ بن جاتی ہے جس نگاہ سے انسان اسے دیکھے، اس لئے جب وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے تو اسے کہیں مسرت و شاد کامی کی نورانی کرن نظر نہیں آتی۔ ہر چہرہ تبسم نا آشنا اور ہر پیشانی غم آلود دکھائی دیتی ہے۔ وہ سوچتا ہے اور ہر بار اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

زندگی مصائب کا دوسرا نام ہے۔ خالص اور دوامی مصائب۔ ہر آرزو ایک مستقل تکلیف

کا پیش خیمہ ہے۔ لہذا سکون و اطمینان عدم آرزو میں ہی ہے۔ (ہاتما بدھ)

وہ حیاتِ انسانی کو ایک لغو و باطل شے قرار دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ زندگی محض سراب ہے، دھوکا ہے۔ مایا کا جال ہے۔ (اپنشد)۔ وہ زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو رخ خیال کرتا ہے (شو پنہار)۔ وہ اس مصیبت کدہ سے دُور بھاگنا چاہتا ہے اور اسے چھوڑ دینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ چونکہ وہ سمجھتا ہے

اس کی ناکامیوں کے پردوں میں دوسرے انسانوں کے ہاتھ پوشیدہ ہیں اس لئے اسے عام انسانوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ عام انسانوں میں سے صاحبانِ ثروت و اقتدار کو وہ اپنی لٹی ہوئی مسرت کا غاصب سمجھتا ہے اس لئے ان انسانوں کے خلاف نہیں، بلکہ خود دولت و ثروت، شوکت و سطوت کے خلاف اس کے دل میں ایک گرہ مسی بیٹھ جاتی ہے۔ وہ انسانوں کی بستیوں کو چھوڑ کر دُور جنگلوں میں جا کر رہ کر لیتا ہے۔ اگر اسے انسانوں میں رہنا بھی پڑے تو وہ دولت و عزت کے خلاف جہاد کرنا سب سے بڑی خدمتِ خلق سمجھتا ہے۔ وہ یہ کہہ کر اپنے قلبِ محزون کو تسلی دے لیتا ہے کہ خیر اس دنیا میں تو یہ جو جی چاہے کر لیں "آسمانی بادشاہت" میں تو ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وہ ستم رسیدہ، کمزور، ناتواں، ضعیف، مغلوب و مقہور

**ترک دنیا** انسان کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتا ہے کہ یہ دنیا تمہارے لئے نہیں۔ اس کے طالبِ خدا کی نگاہوں میں مردود و ملعون ہیں۔ البتہ اس کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں وہ لوگ جو یہاں دولت و حشمت کے مالک ہیں ذلیل و خوار ہوں گے، اور جو آج ذلیل و خوار ہیں وہ معزز و مکرم۔ آسمانی بادشاہت انہی مفلس و غریب انسانوں کی وراثت ہے۔ نردانا میں یم کے مقرب ہی لوگ ہوں گے۔ دیوتوک میں برہما کے ہم آغوش ہونے والے ہی بھگت ہیں۔ یہی تعلیم کینسہ و صومعہ کے راہب کی اصل ایمان ہے۔ یہی فلسفہ تارک الدنیا سنیا سی اور تیا گی بھکشو کا سچا دھرم ہے۔ اس فلسفہ اور مشرب کی لم یہ ہے کہ حال کو ذلیل کر کے مستقبل کو مزین بنایا جائے۔ دنیا کی رسوائیاں، عاقبت کی سرفرازیاں قرار دی جائیں۔ یہاں کی ذلت آنے والی زندگی کی عزت ہو۔ یہاں جتنا پست ہو وہاں اتنا ہی بلند ہو۔ یہاں کا محتاج وہاں کا غنی۔ یہاں کا تباہ حال وہاں کا خوشحال۔ اور یہاں کا نادار وہاں کا مالک ہو۔ وہ یہاں کے مصائب و آلام کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھائے کیونکہ اسے ان میں ابدی مسرتوں کے پیام نظر آ رہے ہیں۔ غرضیکہ وہ دنیا و آخرت کے درمیان ایک ایسے ناقابلِ شکست آئینہ کی سید سکندری قائم کر دے جس میں یہاں کا ہر نقش معکوس دکھائی دے۔

لیکن کیا یہ تعلیم خالق کائنات کی دی ہوئی تعلیم قرار دی جاسکتی ہے؟ کیا انسان واقعی اس دنیا میں ایک مجبور و مقہور قیدی کی حیثیت سے لایا گیا ہے کہ وہ اس جیل خانہ میں عمر بھر قید رہے؟ کیا اس کی تخلیق سے فی الواقع یہ منشا ہے کہ وہ فطرت کے ہر تقاضے کے خلاف جنگ کرتا رہے اور ان جذبات کے فنا کرنے میں ہی اپنی کامیابی سمجھے؟ کیا دنیا اور اس کی نعمتیں واقعی قابلِ نفرت و ملامت ہیں؟ کیا یہاں کی ہر سہاؤنی شے شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتی ہے؟ کیا مقصدِ حیاتِ انسانی، ذلت و رسوائی، محتاجی و ناداری، محبت و مسکنت،

کیا دنیاوی زندگی ذلیل ہے | افلاس و زبوں حالی اور مغلوبیت و مقہوریت ہی ہے؟ کیا

پھر ایک آنے والی زندگی کی تمام برکات و نعم یہاں کی رسوائیوں اور ذلتوں کے معاوضہ میں ملیں گی؟ کیا آسمانی بادشاہت اسی قسم کی خدائی فوج کا حصہ ہوگی جو دنیا میں ہر قوت سے ڈرتی و بھتی دن گزار رہی ہو؟ کیا خدا کا مقرب وہی ہوگا جسے دنیا میں کوئی اپنے پاس تک بٹھانا پسند نہ کرے؟ کیا دولت و حشمت و عزت و وقار کی زندگی واقعی جنت سے محرومی کا سبب ہوگی؟ کیا یہاں کے مرفہ الحال لوگوں پر وہاں کا باب السلام قطعاً مسدود ہوگا؟ یہاں کے چاندی اور سونے کا ہر ٹکڑا جہنم کے طوق و سلاسل بنانے کے کام میں لایا جائے گا؟ ذل و مسکنت کیا واقعی خدا کی رحمت ہے؟ وسعت و فراخی کیا فی الحقیقت اس کا عذاب ہے؟

ان سوالات کا جواب آپ اپنے دماغ سے کہ جس پر ایک عرصہ دراز سے خاص ماحول اور مخصوص تعلیم کے پردے پڑے ہوئے ہیں، کچھ ہی دیکھئے اور اس سے مطمئن ہو جائیے۔ لیکن آئیے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم ان کی بابت ہمیں کیا تعلیم دیتا ہے؟ کہ وہی تعلیم، تعلیم خالقِ فطرت اور وہی حکمِ حکمِ خداوندی ہوگا۔ قرآن کریم ہمیں کھلے کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ انسان کی پوزیشن، اس کائنات میں ایک مخدوم کی ہے اور جملہ موجودات عالم اس کی خدمت گزار اور مطیع ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا (۲۵/۱۳)

پستیوں اور بلندیوں (ارض و سموات) میں جو کچھ ہے سب کو تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔

انسان کی پوزیشن | لہذا انسان کا منصب یہ ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کو اپنا تابع فرمان بنائے

فطرت کی ہر چیز سے کام لے کیونکہ یہ سب ایک معینہ مدت تک اس کی متاع ہیں۔ دنیاوی زیبائش و آرائش کی چیزیں خدا تعالیٰ نے حرام نہیں کیں (۴/۳۲) بلکہ ان میں انسان کے لئے ایک خاص کشش و محبت رکھی ہے (۳/۱۳)۔ ان سے فائدہ اٹھانا، ان کو کام میں لانا ہی ان کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اور اسی انتفاع و تمتع کا نام دنیا میں عزت و وقار کی زندگی بسر کرنا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ دولت و حشمت کے غلط استعمال سے ہماری معاشی اور معاشرتی زندگی ناہموار ہو جاتی ہے جس سے ہمارے اجتماعی نظام میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ دنیا سے الگ ہو جانا ہی اس کا علاج ہے۔ اگر دولت و قوت کی بے لگام سرکشی انسانی فضیلت نہیں تو ذلت و پستی کی زندگی بھی

انسانی تخلیق کی غرض و غایت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضراتِ انبیاءِ کرام کی تعلیم ہمیشہ اس افراط و تفریط کو مٹانے کے لئے ہوتی تھی۔ اگر آپ غور فرمادیں تو معلوم ہو جائے گا کہ خدائے قیوم کا ازیلی پیغام جو ان حضراتِ مامورینِ من اللہ کی وساطت سے دنیا میں آتا رہا اس باب میں اس کا شروع سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی لم رہی ہے۔ یعنی وہ ان عیوب اور نقائص کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو دولت اور قوت کے غلط استعمال سے انسانوں میں پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف ضعیف و ناتواں لوگوں کو ابھار کر انسانیت کی بلند ترین سطح پر لاتے رہے اور انہیں ایسی تعلیم دیتے رہے جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں وہ عیوب پیدا نہ ہوں جو مترقیوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ دولت و ثروت کے غلط استعمال سے نظامِ انسانی میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ لہذا حضراتِ انبیاءِ کرام جن کمزوروں کو ابھار کر بلند سطح پر لاتے تھے انہیں تاکید کرتے تھے کہ دیکھنا تم نے حدودِ اللہ کی نگہداشت کرنا اور نہ ان کے توڑنے سے تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو تمہارے متقدمین کا ہو چکا ہے۔ وہ قوانینِ الہی سے منہ موڑ لینے والے انسانوں سے دنیا چھین کر ان کمزوروں کو دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ انہیں ایک ایسا ضابطہٴ حیات عطا کر دیتے تھے جس سے ان کے اور خدا کے درمیان ایک دائمی رشتہ قائم رہے اور اس طرح انسانیت کا نظام متوازن و ہموار طریق پر چلتا رہے۔ بس یہ ہے خلاصہٴ اسمانی تعلیم کا جو انسانوں کی ہدایت کے لئے زمین پر بھیجی جاتی رہی۔ اسی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ دنیا کی فلاح اور عاقبت کی سُرُخروئی ہے۔ میزانِ خداوندی کے یہ دو پلڑے ہیں جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہیے۔ نظامِ انسانیت کی گاڑی کے یہ پہنے ہیں جو ہمیشہ ہموار اور استوار رہنے چاہئیں۔ آزاد یوں کی فضائے بیٹ میں اڑنے والے پرندے کے یہ دو بازو ہیں جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو گیا تو وہ زمین سے ابھر نہیں سکتا۔ اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی حدیں وہ ہیں جہاں پہنچنے سے قدوسیوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ یاد رکھئے! اگر نعمائے آخرت خدا کا انعام ہیں تو دنیاوی شوکت و عظمت بھی کچھ کم نعمت نہیں۔ اور یہ وہ نعمت ہے جس کی یاد دہانی اقوامِ عالم کو بار بار کرائی جاتی رہی ہے۔ حضرت ہوو نے اپنی قوم سے یہی فرمایا تھا کہ خدا کی اس نعمت و قدرت کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں قومِ نوح کے بعد استخلافِ فی الارض کی بخشش سے نوازا اور قوت و حثمت میں برتری عطا فرمائی۔ لہذا

فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ (۷/۶۹)

اللہ کی نعمتیں یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی نصیب ہو۔

یہی حضرت صالحؑ نے قوم ثمود سے کہا۔

تم خدا کی اس بخشش کو یاد کرو کہ اُس نے تم کو قوم عاد کے بعد بنائیں اور تمہیں زمین میں متمکن کیا۔ تم نرم نرم زمین پر محلات بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں (محمفوظ) عمارتیں تعمیر کرتے ہو سو اللہ کی نعمتوں کو پیش نظر رکھو اور زمین میں فسادات مت پیدا کرو۔ (۷۴/۷۴)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم زمین میں قلیل تھے اس نے تمہیں کثرت عطا فرمائی (۷۴/۸۶)۔ حضرت ابراہیمؑ کو اس دنیا میں بھی حسنت دی گئیں اور آخرت میں بھی (۱۲۲/۱۲۲)۔ ابراہیمؑ کتاب و حکمت کے ساتھ ملکِ عظیم کی بھی مالک بنائی گئی (۵۴/۴) اور اس کو اللہ کا فضل قرار دیا۔ حضرت یوسفؑ کو اس قدر گردش کے بعد جس نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز کیا گیا وہ متمکن فی الارض تھا اور اس عطیہ کبریٰ کو ان کے صبر و تقویٰ کا اجر جزیل کہا گیا۔

اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو زمین میں صاحبِ حکومت بنا دیا (متمکن فی الارض کر دیا) کہ وہ جہاں چاہیں رہیں سہیں۔ ہم جس پر اپنی رحمتیں چاہیں پہنچا دیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ (۱۲/۵۶)

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستان اسی قوت و حشمت، تمکن و تسلط کی مسلسل تاریخ ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ جس شدت و تکرار سے اس قوم کے واقعات قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں کوئی اور واقعہ اس شد و مد سے دہرایا نہیں گیا۔ اس تمکن کو کمزوروں پر خاص احسان کہا گیا ہے۔

ہم چاہتے تھے کہ جن لوگوں کو کمزور کر دیا گیا تھا ان پر احسان کریں اور ان کو دیگر اقوام کا امام بنا دیں اور ملک کا وارث قرار دے دیں اور ان کی حکومت کو زمین پر قائم کریں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھادیں جس سے وہ سچنا چاہتے تھے۔ (۵ - ۶/۲۸)

چنانچہ اسی ضعیف و ناتواں، اسی محکوم و مغلوب قوم کو بالآخر مشرق و مغرب کا حکمران بنا دیا گیا۔  
وَأَدْرَأْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَ  
مَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ  
بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا وَ دَمَرْنَا مَا كَانِ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ

قَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْشُرُونَ ۝ (۷/۱۳۷)

اور ہم نے اس قوم کو جو بالکل کمزور و شمار کی جاتی تھی اس بابرکت زمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا۔ اور آپ کے رب کا وعدہ حسنہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے استقلال کی وجہ سے یوں پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ اور فلک بوس عمارت کو درہم کر کے رکھ دیا۔

صبر و توکل، سعی و عمل کا یہی وہ انجام تھا جس کے لئے حضرت موسیٰ نے پہلے ہی اپنی قوم سے وعدہ کر رکھا تھا۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تعالیٰ سے مدد مانگو اور مستقل مزاج رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے وہ جسے چاہے (اپنے قانون کے مطابق) اپنے بندوں میں سے ان کا مالک بنا دے۔ اور آخری انجام تو متقین کے لئے ہی ہے۔ (۷/۱۲۸)

چنانچہ یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کی یاد بار بار بنی اسرائیل کو دلائی گئی۔

لے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے تم کو نوازا تھا اور تمہیں تمام اقوامِ عالم پر برتری عطا کی تھی۔ (بقرہ و دیگر مقامات)

اور جب اس قوم نے تو انین الہی سے سرتابی اختیار کی تو خدا کی طرف سے جو سب سے بڑا عذاب ان پر نازل ہوا وہ اس نعمتِ کبریٰ کا چھن جانا تھا۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا غَضَبًا مِّنَ اللَّهِ

(۲/۹۱)

اور ان پر ذلت اور مسکینی کی مار ماری گئی اور وہ اللہ کے غضب کے سزاوار ہو گئے۔

تاریخی یادداشتیں | مذکورہ صدرِ قصص، قرآنِ کریم میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔ قصص القرآن کا مقصد محض وقائع نگاری نہیں بلکہ ہر قصہ اور اس کا ہر بیان اپنے اندر

عبرت و موعظت کی کھلی کھلی بصیرتیں رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم اممِ گذشتہ کے احوال و ظروف کی طرف خاص توجہ دلاتا ہے۔ اور بار بار تاکید کرتا ہے کہ غور و فکر سے دیکھو کیف کان عاقبۃ المکذبین۔ جن قوموں نے تو انین الہی کی تکذیب کی ان کا کیا انجام ہوا؟ ظاہر ہے کہ ان مقامات میں اقوام کے دنیاوی انجام کی طرف



توجہ دلانا ہی مقصود ہے۔ کیونکہ آخری انجام تو کسی کی آنکھوں کے سامنے نہیں آسکتا۔ ان میں سے بعض قویں قانونِ خداوندی کے مطابق صفحہ کائنات سے حرفِ مکرر کی طرح مٹ گئیں اور ان کی محض داستانیں تاریخ میں باقی رہ گئیں۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ آحَادِيثًا ۷ (۲۳/۲۴)۔ اور بعض قویں گو زندہ رہیں (اور اب بھی زندہ ہیں)

مگر ان کی حالت عبرت و موعظت کی زندہ داستان ہے۔ پھر قرآنِ کریم نے ان تاریخی نتائج کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ واضح الفاظ میں یہ بھی ذہن نشین کرا دیا کہ اس دنیا میں عزت و توقیر کی زندگی اللہ کی رحمت ہے اور یہاں کی ذلت و خواری اس کا عذاب اور غضب ہے۔ مثلاً کہیں یہ وعدہ ہے کہ تم میں سے جو

ایمان لاتے اور عملِ صالح کرتے ہیں ان کو وہ زمین کا حاکم بنائے گا (۲۴/۵۵)۔ کہیں یہ تشریح ہے کہ جو کوئی عملِ صالح کرے گا وہ مرد ہو یا عورت شرط یہ ہے کہ مومن ہو تو ہم اس کو خوشگوار زندگی بسر کرائیں گے اور جو اچھے کام ان سے عمل میں آتے ہیں ان کا اجر دیں گے (۱۶/۹۷) جو کوئی اللہ کی راہ میں گھر چھوڑتا ہے اسے اس

دنیا میں بہترین گھر دیا جاتا ہے (۱۶/۴۱) جو اس کے دئے ہوئے کی قدر کرتا ہے اپنی قوتوں اور اس کی نعمتوں کو صحیح صحیح طور پر مصرف میں لاتا ہے، کہ یہی عملاً

## قرآن کی تعلیم

شکرِ نعماء ہے، اللہ اپنی ان نعمتوں میں اور اضافہ کرتا جاتا ہے (۱۴/۷) برعکس اس کے جو قوانین خداوندی سے بلا علم و ہدایت، بلا دلیل و برہان جھگڑتا ہے۔ ان قوانین سے مُنہ موڑ لیتا ہے۔ وہ خود بھی منزلِ مقصود تک لے جانے والے راستہ سے بہک جاتا ہے اور دوسروں کو بھی بہکاتا ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اسے دنیا میں بھی ذلت و خواری نصیب ہوگی۔ اور اس کے بعد کی زندگی میں عذابِ حریق ملے گا (۲۲/۸) اسی طرح جو اس کے قوانین اس طرح سے مانے کہ جو بات اپنے مطلب کی ہو اسے اختیار کر لے اور جس میں کسی قریانی و ایثار کی ضرورت ہو اور وہ اس کی طبعِ سہولت پسند پر گراں گزرے، اس سے پہلو تہی کر لے، اس کے لئے بھی خیزی فی الحیوۃ الدنیا کا رسوائی آمیز عذاب بتایا گیا ہے (۲/۸۵) ایک دو نہیں سینکڑوں آیات اسی اصول کی تشریح اور اسی نکتہ کی تفصیل میں موجود ہیں۔

اس تصور کو دلوں میں اچھی طرح جاگزیں کر دینے کے بعد مسلمانوں کے لئے ایک دستور العمل ایک لائحہ حیات تجویز کیا گیا۔ جس سے وہ ان تمام نعمتوں کے وارث و مالک ہونے والے تھے جو اقوامِ گذشتہ کو مل چکی تھیں اور جن کا ذکر قرآنِ کریم میں موجود تھا۔ ان برکات کے حصول کی شرط ایمان و تقویٰ تھی۔

وَأُولَٰئِكَ أَهْلُ الْقُرْآنِ أَمَنُوا وَ اتَّقُوا لَعَلَّكُمْ عَلَىٰهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنْ

السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (۷/۹۶)

اگر ان بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم یقیناً ان پر آسمان سے برکت کے دروازے کھول دیتے۔

اور اسی ایمان و تقویٰ سے مسلمانوں کو دنیا میں ایک امتیازی زندگی عطا ہونے والی تھی۔

اے ایمان والو! اگر تم نے تقویٰ اختیار کیا تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا فرمائے گا اور تمہاری لغزشوں کو دور کر دے گا اور تمہاری کوتاہیوں سے درگزر کرے گا اور اللہ فضل

عظیم کا مالک ہے۔ (۸/۲۹)

اس لائحہ عمل کی رُو سے جو قرآن کریم نے تجویز کیا، ایک مسلم کی تمام زندگی

## مومنین کی زندگی

مسلحہ جدوجہد، غیر منقطع سعی و عمل، ان تھک کوشش، کوہ شکن عزم، غیر متزلزل استقامت، پیہم جہاد اور یکسر سپاہیانہ زندگی تھی جس کا مقصد محض "عاقبت سنوارنا" ہی نہ تھا بلکہ اپنے حسن عمل، اپنے اعمالِ صالح کے جیتے جاگتے نتائج اس دنیا میں دیکھ لینا بھی تھا۔ ذلت و پستی کی زندگی، محتاجی و فلاکت کی زندگی، مجبوری و بے بسی کی زندگی کہ جسے قرآن نے غضبِ خداوندی کا نتیجہ قرار دیا تھا، نصیبِ اعدا کر کے خود عزت و وقار کی زندگی، خوشحالی و خوش بختی کی زندگی، عظمت و شوکت کی زندگی، حکومت و سطوت کی زندگی بسر کرنا تھا، کہ یہی قرآن کریم کی رُو سے ایک مومن و عمل صالح کرنے والی جماعت کی حیاتِ طیب ہو سکتی تھی، ان کے نزدیک عبادات و اعمال کا حاصل "اپنے اللہ سے دین و دنیا کے حصے لینا تھا" (۳/۱۴۷)۔ وہ قوم بنا تھا جسے خدا نے تمام اقوامِ عالم میں سے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کر لیا تھا (۲۵/۳۲)۔ جسے نوعِ انسانی میں سے بہترین اُمت قرار دیا تھا (۳/۱۰۹)۔ ایسے عبادِ صالح بنا تھا جن کے لئے وراثتِ ارضی مقدر ہو چکی تھی (۲۱/۱۰۵) اور عملاً بتا دینا تھا کہ خدا کے اس اٹل قانون میں اس کے بندوں کے لئے ایک عظیم الشان پیغامِ موعظت ہے۔ بلاغِ مبین ہے (۲۱/۱۰۶) اور ساری دنیا کو دکھا دینا کہ ہاں جو سچے مومن بن جائیں۔

لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ

اللَّهِ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ (۱۰/۶۴)

ان کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی بشارتیں ہیں اور آخرت میں بھی۔ یہ قانونِ الہی

غیر متبادل ہے اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

نہیں بلکہ یہ ثابت کر دینا تھا کہ خدا کا یہ وعدہ کہ ہم دنیا میں اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی مدد کیا کرتے ہیں (۴/۵۱) یوں پورا ہوا کرتا ہے۔ سکّانِ ارضی کو عملاً بتا دینا تھا کہ کس طرح صبر و صلوة سے استعانت طلب کی جاتی ہے (۲/۴۵)۔ کس طرح دشمنوں کے حجمِ غفیر کے مقابلہ میں ڈٹ کر اللہ کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے کہ جس سے فتح و ظفر کا بچومتی ہے (۸/۴۵) الغرض انہیں اپنے اعمال سے عریضہ عالم پر اپنا دوامِ ثبوت کر کے یہ دکھا دینا تھا کہ یاد رکھو تمام خوبیاں، ہر قسم کی کامیابیاں، صرف مومنین کے لئے ہیں۔ مجاہدین کے لئے ہیں۔ اُولَئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَاُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۹/۸۸) اور یہی لوگ ہیں جن کے لئے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔ انہوں نے یہ کچھ کر کے دکھا دیا اور ان کے رب نے وہ تمام وعدے پورے کر دئے جو ان سے کئے گئے تھے۔

وَأُورَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضاً لَّمْ تَطُوهَا  
وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا (۳۳/۲۷)

اور اس نے تم کو (تمہارے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا اور اس سر زمین کا بھی جہاں ابھی تمہارے قدم بھی نہ پہنچے تھے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

یہ تعداد میں تھوڑے تھے۔ لیکن ان کے حوصلے بڑھانے کے لئے ان کے خوابوں میں انہیں دشمن تھوڑے دکھلائے جاتے (۸/۴۳)۔ جب مقابلہ ہوتا تو ان کے نورِ ایمان سے مخالفین کی آنکھیں خیرہ کر دی جاتیں جس سے یہ انہیں زیادہ دکھائی دیں (۸/۴۴) کہیں ایسے لشکروں کو بھیج کر ان کی مدد کی جاتی جنہیں کسی کی آنکھ نہ دیکھ سکتی اور جس سے ان کے دلوں میں سکینت و تثبیت اور ان کے اعدا کے دل میں ان کا رعب ڈال دیا جاتا (۸/۱۲)۔ کبھی ان میں کا ایک دو دو پر بھاری ہوتا (۸/۶۶) کبھی دس دس پر (۸/۶۵)۔ ہاتھ ان کے ہوتے اور مارنے والا خود خدا ہوتا۔ تیر ان کے ہوتے اور قضا ان کے ساتھ لپٹی ہوتی خدا کی (۸/۷۸)۔ ان کے مقابلہ میں نہ دشمنوں کی اکثریت ان کے کام آتی نہ قوت۔ اس لئے کہ یہ قوانینِ خداوندی کی روشنی میں قدم اٹھاتے تھے اور وہ ان راستوں کو بھول چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معرکہ ان کے ہاتھ اور ہر میدان ان کے قبضہ میں ہوتا اور اس طرح بتا دیا جاتا کہ فَاَنصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ کی دعائیں کیسے مستجاب ہوا کرتی ہیں۔ اللہ کسی کی

محنت ضائع نہیں کیا کرتا۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔ چنانچہ اس وعدہ کے مطابق وہ نمھاسا پودا جو دنیا بھر کی تند و تیز مخالف ہواؤں کے جھونکوں میں 'رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے لگایا گیا تھا' چند ہی سال کے عرصے میں ایک شجرِ طیب کی طرح یوں بڑھا، پھولا، پھلا کہ اس کی جڑیں تختِ الثریٰ میں اور اس کی شاخیں اوجِ ثریا پر تھیں، اور جسے دیکھ دیکھ کر اس جنتِ ارضی کا باغبان وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا تھا۔

محمد اللہ کے رسول اور ان کے ساتھی، کفار کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں محبت والے۔ تو ان کو دیکھے گا کبھی رکوع میں کبھی سجدوں میں۔ اللہ کے فضل و رضا جوئی کی جستجو میں لگے ان کے آثار بوجہ تاثیرِ سجدات ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ ان کے اوصافِ توریت میں ہیں اور انجیل میں۔ جیسے کہ پہلے اس نے اپنی سوئی نکالی، پھر وہ درست ہو کر اوپر کو اٹھری، پھر وہ اور موٹی ہوئی، پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی کہ (اسے دیکھ دیکھ کر) کسان کا دل مسرت سے اچھل پڑے اور اس سے حاسدین جل جائیں۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے مغفرت اور اجرِ عظیم کا (جو) وعدہ کر رکھا تھا (وہ یوں پورا ہو کر رہا)۔ (۲۸/۲۹)

چنانچہ اللہ کے یہ مومن بندے جب بعد میں اپنی دونوں حالتوں کا موازنہ کرتے، تو وہ وقت انہیں یاد آتا۔ جب وہ قلیل تھے، ملک میں کمزور و ناتواں شمار کئے جاتے تھے۔ اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ مخالف انہیں اچک کرنے لے جائیں۔ سو ایسی حالت میں اللہ نے ان کی حفاظت کی! اور اپنی مدد سے انہیں قوت دی اور انہیں بڑی نفیس چیزیں عطا فرمائیں کہ وہ خدا کے شکر گزار بندے بنیں۔ (۸/۲۶) اسی انقلابِ عظیم کا احساس تھا جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ لوگوں کو اکٹھا کر کے اعلان کرتے کہ

یہ وادی ضحمان وہی ہے جس میں ایک اونٹنی کرتا پہنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ وہ سخت مزاج آدمی تھے۔ کام لیتے تو تھکا دیتے تھے۔ کم کام کرتا تھا تو پیٹتے تھے۔ اور آج یہ حالت ہے اس وادی میں میرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی تیسری قوتِ حائل نہیں۔

لیکن یہ دور جس میں اسلام کا صحیح نصب العین، عبادات کا صحیح مفہوم، اعمالِ صالح کی سچی تفسیر، دنیا اور آخرت کا حقیقی تعلق، قرآنِ کریم کا عملی نظام، اسوۂ رسول اللہ کی بین تصویر، ہر مسلمان کے سامنے تھی، بہت

**اس کے بعد؟** | جلد ختم ہو گیا۔ خلافتِ ملوکیت سے بدل گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت (امپیریل ازم) کی تمام ضرباں ایک ایک کر کے اسلامی کلچر میں نمودار ہو

گئیں۔ اور اس کی انتہا عہدِ عباسیہ میں اس وقت ہوئی جب اسلامی تعلیم کا محض قالب اسلامی تھا اور یکسر عجمی ہو چکی تھی۔ حکومت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت سے طبائعِ عافیت کو شہ ہو چکی تھیں۔ وہ مجاہدانہ زندگی جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی اصل ایمان تھی بیگار کے بھرتی شدہ مستعار طبقہ کا کام سمجھا جاتا تھا۔ گرجوشی کی وہ فاروقی رُوح جو خالد بن ولیدؓ کو ریشم میں ملبوس دیکھ کر تمنا اٹھتی تھی (حالانکہ وہ میدانِ جنگ میں تھے اور جنگی ضرورت سے انہوں نے ایسا کیا تھا) اب عہدِ کھن کا افسانہ بن چکی تھی۔ برہنیت، جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اُمت میں نمودار ہو چکی تھی۔ علماء کا الگ طبقہ پیدا ہو چکا تھا جو بجائے تیر و سنان کے لفظی تاویلات کی جنگ میں مصروف تھا۔ اربابِ طریقت عجمی تصوف کے تباہ کن نظریہ کے ماتحت قوائے عملیہ کو مفلوج کر رہے تھے۔ یہ سب سامانِ ہلاکت پہلے سے جمع تھے کہ شامتِ اعمال نے تاتاریوں کے حملہ کی صورت اختیار کی، اسلام کی مرکزی قوت فنا ہو گئی۔ اس کی اجتماعیت بگڑ گئی۔ مذہب کے علمبردار حضرات مختلف گوشوں اور زاویوں میں جادبکے قوتیں سلب ہو چکی تھیں۔ جو صلے پست ہو چکے تھے۔ دنیا ہاتھ سے نکل گئی۔ عزت و وقار کی جگہ ذلت و پستی آگئی۔ شوکت و حشمت کی بجائے ذل و مسکنت چھا گئی۔ نماز، روزہ، حج

**پھر کیا ہوا؟** | زکوٰۃ، مناسک و شعائر کی شکل تو وہی تھی جو عہدِ اولیٰ میں تھی لیکن اب ان کے نتائج وہ نہ تھے جو اس وقت مرتب ہوتے تھے۔ قوموں کی تاریخیں ذہنیت کے

بدلنے سے بدل جاتی ہیں، اور اس قسم کے موثر شاہراہِ حیات میں بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اگر اس وقت نصیبِ یاری کرتا، ہمارے اعمال کی سزا کی مدت ختم ہو جانے والی ہوتی، تو نگاہ اس طرف جاتی کہ یہ تمام عبادات، یہ تمام اعمال، جن کی شکل اسلامی ضرور ہے، اس وقت تک حقیقی معنوں میں اعمال صالح نہیں ہو سکتے جب تک ان کے نتائج اس حیاتِ ارضی میں وہی کچھ نہ ہوں جو عہدِ مُحَمَّدؐ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهُ میں ہوئے۔ لیکن بدبختی کہ زاویہ نگاہ اُلْمی طرف بدلا۔ قرآن کریم نے

**زاویہ نگاہ کی تبدیلی** | جہاں جہاں کامیابی، فلاح، مسرور وئی، فوزِ عظیم، رزقِ کریم، شُخْصَن مَاب مومنین کے لئے مخصوص کیا تھا، ان سب کو آخرت کی زندگی سے مخصوص کر دیا گیا۔ اور کوئی عمل ایسا باقی نہ رکھا جس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی برآمد ہو سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ

باوجود عقیدہ کی شدت اور صوم و صلوة اور تسبیح و تہلیل کی پابندی کے، دنیاوی زندگی روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

یا وسعتِ افلاک میں تجکیرِ مسلسل      یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات  
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست      یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

اس وقت بجائے اس کے کہ یوں سمجھا جاتا کہ ان الفاظ و اعمال کی روح مفقود ہو چکی ہے، اس لئے صحیح نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ انہوں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیا کہ یہ تمام "اعمال" رائگاں نہیں جا رہے ان کا نتیجہ آخری زندگی میں برآمد ہوگا۔ غیر مسلم خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بجائے اس کے کہ ان پر رشک آتا انہیں اپنے لئے ہوئے سرمایہ کا غاصب سمجھتے، اپنے آپ کو یوں سمجھتے کی کوشش کی کہ یہ ابتلا کی زندگی ہے جس میں انہیں ہلکتی دی گئی ہے۔ آخری زندگی میں ہم جنتِ جاودانی اور وہ جہنمِ ابدی میں جائیں گے۔ عیسائی راہبوں کا فلسفہ ترکِ علاق، یونانی مشائخ کی حکمتِ ترکِ دنیا، ہندومت کا سنیاس، بدھ دھرم کا سنسار تیاگ، ایک ایک کر کے اسلامی کلمچر میں منتقل ہوتا چلا گیا۔ لہذا ترکِ دنیا، ترکِ علاق، ترکِ لذت، حتیٰ کہ "ترکِ ترک" صحیح اسلامی تعلیم کے خدو خال قرار پائے۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں      بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست!  
فقیر شہر بھی رہبانیت پہ تھا مجبور      کہ معرکے تھے شریعت کے جنگِ دست  
گریز گش مکش زندگی سے مردوں کی      اگر شکست نہیں تھی تو اور کیا تھی شکست

دولت کی فراوانی کے ساتھ اگر خدا فراموشی جمع ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ فساد فی الارض ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ نظامِ انسانیت کو تباہیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ایسی حالت سے یہ کہہ کر محترز رہنے کی تاکید کی تھی کہ دیکھنا کہیں دولت و قوت ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ تمہاری منزل مقصود اس سے کہیں بلند ہے۔ اب جہاں جہاں قرآنِ کریم میں ایسی تعلیم تھی اسے دنیاوی متاع و اسباب سے نفرت دلانے کے لئے بطور نصِ صریح پیش کرنے لگے۔ یعنی طبیب نے بڑھتی ہوئی حرارت کو روکنے کے لئے سر پر برف رکھنے کی تاکید کی تھی کہ کہیں سر عام نہ ہو جائے۔ یہ اسی برف کا استعمال فالج کے مریض پر کرنے لگ گئے۔ دنیاوی زیب و زینت کو قرآنِ کریم نے بالقرص حلال فرمایا تھا، وہ سب حرام قرار پائیں۔ چیتھڑے پہننا، بھوکے رہنا، خراب خستہ ہونا، بے گھر بے در زندگی بسر کرنا، "خدا کے بندوں" کی علامات متصور ہونے لگیں۔ غرضیکہ ایک ایک

کو کے اس رہبانیت کی تمام باتیں جزو اسلام (بلکہ اصل اسلام) بن گئیں جن کو روکنے کے لئے اسلام دنیا میں آیا تھا۔ اور جس کو اس نے بدعت قرار دیا تھا (۵۷/۲۷)۔ اسلام رہبانیت کا اس لئے مخالف نہیں کہ اس سے لوگ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بسیرا کر لیتے ہیں۔ وہ اس کے اس لئے خلاف

## اجتماعی زندگی

ہے کہ اس سے ایک ایسی انفرادی نجات کا تختیل پیدا ہو جاتا ہے جس کو اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اسلام افراد کی اصلاح اس لئے چاہتا ہے کہ اس سے اجتماعی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔ قوم افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ افراد کا تزکیہ نفس ضروری ہے، اس لئے ان افراد کے مجموعہ سے جو قوم مرتب ہوگی وہ خود بخود مزکی ہو جائے گی۔ اس کے نزدیک ہر مسلمان ایک عظیم الشان مشینری کا پرزہ ہے۔ جس کی ہر حرکت اور ہر جنبش ساری مشینری پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر ہر ایک پرزہ اپنی اپنی جگہ یا قوت الماس کے ریزوں پر قائم ہو۔ خالص سونے اور چاندی کا بنا ہو، لیکن اس کی حرکت کا تعلق باقی پرزوں سے نہ ہو تو اس مشینری کے لئے ایسے پرزے کا عدم اور وجود برابر ہے۔ اس کا کافی ذائقہ صالح (درست) ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اگر اسلام کا نصب العین ایسی انفرادی اصلاح ہی ہوتا تو رسول اللہ اور صحابہ کبار کو غاروں میں چھپ کر نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے سے تو کوئی نہیں روکتا تھا؛ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ایک ذہنیت کے بدل جانے سے تمام تعلیم کی رُوح بدل گئی اور عبادات کا مفہوم اسی قسم کی انفرادی اصلاح سمجھ لیا گیا ہے جسے اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ تمام عالم اسلامی میں اس عجیب ذہنیت کے ہلک جراثیم پھیل گئے اور آہستہ آہستہ تمام شوکت و حشمت و ذلت و مسکنت میں بدلتی چلی گئی۔ جیسی کہ آج حالت یہ ہے کہ وہی قوم جس کے نزدیک خدا کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر کے مترادف تھا، یا اس و حرمان کا مجتہد بن کے رہ گئی ہے۔ اور چونکہ وہی تعلیم جو اس و اماندگی، صنعت و ناتوانی، پریشانی و پراگندگی کے عالم میں وضع ہوئی تھی، اصل اسلام بن چکی ہے، اس لئے عوام تو اس نشے میں مست ہیں کہ یہاں جس قدر ہو سکے تباہ حال ہو جائیں، جو نہی آنکھیں بند ہوئیں، ہم جنت جاودانی میں جا بیٹھے۔ اور جنہیں مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کا احساس ہے وہ یہ سمجھ کر کہ یہ سب اسلام کا نتیجہ ہے اسلام سے بیزار ہو جاتے ہیں: "دین کے علمبرداروں" کو شکایت ہے کہ لوگ بے دین ہوتے جا رہے ہیں اور بے دینوں کو شکوہ ہے کہ یہ دین داران کی دنیا بھی تباہ کر رہے ہیں۔ مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے، اور نمازیوں کو گلہ ہے کہ ان اماموں میں "وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے" لہذا ان دونوں میں ایک ایسی حد فاصل، ایک گہری خلیج حاصل ہو چکی ہے کہ دونوں اپنے اپنے شعبوں

کو دین اور دنیا کو ناقابلِ اتصال سمجھ کر ایک دوسرے سے الگ ہو بیٹھے ہیں۔ ”حامیانِ دین“ نے اسی وجہ سے دین کو غریبوں تک محدود کر دیا ہے کہ وہاں ابھی ان کی عزت باقی ہے۔ مسلمان غرباء کے طبقہ کی حالت آج

## غریبوں کی حالت

اسی غریب و نادار طبقہ کے سر پر ہے۔ مولوی آتا ہے اور اپنا خمس وصول کرتے اسے عذابِ قبر اور نارِ جہنم سے بچنے کی دعائیں سکھا کر چلا جاتا ہے۔ شیخ طریقت اپنا ٹیکس لے کر پاسِ انفاس اور ذکرِ خفی و جلی سے روحانیت بڑھانے کا ”صراطِ مستقیم“ دکھا جاتا ہے۔ واعظ آتا ہے تو قرآنِ کریم کے رزقِ کریم اور حیاتِ طیبہ کے وعدوں کو عاقبت پر اٹھا کر اسے تھپک تھپک کر سلا جاتا ہے کہ یاد رکھو وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ۔ میں لے ایک بہت بڑی مسجد میں جمعۃ الوداع کے وعظ میں سنا کہ ”امام آخر الزماں کا ظہور اس وقت ہوگا جب مسلمانوں کا زوال و انحطاط اپنی انتہائی حالت کو پہنچ جائے گا۔ چاروں طرف سے مایوسی کی گھٹائیں ان پر چھا جائیں گی۔ اُمّت کی کوئی کرن باقی نہ رہے گی۔ اگر اس وقت تک امام صاحب نے نقاب نہیں اُٹا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی مسلمانوں کا زوالِ آخری حد تک نہیں پہنچا۔ جس وقت مسلمانوں کی تباہ حالی اس آخری حد تک پہنچ جائے گی آنے والا آئے گا اور تمام رونے زمین پر مسلمانوں کی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔ جو لوگ کچھ آسودہ حال ہیں ان پر ان ”محافظینِ دین متین اور حامیانِ شرعِ مبین“ کی نظر کرم اور قسم کی ہے۔ آئے دن آپ کو ایسے اشتہارات چسپاں نظر آئیں گے کہ ایک ہزار روپیہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو یہ ثابت کر دے کہ نماز میں اُمین بالجوہر نہیں کہنی چاہیے۔ ان مقتدیانِ دین نے اپنے اپنے مراکز قائم کر رکھے ہیں۔ معتقدین کا حلقہ گرد ہوتا ہے۔ ہزاروں روپے ایسے ہی مجادلات و مباحثات میں صرف کر دئے جاتے ہیں۔ عجاظ مخالف کے ائمہ و مشائخ، علماء و اسلاف کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ مقدمے چلتے ہیں۔ دونوں طرف سے ہزار ہا روپیہ ضائع ہو جاتا ہے۔ دینے والے اسے ”فی سبیل اللہ“ سمجھ کر جنت کے خریدار بنتے ہیں۔ لینے والے اپنے جہادِ کبیر کا صلہ سمجھ کر لیتے ہیں۔ اور پھر احسان بھی رکھتے ہیں۔ حالانکہ غور سے دیکھئے کہ اللہ نے اس سلسلہ کائنات کو ایک عظیم الشان مقصد کے لئے تخلیق کر کے اسے انسان کے لئے مسخر کر دیا۔ پھر ان انسانوں میں سے اُمّتِ مسلمہ کو خیر اُمّت کہہ کر اس کی تحصیل کے لئے انہیں چُن لیا۔ تو کیا وہ مقصدِ عظیم وہ نصب العین جو فاطمہ کائنات نے اس اجتناب و انتخاب کے اندر مضمّن رکھا تھا، اس کا حصول، اس کا دار و مدار اس بات پر ہوگا یا نہیں آئینِ آہستہ کہنی چاہئے، یا آواز بلند، ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا زیرِ ناف۔ مجھے ان حضرات کی نیت پر شبہ



کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ دراصل قصور ان کا بھی نہیں، اصل یہ ہے کہ جس چیز کو اسلامی تعلیم کہا جاتا ہے اور جن اداروں میں یہ تعلیم دی جاتی ہے ان کی بنیاد غلط ہے۔ فلاح و سعادت کو آخروی زندگی کے ساتھ مخصوص کر دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال کو نتائج کے اعتبار سے نہ پرکھا جائے بلکہ محض نظری لحاظ سے پرکھا جائے۔ یعنی ایمان و اعمالِ صالح کی پہچان حسنِ مآب، نیک انجام، کامیاب زندگی، حیاتِ طیبہ، استخلاف فی الارض نہ ہو۔ بلکہ اس کی سند اس قسم کے سرٹیفکیٹ ہوں جو مصری خلفائے عہد میں ہر مسلمان کو اپنے عقیدہ کے صحیح ہونے کی شہادت میں اپنی جیب میں رکھنے پڑتے تھے۔ قصور سارا اس ذہنیت کا ہے اور جب تک یہ ذہنی تختل نہیں بدلتا تبدیلی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔

نوع دیگر ہیں جہاں دیگر شود

ایں زمین و آسماں دیگر شود

**مذہب پرست طبقہ کی حالت** | آپ اس طبقہ کو چھوڑیے جو اسلامی مناسک و عبادات پر عامل نہیں۔ اس طبقہ کو دیکھیے جو ان عبادات پر کار بند

ہے، ان کی دنیاوی حالت کیسی ہے۔ قرآن کریم نے انہی لوگوں کو کامیاب کہا تھا۔ **قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ** (۱۱-۲۳/۱) انہی کے لئے آیا تھا پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ روز بروز بجائے افلح و اصلاح ہونے کے ناکام و نامراد ہوتے جا رہے ہیں، کیا محض اس لئے نہیں کہ یہ "کامیابی" یہ "فلاح و صلاح" محض آخرت سے منسلک کر دی گئی ہے۔ قرآن کریم نے کہا تھا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ  
وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ

(۲۴/۲)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے۔ یعنی ایمان لائے اس پر جو محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے جو حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔ ان سے ان کی برائیاں دور کر کے ان کی حالت کو بہترین بنا دیا جائے گا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جسے صالح کہا جاتا ہے اس کی زندگی انتہائی قابلِ رحم گزر رہی ہے۔ کیا انہوں نے کبھی سوچا بھی ہے کہ بالآخر ایسا کیوں ہے؟ لیکن ان حضرات کو سوچنے کی ضرورت ہی نہیں، انہوں نے اپنے آپ کو یہ فریب

دے رکھا ہے کہ حالت کی بہتری کا مقام صرف حیاتِ آخرت ہے، یہ دنیا نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا جو آج جگر سوز و خود افسردہ نہیں ہے وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا جس قوم کی نفیریں امروز نہیں ہے۔

شہدائِ کریم میں ہے:-  
 بد اعمال لوگ کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے کہ ان سب کا مرنا اور جینا، حیات و ممات یکساں ہو جائے۔

یہ بہت بڑا فیصلہ ہے (جو یہ کئے بیٹھے ہیں)۔ (۲۱/۳۵)

**صالح اور غیر صالح کی زندگی** یعنی قرآنِ کریم کی رو سے ایک مومن و صالح کی زندگی ایک بد اعمال کی زندگی کے برابر نہیں، بلکہ متمیز اور ذی شان ہونی چاہیے۔

یہ خدائے تعالیٰ کا فیصلہ ہے، جو اس کے خلاف سمجھے وہ سراسر غلطی اور گمراہی پر ہے، لیکن کیا واقعی آج ان کی زندگی جہنمیں مومن و صالح کہا جاتا ہے، بد اعمال کفار کے مقابلہ میں امتیازی زندگی ہے؟ واقعات تو اس کے خلاف بتا رہے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اعمال و ایمان کے صلے میں رزقِ کریم، عزت و آبرو کی روٹی (۲۲/۵۰) دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر آج یہ کیوں ہے کہ سب سے زیادہ ذلت و رسوائی کی روٹی مسلمان کو مل رہی ہے؟ یہ محض زہبِ داستان نہیں بلکہ ٹھوس حقیقت ہے کہ آج محض روٹی کی خاطر مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی ہر دو اعتبار سے ذلت و خواری کے وہ منازل طے کرنے پڑتے ہیں جن کے تصور سے شرافت کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری یہ زبوں حالی اس لئے ہے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ رکھا ہے بجا اور درست؟ لیکن اس "اسلام چھوڑنے" کی تفصیل کیا ہے؟ صرف اس قدر کہ لوگ انگریزی پڑھ گئے ہیں، ڈاڑھی منڈا لگ گئے ہیں، ان کے ٹخنے ڈھکے ہوئے ہیں، وغیرہ ذالک۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کے یہ سب انداز درست اور صحیح ہیں اور جو آپ کے معیار کے مطابق پکے "مومن" ہیں وہ کون سی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ جس طرح جی چاہے اپنے آپ کو خوش کر لیجئے، لیکن یہ ساری خرابی اس نظریے کی ہے جو اسلام کے ضعف و انتشار کے زمانہ میں پیدا ہوا اور جس کی رو سے مسلمان کو مسلمان ہونا تو ایک طرف، انسان ہونا بھی نصیب نہ ہو سکا۔ اس تمام خرابی کا ایک اور صرف ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو جگا کر، جھنجھوڑ چھوڑ کر بتایا جائے کہ یاد رکھو! دنیا کی ذلت و خواری خدا کا عذاب ہے یہاں کی شوکت و حشمت

**علاج** | کی زندگی عین اسلامی زندگی ہے۔ مسلمان دنیا میں امتیازی زندگی بسر کرنے آیا ہے۔ عزت و وقار، جاہ و سطوت، سر بلندی و سرفرازی، اس کے اعمالِ صالح کے لازمی نتائج ہونے چاہئیں۔ جو اعمال ایسے نتائج پیدا نہیں کرتے ان کی صورت اسلامی ہو تو ہوا ان کی روح برگز اسلامی نہیں۔ جو یہاں ذلیل ہے اور اس ذلت پر قانع، وہ آخرت میں معزز نہیں ہو سکتا۔ جو اپنی موجودہ زندگی نہیں سنوار سکتا اور اس رسوائی میں مطمئن ہے، اس کی عاقبت کبھی نہیں سنور سکتی۔

مَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (۱۲/۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔

یقین مانئے کہ اس تعلیم کی اشاعت میں آپ کی سخت سے سخت مخالفت ہوگی۔ معتقدات کا چھڑانا، فیون چھڑانے سے کم نہیں ہوتا۔

گر قسم حضرت ملا ترشش دوست

نکا بش مغز رانشا سدا ز پورست

اگر با این مسلمانان کہ دارم!

مرا از کعبہ می راند حق دوست

لیکن اگر آپ کو تسلیم ہے کہ یہ تبدیلی از بس لا بدی ہے، تو کسی مخالفت کی پروا نہ کیجئے۔ کہتے اور بر ملا کہتے۔ بردار تو ال گفت بہ منبر نتوال گفت۔ ایک دفعہ اس "اسلامی رہبانیت" کے اعتقاد کو توڑ دیجئے اور صحیح اسلامی تعلیم سامنے لے آئیے پھر دیکھئے کہ ہماری غازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج، ہماری زکوٰتیں وہی نتائج پیدا کرتی ہیں یا نہیں جو ایک مومن کی اس دنیا کی زندگی کے خصوصی امتیازات ہیں۔ اور آخرت کا تو پھر پوچھنا ہی کیا؟ جب خدا کی کتاب زندہ ہے۔ اس کے اندر اس کے رسول کا اسوہ حسنہ زندہ ہے، تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اس پر عمل کرنے والی قوم دنیا میں زندہ نہ ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کا حق ہی اس قوم کو ہے اس لئے کہ بقا للافلاح فطرت کا قانون ہے اور اس قوم کا ہر عمل، عمل صالح ہے جو اس کے اندر زندہ اور پایندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرتا جاتا ہے۔ اقوام مغرب نے فطرت کے اسی اصول کو اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کو بھانپ لیا اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چند دنوں میں جو نتائج برآمد ہو گئے ظاہر و باہر ہیں۔ لیکن ان کی بدبختی کہ وہ اپنے نظام زندگی کو خدا کی متعین فرمودہ مستقل اقدار کے تابع نہ رکھ سکے۔ اس لئے ان کا نظام، انسانیت کے لئے ممد حیات

لے ان امور کی تفصیل "اسباب زوالِ امت" میں دیکھئے۔

ہونے کے بجائے وجہِ بلاکت بن گیا۔ لیکن بایں ہمہ انہیں وہ قوتیں تو حاصل ہو گئیں جن کی وجہ سے آج تمام دنیا کے مسلمان ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ناپا اتیدار ہی سہی، تسخیرِ فطرت تو ہوئی۔ برعکس اس کے مسلمانوں کے اس غلط اعتقاد سے تو ان کی یہ حالت ہو گئی۔

قبضے سے اُمت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی۔

اگر ان کے اعمال کہیں حقیقی معنوں میں اعمالِ صالح ہو جاتے تو پھر اس جنتِ ارضی کا پوچھنا ہی کیا تھا؟۔ ایسی جنت کہ جس میں اس جہنم کا گزر ہی نہ ہو جس میں یورپ آج گزر رہا ہے اس لئے کہ قرآنِ کریم کے مطابق ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض، یعنی اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام ہے۔ استبدادِ ملوکیت کی لعنت نہیں جس میں آج مسلم و غیر مسلم سب حکومتیں گرفتار ہیں۔

یاد رکھیے! جس ایمان و عملِ صالح کا جیسا جاگتا 'زندہ و پائندہ نتیجہ' اس دنیا میں 'خدا کی بادشاہت' کا قیام نہیں۔ یعنی جماعتِ مومنین کا استخلاف فی الارض نہیں، ضابطہ الہی کے مطابق جہاں بانی و جہاں رانی نہیں، وہ ایمان، قرآنی ایمان نہیں۔ وہ اعمال، اسلامی اعمال نہیں۔ انہیں ایسا سمجھنا نفس کا دھوکا ہے۔ نگاہ کا پھیر ہے۔ مسلمان کے لئے ایمان و اعمالِ صالح کے پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے۔ باقی سب فریبِ نظر ہے۔ ابلیس کے دھوکے ہیں۔

زقرآن پیشِ خود آئینہ آویز      دگرگوں گشتہ! از خویش بگریز  
ترازوستے بنہ کردار خود را      قیامت ہائے پیشیں را برانگیز



# یہ زمین کس کی ہے

(اگست ۱۹۵۷ء)

رزقِ خود را از زمینِ بُردنِ رواست  
این متاعِ بندہ و ملکِ خداست

ہمارے ایک اچھے سمجھ دار دوست اگلے دنوں کہہ رہے تھے کہ اس دس سال کے عرصے میں ہمارے ملک نے بڑی نمایاں ترقی کی ہے۔ جب اُن سے اس اجمال کی تفصیل پوچھی گئی تو انہوں نے کہا کہ پاکستان کے بجٹ میں درج شدہ اعداد و شمار کی رُو سے ۱۹۴۸-۴۹ء میں ملک کی کل آمدنی قریب چھیا سٹھ کروڑ تھی۔ اور ۱۹۵۷-۵۸ء میں میزانِ آمدنی قریب ایک ارب انتالیس کروڑ ہے۔ یعنی اس دس سال میں ملک کی آمدنی دُگنے سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ یہ کیا کم ترقی ہے؟

ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جس آمدنی کو وہ "ملک کی آمدنی" سمجھ رہے ہیں وہ درحقیقت "حکومت کی آمدنی" ہے۔ اور ملکوں کی ترقی یا تنزّل کا اندازہ "ملک کی آمدنی" سے لگایا جاتا ہے نہ کہ حکومت کی آمدنی سے۔ اگرچہ وہ اس وقت تو خاموش سے ہو گئے لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ اچھی طرح سمجھ نہیں سکے کہ ملک کی آمدنی اور حکومت کی آمدنی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہی احساس ان سطور کے لکھنے کا محرک ہوا ہے۔ اس لئے کہ ہمارا خیال ہے کہ (ہمارے اس دوست کی طرح) بہت سے احباب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ چونکہ ہر سال بجٹ میں ہماری آمدنی کی میزان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اس لئے ہمارا ملک اقتصادی طور پر کافی ترقی کئے جا رہا ہے۔ اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے ضروری ہے کہ اصل حقیقت سے واقف ہو جائے۔

ہمارے سال رواں کے بجٹ میں قریب ایک ارب انتالیس کروڑ کی آمدنی دکھائی گئی ہے۔ ذرا غور کیجئے وہ موٹی موٹی مدات

کیا میں جن پر یہ آمدنی مشتمل ہے۔

کسٹم (بحری چونگی)

قرب چوالیس کروڑ

اکسائز ڈیوٹی (چونگی آب کاری)

قرب چودہ کروڑ

انکم ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس

قرب اکیس کروڑ

سیلز ٹیکس

قرب چودہ کروڑ

منک اور متفرق ٹیکس

قرب چار کروڑ

نئی تاجاویز کے مطابق ٹیکس

قرب آٹھ کروڑ

یعنی ایک ارب پانچ کروڑ کے قریب ہی ہو گئے۔ باقی کچھ ریلوے کی اور کچھ ڈاک خانہ وغیرہ کی آمدنی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی مدات سے قطع نظر ان بڑی بڑی مدات پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں "ملک کی آمدنی" کس قدر ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک تاجر ولایت سے کوئی چیز منگاتا ہے جس کی قیمت (بندرگاہ پر پہنچ کر) سو روپے بیٹھتی ہے۔ اس پر حکومت پچاس روپے کسٹم ڈیوٹی وصول کرتی ہے۔ لہذا ساحل پر پہنچ کر اس کی قیمت ڈیڑھ سو روپے ہو گئی۔ اس ڈیڑھ سو روپے پر (یوں سمجھئے کہ) بیس روپے سیلز ٹیکس ہے۔ یہ ہونے ایک سو ستر تیس روپے دکاندار کا منافع سمجھ لیجئے۔ لہذا خریدار کو اس کے دو سو روپے دینے پڑے۔ دکاندار کے اس منافع سے حکومت نے دس روپے انکم ٹیکس وصول کیا۔

آپ نے غور کیا کہ اس لین دین میں ہوا کیا؟ حکومت نے اسی روپے ملک کے اندر بسنے والے (اپنے) لوگوں سے وصول کئے۔ یہی وہ رقوم ہیں جن کی میزان کو بجٹ میں پاکستان کی آمدنی دکھایا گیا ہے۔ آمدنی کے معنی میں PRINCIPAL HEADS یعنی "اندر آنے والی چیز" آپ سوچئے کہ ان تمام رقوم میں کوئی رقم بھی ایسی ہے جو کہیں باہر سے ملک کے اندر آتی ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ یہ تمام رقوم ایسی ہیں

**دولت کی گردش**

جو ملک کے اندر ہی گردش کرتی رہی ہیں۔ ملک میں ایک ادارہ ہے جسے حکومت (گورنمنٹ) کہتے ہیں۔ اس کے ذمہ ملک کا نظم و نسق برقرار رکھنا ہے۔ اس نظم و نسق کے لئے اسے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکومت یہ روپیہ مختلف مدات میں ملک کے لوگوں سے وصول کرتی ہے اور پھر ملک میں خرچ کر دیتی ہے۔ لہذا یہ روپے کی گردش

ہے۔ ملک کی آمدنی

(CIRCULATION OF MONEY)

یا (INCOME) نہیں ہے۔ اس لئے یہ جو کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں قریب چھیا سٹھ کروڑ روپے آمدنی تھی اور ۱۹۵۴-۵۸ء کے بجٹ میں یہ آمدنی دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے تو اس کے بجائے کہنا یہ چاہئے کہ ۱۹۳۸-۴۹ء میں حکومت اور لوگوں کے درمیان قریب چھیا سٹھ کروڑ روپے نے گردش کی۔ اور ۱۹۵۴-۵۸ء میں قریب ایک ارب انتالیس کروڑ روپے کے گردش کرنے کی توقع ہے۔ ملک کا جو روپیہ ملک کے اندر گردش کرتا ہے اسے ملک کی آمدنی کہنا حدیثِ بے خبراں ہے اور اس گردش (CIRCULATION) کی زیادتی کو اقتصادی ترقی سمجھنا خوش فہمی۔

**اپنا ہی خون** اپنے روپے کو آمدنی سمجھنے کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ ایک گنا سخت سی ہڈی چبا رہا تھا۔ ہڈی نے اس کی زبان اور ہونٹ زخمی کر دیے جن سے خون نکلنے لگ گیا۔ وہ کتا اس خون کو مزے لے کر چاٹتا تھا اور جی میں خوش ہو رہا تھا کہ وہ (خون) ہڈی سے نکل رہا ہے حالانکہ وہ خود اپنا ہی خون کھا رہا تھا۔ کہیں باہر سے نہیں آ رہا تھا۔

جو روپیہ ہمارے ملک میں ایک جیب سے نکل کر دوسری جیب میں چلا جائے اسے ملک کی آمدنی نہیں سمجھنا چاہیے۔ ملک کی آمدنی وہ ہے جو کہیں باہر سے آئے۔ جس طرح خوراک اسی کو کہتے ہیں جو باہر سے جسم کے اندر آئے جسم کے خون کا جسم کے اندر گردش کرنا، خوراک (یا غذا) نہیں کہلا سکتا۔ نہ ہی یہ غذا کا کام دے سکتا ہے جس پر جسم کی پرورش کا دار و مدار ہے۔ حکومت کی آمدنی جسم کے اندر خون کی گردش کا نام ہے۔ غذا کا نام نہیں۔ حکومت چونکہ ایک بہت بڑا ادارہ ہے اس لئے اس کا نظم و نسق اور آمدنی کا سلسلہ ذہن میں نہیں آتا۔ اسے سمجھنے کے لئے آپ اپنے قصبہ کی میونسپلٹی کو سامنے لائیے۔

**میونسپل کمیٹی کی مثال** یہ میونسپلٹی چونگی وصول کرتی ہے۔ کن سے۔ شہر کے لوگوں سے۔ یہ اس میونسپل کمیٹی کی آمدنی ہے۔ اس آمدنی سے وہ شہر کی سڑکوں، نالیوں وغیرہ کا انتظام کرتی ہے۔ اب آپ سوچتے کہ چونگی کی آمدنی، میونسپل کمیٹی کی آمدنی ہوتی ہے یا آپ کے شہر کی آمدنی۔ آپ یقیناً کہیں گے کہ وہ کمیٹی کی آمدنی ہے۔ شہر کی آمدنی نہیں۔ اس سے یہ سمجھ لیجئے کہ کسٹم، سیلز ٹیکس، انکم ٹیکس وغیرہ سب حکومت کی آمدنی کی مدات ہیں۔ ملک کی آمدنی کی نہیں۔

یہاں سے لازماً یہ سوال سامنے آئے گا کہ یہ حکومت کی آمدنی کی مدات ہیں تو ملک کی آمدنی کون سی ہوگی ملک کی آمدنی وہ ہوگی جو ملک کے اندر کہیں باہر سے آئے۔

**ملک کی آمدنی** | باہر سے کیسے آئے؟ اس طرح کہ (مثلاً) جاپان کو گندم کی ضرورت ہو اور ہمارے پاس فاضل گندم ہو۔ ہم یہ گندم جاپان کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس گندم کی قیمت فروخت ہمارے ملک کی آمدنی ہوگی۔ اس لئے کہ یہ رقم باہر سے آئی ہے۔ لیکن ہم گندم کو باہر اسی صورت میں بھیج سکیں گے جب یہ ہماری اپنی ضرورت سے زائد ہو۔ اگر ہمارے ہاں گہوں اتنا ہی پیدا ہوتا ہو جتنے کی خود ہمارے ملک کو ضرورت ہے، تو ہم باہر کیا بھیجیں گے؟ لہذا ہمارے ہاں گہوں اتنا پیدا ہونا چاہیے کہ ہم ملک کی ضروریات پورا کرنے بعد دوسرے ملکوں کو بھی بھیج سکیں جس سے ہمارے ملک کو آمدنی ہو سکے۔ آپ پوچھیں گے کہ ہمارے ملک کو اس آمدنی کی ضرورت کیا ہے؟ اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ جس طرح جاپان کو ہمارے ہاں سے گہوں خریدنے کی ضرورت پڑتی ہے، ہمیں بھی دوسرے ملکوں سے کچھ نہ کچھ خریدنا پڑتا ہے۔ (مثلاً) دوائیاں، مشینری وغیرہ ایہ چیزیں اسی آمدنی سے خریدی جاسکتی ہیں۔

**زمین کی پیداوار** | لہذا بات سمٹ کر یہاں آگئی کہ کسی ملک کی حقیقی آمدنی وہ ہے جو اس ملک کی زمین سے پیدا ہو۔ اگر وہ پیداوار اتنی ہے کہ جس سے خود اس ملک کی اپنی ضروریات بھی پوری نہیں ہو سکتیں تو اس ملک کو روٹی بھی دوسروں سے خریدنی یا مانگنی پڑے گی، اگر یہ پیداوار اتنی ہے کہ وہ اس ملک کی اپنی ضروریات ہی پورا کر سکتی ہے تو اسے دوسری چیزیں باہر سے نہیں مل سکیں گی۔ لیکن اگر یہ پیداوار اتنی ہے کہ وہ اپنی ضروریات پورا کر لینے کے بعد اسے باہر بھی بھیج سکتا ہے (خواہ خام شکل میں یا مصنوعات کی صورت میں) تو اس ملک کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہے گی۔ اس ملک کو فی الحقیقت خوشحال ملک کہہ سکیں گے

لہذا کسی ملک کی زندگی اور خوشحالی کا راز

زمین

میں ہے۔ خوش بخت ہے وہ ملک جس کے پاس زمین کافی ہو۔ جن ملکوں کے پاس زمین نہیں، زندہ رہنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ مغربی ممالک سے لگائیے۔ مثلاً انگلستان کو سمجھئے۔ اسے اپنی خوراک کا بیشتر حصہ باہر سے منگانا پڑتا ہے۔ اس کے لئے اس نے پہلے تو یہ کیا کہ

**جن کے پاس زمین نہیں** | اور دراز ملکوں میں اپنی نوآبادیات قائم

کیں۔ ان آبادیوں سے اس نے خام پیداوار حاصل کی۔ پھر اپنے ہاں ایسی چیزیں تیار کرنا شروع کیں جن کی



دوسرے ممالک کو ضرورت تھی۔ پھر ایسی منڈیاں تلاش کیں جن میں ان مصنوعات کی کھپت ہو۔ لیکن یورپ میں اور ایسے ممالک بھی تھے جنہیں اپنی مصنوعات کے لئے انہیں منڈیوں کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ جب منڈیاں تھوڑی ہوں اور مال بیچنے والے زیادہ تو ان میں باہمی کش مکش ہوگی۔ یہی وہ کش مکش ہے جو دنیا میں اس قدر خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کا موجب بنی رہی ہے۔ لیکن آپ سوچئے کہ جن ملکوں کو اس وقت ان مصنوعات کی ضرورت ہے اگر وہ انہیں خود اپنے ہاں تیار کرنے لگ جائیں تو پھر ان ممالک کا حشر کیا ہو جن کی زندگی کا دار و مدار ان مصنوعات کی فروخت پر ہے۔ اس سے آپ نے پھر دیکھ لیا کہ کسی ملک کی زندگی اور خوش حالی کا راز

### ارض یعنی زمین

میں ہے۔ بالفاظِ دیگر ملک کی حقیقی آمدنی وہ ہے جو زمین سے باہر آئے اسی پر قوموں کی زندگی کا انحصار ہے۔ جس ملک کی زمین کافی غلہ پیدا کر سکتی ہے وہ ملک کبھی بھوکا نہیں مر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ارض جس کو اس قدر اہمیت دی ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا کہ **وَجَعَلْنَا** **اَرْضَ كِي اہمیت** **لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَسْتُمْ لَهَا بِرَازِقِينَ** (۱۵/۲۰) ہم نے تمہارے لئے سامانِ زندگی ارض میں رکھا ہے۔ تمہارے لئے بھی اور ان کے لئے بھی جنہیں تم رزق بہم نہیں پہنچاتے۔

جب انسان ابتدائی وحشی زندگی کے بعد تمدنی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوا تو اس سے کہا گیا کہ **وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مَسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِينٍ** (۲۱/۳۶) تمہارے لئے ارض میں مستقر ہے اور ایک وقت معینہ تک سامانِ زیست۔ تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے بھی متاعاً لکم **وَلَا نَعْمٰ لَكُمْ** (۴۹/۳۳)

اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا کہ زمین میں سامانِ زیست کے اس قدر خزانے موجود ہیں کہ وہ کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتے۔ لیکن وہ از خود باہر نہیں نکلتے۔ وہ خدا کے مقرر کردہ پیمانوں یعنی طبعی قوانین کے مطابق باہر آتے ہیں۔ **وَ اِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنزِلُہٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ** (۱۵/۲۱) دوسری جگہ **بِقَدَرٍ مَا يَشَاءُ** (۲۲/۲۴) کہا ہے۔ یعنی اس کے لئے خدا نے قانون مقرر کر رکھا ہے۔ اور وہ قانون ایسا نہیں جس کا کسی کو علم نہ ہو۔ زندہ قوموں میں زراعت کے متعلق نت نئے تجربات ہوتے جاتے ہیں۔

مٹی (SOIL) میں نئی زندگی اور تازگی پیدا کرنے اور اس میں پیداوار کی صلاحیت اور توانائی بڑھانے کے نئے نئے آلات اور ادویات تیار کی جاتی ہیں۔ فصلوں کو کیڑوں اور موسموں کی شدت کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے نہایت موثر تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ آب پاشی کے عجیب و غریب ذرائع دریافت کئے جاتے

## قوانینِ فطرت

ہیں جو خدا کی طرف سے اس مقصد کے لئے متعین کئے گئے ہیں کہ زمین کے خزانوں کو باہر کیسے نکالا جائے جو قوانین فطرت کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کوشش کرتی ہیں، وہ خدا کی رحمتوں سے نوازی جاتی ہیں۔ ان کے ہاں رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتی خدا کے عذاب میں مانوخذ ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے پیداوار کی کمی کو عذاب کہا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے: **وَلَقَدْ آخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَ نَقْصِ الْمَرَاتِ..... (۷/۱۳۰)** ہم نے فرعون کی قوم پر قحط سالی اور پیداوار کی کمی کا عذاب مسلط کر دیا۔ دوسری جگہ خود بھوک کو خدا کا عذاب کہا گیا ہے۔ سورہ نحل میں ہے: **ضَرْبَ**

## بھوکِ خدا کا عذاب ہے

اللَّهُ مَثَلًا. اللہ تمہیں ایک مثال کے ذریعہ بات سمجھانا چاہتا ہے۔ **قَرِيَةً** ایک بستی تھی۔ گانت امینۃ مطمئنۃ یاتیہا رزقہا رغداً من کل مکان اس کے رہنے والے نہایت امن اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے لئے سامانِ زلیست (رزق) ہر طرف سے بافراط چلا آتا تھا۔ **فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ** انہوں نے خدا کی ان نعمتوں کی ناسپاس گزاری کی۔ اس کے قوانین کی اتباع سے انکار کر دیا۔ زمین سے جس طرح بافراط رزق حاصل کیا جانا چاہیے تھا ان طریقوں کو چھوڑ دیا۔ **فَأَذَاقَهَا اللَّهُ الْجُوعَ وَ الْخَوْفَ** تو اللہ کے قانون کے مطابق ان پر بھوک کا عذاب مسلط ہو گیا۔ اس طرح جب وہ روٹی کے لئے دوسروں کے محتاج ہو گئے تو جن سے روٹی ملنے کی توقع تھی، ان کا خوف بھی ان کے دل میں پیدا ہو گیا۔ وہ ان سے ہر وقت ڈرتے رہتے تھے۔ ان سے خائف ہوتے تھے کہ کہیں وہ ان سے ناراض نہ ہو جائیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو گا کہ خدا نے ان کی حالت ایسی کیوں کر دی؟ اس کے متعلق کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا نے یونہی خواہ مخواہ ان کی حالت ایسی کر دی۔ قطعاً نہیں۔ خدا کسی پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ ان لوگوں کی اپنی کرتوتوں کا نتیجہ تھا۔ یہ مصیبتیں ان کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ تھیں۔

قرآن کی ان تصریحات کو سامنے رکھتے اور پھر اپنے ملک کی حالت پر غور کیجئے۔ ہمارا ملک (سابق پنجاب اور سندھ کی وادی) ساری دنیا میں اناج کی کوٹھی (GRANARY) کے نام سے مشہور تھی۔ اس میں اتنا غلہ پیدا ہوتا تھا کہ یہاں کے رہنے والے خود بھی بافراط کھاتے پیتے تھے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے۔ اب اسی ملک کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ (پچھلے دنوں ٹنڈو جام میں تقریر کرتے ہوئے امریکی نمائندہ مسٹر جان اوریل نے ہم نے بتایا کہ) ہم نے گزشتہ ڈیڑھ سال میں اسی کروڑ روپے کا غلہ باہر سے منگایا ہے۔ آپ نے غور کیا؟ اسی کروڑ روپے

## ہماری زرعی پیداوار کی حالت

کاغذ! ہمارے بجٹ میں سارے سال کی "آدنی" ایک ارب انتالیس کروڑ دکھائی گئی ہے۔ ایک طرف اسے رکھتے اور دوسری طرف یہ دیکھئے کہ ہم نے ڈیڑھ سال میں اسی کروڑ روپے کا اناج دوسرے ملکوں سے منگایا ہے۔ یہ تو تھی گزشتہ ڈیڑھ سال کی بات۔ ہماری اسمبلی کے اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۵۶ء میں وزیر خوراک مسٹر دلدار احمد نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ اندازہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں اس سال قریب چار لاکھ ساٹھ ہزار ٹن غلہ کی کمی ہوگی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ حقیقی کمی اس اندازہ سے بھی زیادہ ہے۔ آخری اطلاع یہ ہے کہ ہمیں اس سال قریب پینسٹھ (۶۵) کروڑ روپے کا غلہ باہر سے منگانا پڑے گا۔ یعنی ہمارے بجٹ میں سال بھر کی آدنی کا تخمینہ ایک ارب انتالیس کروڑ روپیہ ہے اور اس میں سے پینسٹھ (۶۵) کروڑ روپے کاغذ باہر سے منگانا پڑے گا۔ یا للہ عجیب!

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اگر دوسرے ملکوں سے کوئی چیز منگانی پڑے تو اس کی قیمت ہمارے روپے میں ادا نہیں کی جاسکتی۔ ان کے سکہ میں ادا کرنی پڑتی ہے جن سے وہ چیز خریدی جائے۔ ان کا سکہ ہمیں اسی صورت میں مل سکتا ہے جب ہم ان کے ہاتھوں کوئی اپنی چیز فروخت کریں۔ ہمارے ہاں دوسروں کے ہاتھ بیچنے کے لئے زمین کی پیداوار ہی ہو سکتی ہے۔ مثلاً روٹی اچائے وغیرہ۔ لیکن ہم نے گزشتہ دس سال میں جس قدر زرعی پیداوار باہر بھیجی ہے اس سے قریب چار گینا زیادہ قیمت کاغذ باہر سے منگایا ہے۔ آپ سوچئے کہ سوائے اس کے ہم دوسری قوموں سے قرضہ مانگیں یا امداد طلب کریں ہمارے پاس روٹی حاصل کرنے کی اور اکون سی شکل ہے؟ اور یہ سن کر آپ کلیجہ مسوس کر رہ جائیں گے کہ

## سب اپنا پیدا کردہ ہے

ہمارے ساتھ یہ کچھ کسی آسمانی آفت یا زمینی بلا کی وجہ سے نہیں ہوا۔ یہ سب (قرآن کے الفاظ میں) ہمارے اپنے ہاتھوں کا پیدا کردہ ہے۔ ہمارے ہاں زمین کی کمی نہیں لیکن

ہماری نا اہلی کی حالت یہ ہے کہ اول تو ہماری زمین کا بہت تھوڑا حصہ ہے جس میں کاشت ہوتی ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں قابل کاشت زمین قریب ۲۳،۳۲،۳۱،۶۸۰ ایکڑ ہے اس میں سے قریب ۵،۰۵،۵۹،۰۰۰ ایکڑ زمین میں غلہ کی کاشت ہوتی ہے اور ۵،۰۸۹،۰۰۰ ایکڑ زمین میں سبزیاں ترکاریاں بونی جاتی ہے۔ یعنی کل رقبہ زیر کاشت ۵،۰۸۱،۰۲۸،۰۰۰ ہے۔ بالفاظِ دیگر ہماری قابل کاشت زمین کا ایک چوتھائی حصہ زیر کاشت ہے اور باقی تین چوتھائی زمین غیر آباد ہے۔ اس زیر کاشت رقبہ میں سے ۲ لاکھ ایکڑ میں ہم تمباکو کی کاشت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (مثلاً) کسی بھوکے کو ایک روپیہ مل جائے اور وہ اس روپیہ کا جا کر حقہ خرید لائے۔ ہم اپنے زیر کاشت رقبہ میں تمباکو کی کاشت کرتے ہیں اور روٹی دوسروں سے مانگ کر کھاتے ہیں، کیا ایسی قوم بھی دنیا میں کہیں اور دیکھی سنی ہے؟

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ ہمارا جس قدر رقبہ زیر کاشت ہے اس کا کافی حصہ دن بدن بیکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ سٹرجان۔ او۔ بل کی تحقیق کے مطابق پاکستان میں ہر سال قریب ایک لاکھ ایکڑ زمین بیکار ہوتی جا رہی ہے۔ مغربی پاکستان میں بارانی رقبہ قریب چالیس فیصد ہے۔ اس میں ہر سال قریب بارہ ہزار ایکڑ زمین ناقابل کاشت ہوتی جا رہی ہے۔

تیسری بات یہ کہ جس رقبہ میں کاشت ہوتی ہے اس میں پیداوار کم ہوتی جا رہی ہے۔ مثلاً ۱۹۴۸-۴۹ء میں ہمارے ہاں چاول کی پیداوار قریباً گیارہ من فی ایکڑ تھی اور گہوں کی قریب ساڑھے دس من فی ایکڑ۔ لیکن ۱۹۵۵-۵۶ء میں چاول کی پیداوار کی اوسط قریب نو من رہ گئی۔ اور گہوں کی قریب آٹھ من فی ایکڑ۔ ۱۹۴۸-۴۹ء میں چاول کی مجموعی پیداوار قریب چوراسی لاکھ ٹن تھی۔ لیکن ۱۹۵۵-۵۶ء میں یہ پیداوار قریب ستر لاکھ ٹن رہ گئی۔ اسی طرح گہوں کی مجموعی پیداوار ۱۹۴۸-۴۹ء میں قریب چالیس لاکھ ٹن تھی جو ۱۹۵۵-۵۶ء میں قریب تینتیس لاکھ ٹن رہ گئی۔ حالانکہ زیر کاشت رقبہ دونوں صورتوں (چاول اور گہوں کے لئے) ۱۹۴۸-۴۹ء کے مقابلہ میں زیادہ تھا۔ ادھر زمین کی بیکاری اور پیداوار کی کمی کی یہ حالت ہے اور دوسری طرف ہماری آبادی قریب دس لاکھ نفوس سالانہ کی رفتار سے بڑھتی جا رہی ہے۔

اس کے مقابلے میں فرادوسرے ملکوں کی حالت پر غور کیجئے۔ پہلے اوسط پیداوار کو لیجئے۔

ملک	چاول	نیشکر	گہوں
۱۔ پاکستان	۱۱ (من)	۳۸۳ من	۸ ۱/۲ من (اوسط پیداوار) فی ایکڑ

۱۸	۱۳۳۶	x	۲. جاوا
۲۴	x	۱۹	۳. جاپان
۲۳	۶۳۳	۱۹	۴. مصر

یہ اس لئے کہ (علاوہ دیگر وجوہات) جاپان میں مصنوعی کھاد کا استعمال قریب ساٹھ پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے ہوتا ہے۔ مغربی یورپ میں قریب تین سو پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے اور پاکستان میں صرف ایک پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے۔ حالانکہ اس کھاد کا استعمال ۲۰ سے چالیس فیصدی پیداوار بڑھا دیتا ہے۔

اس کے بعد اس حقیقت پر بھی غور کیجئے کہ

(۱) مغربی یورپ کے پاس ساری دنیا کے رقبہ زمین کا قریب ۳٪ (تین فیصدی) حصہ ہے اور پندرہ فیصدی آبادی۔ لیکن یہ کل دنیا کی خوراک کا ایک تہائی حصہ پیدا کر دیتا ہے۔

(۲) اس میں اگر روس اور شمالی امریکہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو دنیا کی کل آبادی کا ایک تہائی حصہ ان ممالک میں بستا ہے۔ اور دنیا کی خوراک کا ۳۰٪ حصہ ان ممالک میں خرچ ہو جاتا ہے۔ باقی ۶۰٪ حصہ ساری دنیا کے لئے بچتا ہے باقی اس میں سے ایشیا کے حصہ میں ۱۷ فیصدی آتا ہے۔

ان حالات کے پیش نظر آپ سوچئے کہ ہم کہاں ہیں۔ کدھر جا رہے ہیں اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ اقول تو یہی چیز قابل غور ہے کہ ہمیں ہر سال جس قدر غلہ کی ضرورت پڑتی ہے اور جسے خریدنے کے لئے ہمارے پاس زرمبادلہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں قرضہ یا امداد کے طور پر کب تک ملتا رہے گا؟ دوسرے یہ کہ ہمیں جو قرضہ یا امداد مل رہی ہے اس کی ہمیں قیمت کس قدر ادا کرنی پڑ رہی ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ اس صورت حال سے نکلنے کی شکل کیا ہے۔ اس کے متعلق کہا یہ جائے گا کہ ہمیں

زمین کو بہتر بنانے اور اس کی پیداوار کو بڑھانے کے سوال پر خاص توجہ دینی چاہئے | **اس کا علاج** جس قدر افتادہ زمین ہے اسے قابل کاشت بنانا چاہئے۔ قابل کاشت زمین کو بیکار

نہیں رہنے دینا چاہئے۔ نئے آلات اور ادویات سے مٹی (SOIL) کو زیادہ سے زیادہ تندرست اور توانا بنانا چاہئے۔ وسائل آب پاشی کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ کھٹیک ہے اور ان تدابیر کا اختیار کرنا نہایت ضروری۔ لیکن یہ ضابطہ خداوندی کا صرف ایک پہلو ہے جسے قوانین طبعی کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ قرآن کی رو سے وہ گوشہ بنیادی ہے۔ اس وقت ہماری

حالت یہ ہے کہ ایک ایک زمیندار دس دس ہزار (بلکہ ایک ایک لاکھ) ایکڑ زمین کا مالک ہے اسے اس کی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ اس کی زمین کی حالت کیا ہے۔ اس کی پیداوار گھٹ رہی ہے یا بڑھ رہی ہے۔ وہاں سے جو کچھ بھی آجائے اس کے لئے کافی سے زیادہ ہوتا ہے زمین کاشتکاروں کے پاس ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ اس کے مالک نہیں ہوتے محض مزدور ہوتے ہیں اس لئے یہ اس کے سنوارنے کی فکر نہیں کرتے۔ اور اگر کرنا چاہیں بھی تو ان کے پاس اس کے وسائل ہی نہیں ہوتے۔ ہمارے کاشتکاروں کی حالت جس قدر قابل رحم ہے اس کا

## کاشتکاروں کی حالت

اندازہ ہم شہری مشکل لگا سکتے ہیں۔ ہم پرانے زمانے کے غلاموں کے حالات پڑھ کر خون کے آنسو بہا کر رہتے ہیں۔ اگر ہم کہیں ان کاشتکاروں کی حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو نہ معلوم ہم پر کیا گزر جائے۔ ان بے چاروں کو محض شکل و صورت کے اعتبار سے انسان سمجھتے۔ درنہ ان سے جو سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ حیوانات سے بدتر ہے۔ ہمارے ہاں لیبر (مزدوروں) کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے بہت کچھ کیا یا کہا جاتا ہے۔ لیکن مزدوروں میں یہ کاشتکار شامل نہیں کئے جاتے۔ ان سے صرف وہ مزدور مراد ہوتے ہیں جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کی اسی فیصدی آبادی کاشتکاروں پر مشتمل ہے۔ (اور کل مزدوروں کا ۸٪ فیصدی حصہ کاشتکار ہیں) باقی بیس فیصدی میں سے دس فیصدی کارخانوں کے مزدوروں کو سمجھ لیجئے اور دس فیصدی زمیندار، تاجر، کارخانہ دار، ملازمت پر مشغول وغیرہ۔ ہم دس فیصدی (کارخانوں کے مزدوروں) کے متعلق تو اتنا کچھ کہتے یا کرتے ہیں لیکن اسی فیصدی آبادی (کاشتکاروں) کے متعلق کبھی خیال تک بھی نہیں کرتے کہ یہ بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ مزدوروں کے متعلق قانون موجود ہے کہ ان سے اتنے گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جاسکتا۔ اور (LIVING WAGE) سے کم اجرت نہیں دی جاسکتی۔ یعنی انہیں اتنی اجرت ضرور ملنی چاہیے جس سے ان کا گزارہ ہو سکے۔ نیز مزدوروں کی صحت، آسائش، تفریح کے لئے بھی قوانین موجود ہیں لیکن بے چارے کاشتکاروں کے متعلق کسی نے کبھی نہیں سوچا کہ انہیں کتنے گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اور سال کے بعد انہیں ملتا کیا ہے۔ نہ کسی کو ان کی صحت کا خیال ہے نہ آسائش کا نہ مکان کا نہ خوراک کا۔ وہ اپنے بیلوں اور گدھوں سے زیادہ محنت کرتے ہیں اور انہیں ان سے بھی کم کھانے کو ملتا ہے۔ آپ سوچئے کہ جو کاشتکار ان حالات میں کام کریں وہ زمین کو سنوارنے کی فکر خاک کر سکیں گے؟

اب آپ پوچھیں گے کہ خدا کے اس قانون نے جسے ادھر بنیادی بتایا گیا ہے، ان خرابیوں کا علاج کیا

تجویز کیا ہے؟ اس نے بڑا سیدھا اور صاف علاج تجویز کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ زمین تمام انسانوں کے  
زمین پر ذاتی ملکیت جائز نہیں | لئے سامانِ زندگی (رزق) حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اس  
 لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جس طرح فضا کی ہوا، سورج کی روشنی، ندی کا پانی، ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رہتا ہے۔  
 اور کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ ان پر ذاتی قبضہ جمالے، اسی طرح زمین کے متعلق بھی خدا کا قانون  
 یہی ہے کہ وہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیے۔ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں ہونی چاہیے۔  
 سورہ حم سجدہ میں ہے۔ قُلْ آيَاتُكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِي خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ  
 لَهٗ اَشْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ کیا تم اس خدا (کے قانون) سے انکار کرتے ہو جس نے اس زمین  
 کو دو مراحل میں پیدا کیا۔ (پہلا مرحلہ وہ تھا جب وہ اس قدر گرم تھی کہ اس میں کچھ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا اور  
 دوسرا مرحلہ وہ جس میں یہ اس قابل ہو گئی کہ اس پر جاندار مخلوق رہنے لگی۔ اور یہ ان کے لئے سامانِ زندگی بہم  
 پہنچانے لگی)۔ کیا تم اس زمین کے معاملہ میں (جو خالصتہً خدا کی ملکیت ہے) اس کے ہمسر بناتے ہو؟ اس نے زمین  
 کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔ کیونکہ وہ رب العالمین (تمام انسانوں کا پرورش کرنے والا)  
 ہے۔ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوٰسِيًّۭا مِنْ فَوْقِهَا۔ اس نے زمین کی سطح پر پہاڑ بنائے (جو اس کے سلسلہ  
 آب رسانی کا اہم ذریعہ ہیں)۔ وَبَارَكْنَا فِيْهَا۔ اور اس میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ وَقَدَّأْنَا  
 فِيْهَا اَنْوَابَهَا فِيْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ اور اس کی پیداوار (فصلوں) کے لئے چار موسم مقرر کئے  
 سَمَوًا لِّلسَّائِلِيْنَ (۱۰-۳۱/۹) یہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ لوگوں کو زمین کا مالک قرار دینے کا  
 مطلب یہ ہے کہ تم انہیں خدا کا ہمسر بنا رہے ہو۔ اسی ضمن میں سورہ بقرہ میں کہا ہے کہ خدا نے تمہارے باؤں  
 کے نیچے زمین پیدا کی، اوپر آسمانی کرتے بنائے۔ بادلوں سے پانی برسایا۔ اس سے فصلیں پیدا کیں تاکہ وہ  
 تمہارے لئے وجہ زریعت بن سکیں۔ اس کے بعد ہے فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَشْدَادًا وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ  
 (۲/۲۲) لہذا تم خدا کے ہمسر نہ بناؤ۔ اگر تم ذرا بھی علم و عقل سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی کہ اس  
 کا کوئی ہمسر ہو نہیں سکتا۔ سورہ عبس میں ہے کہ انسان کو چاہیے کہ اپنے رزق یعنی (خوراک) پر غور کرے اور سوچے  
 کہ اس میں کون سی چیز ہے جو اس کی اپنی بنائی ہوئی ہے زمین میں پیداوار کی صلاحیت کا موجود ہونا۔ بادلوں





**اسلام اور کمیونزم** | اس مقام پر بعض لوگ جھٹ سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ تو وہی بات ہے جسے کمیونسٹ پیش کرتے ہیں اس لئے اسلام اور کمیونزم ایک ہی ہو گئے۔

اس موضوع پر ہم اس سے پہلے متعدد بار تفصیل سے لکھ چکے ہیں جس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ اگر اتنی سی بات سے کہ اسلام کی رُو سے زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں اور کمیونزم میں بھی زمین کی ذاتی ملکیت کی نفی ہوتی ہے، اسلام اور کمیونزم کو ایک قرار دے دیا جائے تو پھر شاید دنیا میں کوئی نظریہ اور کوئی نظام بھی ایسا نہ رہے گا جسے اسلام جیسا نہ سمجھ لیا جائے۔ مثلاً۔

(۱) اسلام میں شراب کی ممانعت ہے۔ اور بھارت کا سیکولر نظام بھی شراب کی ممانعت کرتا ہے۔ اس لئے اسلام اور بھارت کا سیکولر نظام ایک ہی ہوا۔

(۲) اسلام بُت پرستی کو شرک قرار دیتا ہے اور آریہ سماج بھی بُت پرستی کی سخت مخالفت کرتا ہے اس لئے اسلام اور آریہ سماج ایک ہی ہوا۔

(۳) اسلام میں خنزیر حرام ہے اور یہودی بھی اسے نہیں کھاتے اس لئے اسلام اور یہودیت ایک ہی ہوئے۔

(۴) اسلام میں زنا کی ممانعت ہے اور عیسائیت بھی اسے حرام قرار دیتی ہے۔ اس لئے اسلام اور عیسائیت ایک ہی ہوئے۔

غرضیکہ اس قسم کی مشابہت کی باتوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر اسلام کا کوئی نظریہ، عقیدہ یا حکم کسی اور مذہب اور نظام میں بھی پایا جائے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو جاتے کہ اسلام اور وہ مذہب یا نظام ایک ہی ہیں۔ لہذا اگر اسلام میں زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں، اور کمیونزم بھی ذاتی ملکیت کی اجازت نہیں دیتا۔ تو ان دونوں میں اس ایک بات کے مشترک ہونے سے اسلام اور کمیونزم ایک نہیں ہو جاتے۔ اسلام صرف اسی ایک سوال کا نام نہیں کہ زمین پر ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے یا نہیں؟

**اسلامی فلسفہ زندگی** | اسلام ایک فلسفہ زندگی ہے، وہ انسان کی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے اندر لیتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے کے لئے خاص قوانین عطا

کرتا ہے۔ یہ قوانین وحیِ خداوندی کی رُو سے عطا ہوئے ہیں اور ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے فلسفہ حیات کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ (۱) انسانی زندگی کو قوانینِ خداوندی کے تابع رہنا چاہیے اور

(ii) انسان کا ہر ایک عمل (بلکہ ارادہ اور خیال تک بھی) اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے۔ اچھے کام کا اچھا نتیجہ بُرے کام کا بُرا نتیجہ۔ یہ نتائج اس زندگی میں بھی انسان کے سامنے آتے ہیں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی خدانے جو اہل قوانین عطا کئے ہیں ان میں ایک حصہ انسان کی معاشی زندگی سے بھی متعلق ہے۔ ان قوانین کی رو سے زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں۔

**اشتراکی فلسفہ** | اس کے برعکس کمیونزم بھی محض معاشی نظام کا نام نہیں۔ وہ ایک فلسفہ زندگی ہے۔ یہ فلسفہ زندگی اسلام کے فلسفہ زندگی کے بالکل برعکس اور اس کی ضد ہے۔ کمیونزم کے فلسفہ زندگی کی بنیاد ان عقائد پر رکھی گئی ہے کہ (i) خدا کا کوئی وجود نہیں۔ یہ محض یہ سرمایہ داروں کا چرایا ہوا ڈھونگ ہے۔ (ii) انسان کی زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ موت کے بعد کوئی اور زندگی نہیں (iii) جب خدا کا کوئی وجود نہیں تو وحی کا تصور بھی غلط ہے اور (iv) جب وحی کا تصور غلط ہے تو نبوت اور رسالت بھی کوئی شے نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ کمیونزم اور اسلام کس طرح ایک دوسرے سے منضاد ہیں۔ اس قدر متضاد کہ یہ بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص کمیونزم کے فلسفہ کو ماننا ہو کسی صورت میں مسلمان نہیں کہلا سکتا کوئی کمیونسٹ مسلمان نہیں ہو سکتا اور کوئی مسلمان کمیونسٹ نہیں بن سکتا۔ اگر کمیونزم کے معاشی نظام کی بعض شقیں قرآن سے ملتی جلتی ہیں تو جو شخص قرآن کے معاشی نظام کو منترل من اشد مانا ہے وہ کمیونسٹ نہیں ہو جاتا۔ یہ غلط فہمی ہمارے سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے پھیلائی جاتی ہے یعنی جب

**فریب دہی** | کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام میں زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں تو یہ جھوٹ سے پکارا ٹھٹھے ہیں کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ مقصد اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کے مفاد پر زد نہ پڑے۔

لیکن سرمایہ دار طبقہ جانتا ہے کہ ان کی چیخ و پکار سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اب ہر شخص اس حقیقت کو بھانپ لیتا ہے کہ یہ لوگ محض اپنے مفاد کے تحفظ کی خاطر ایسا کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے بعض (نام نہاد) مذہبی پیشواؤں کی تائید حاصل کرنی اور انہوں نے خدا اور رسول کا نام لے کر یہ

**ارباب شریعت** | کہنا شروع کر دیا کہ شریعت کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت کی پوری پوری اجازت ہے۔ اور اس پر کسی قسم کی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ ایک طرف جماعت احمدیہ کے امیر مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے "اسلام اور ملکیت زمین" کے عنوان سے فریب پونے

تین سو صفحات کی کتاب شائع کر دی۔ جس میں یہ ثابت کرنے کی (ناکام) کوشش کی کہ اسلام میں زمین پر ذاتی ملکیت بالکل جائز اور درست ہے۔ دوسری طرف جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے تقریباً پچھتر صفحات پر مشتمل ایک رسالہ شائع کر دیا جس میں لکھا کہ

جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ اتنے مکان اتنا تجارتی کاروبار اتنا صنعتی کاروبار اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم اتنی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہ راست خود کرو اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی کہ تم کسی ایسے کام پر حقوق ملکیت نہیں رکھ سکتے جسے تم اجرت یا شرکت کے طریقے کے ذریعے کہہ رہے ہو۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں۔ (ص ۳)

یہ فتویٰ قرآن کریم کی تعبیر کے صریحاً خلاف ہے اور صاحبِ مضمون نے اس کی تائید میں قرآن کی کوئی آیت پیش نہیں کی (اگرچہ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ لیکن یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ یہ بھی غلط ہے کہ اسلام نے اس کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ تم جس قدر دولت جمع کرنا چاہتے ہو کرو۔ شران کی رو سے دولت کے انبار جمع کرنا قطعاً ناجائز ہے۔ جو حضرات اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہیں (میری کتاب 'نظام ربوبیت' ملاحظہ فرمائیں) بہر حال یہ ہے ہمارے ان پیشوایانِ مذہب کا وہ مسلک جسے جاگیر داری اور زمینداری (زمین پر ذاتی ملکیت) کے جواز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کی تعلیم (گزشتہ صفحہ میں) آپ کے سامنے آچکی ہے۔ اس کے پیش نظر اس امر کا فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اسلام میں زمین پر ذاتی ملکیت جائز ہے یا نہیں۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ کمزور

## انسانیت کی لعنت

انسانوں پر بالادست طبقہ نے جو ظلم و ستم روا رکھے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ایک طاقتور انسان ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک بن بیٹھا اور ہزاروں مظلوم اس کی خاطر اپنا لہو پیسنہ ایک کر کے زمین میں کاشت کرتے رہے۔ قرآن نے اس لعنت کو ختم کر دیا اور کہہ دیا کہ زمین تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی

چاہیے۔ سَوَاءَ لِلسَّائِلِینَ۔

آج پاکستان جن مشکلات سے دوچار ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ملک کی زمین بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت میں ہے اور غریب کاشت کار بھوکے مر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اس زمین سے اتنی پیداوار نہیں ہو رہی جتنی ہونی چاہیے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کریم کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنائیں اور اس باب میں اس کی تعلیم پر عمل کریں۔

○  
**کرنے کا کام** | تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ حکومت کے لئے (سردست) کرنے کا کام یہ ہے کہ -۱-

(۱) زمین پر بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت کو ختم کر دیا جائے اور ساری زمین ملکیت کی تحویل میں دے دی جائے۔ حکومت غیر آباد زمین کو آباد کرنے کا ایک پلان بنائے اور اس پر فی الفور عمل درآمد شروع کرے۔  
 (۲) ہر شخص کی تحویل میں (ملکیت میں نہیں بلکہ تحویل میں) اتنی زمین دی جائے جسے وہ خود کاشت کر سکے۔  
 (۳) حکومت اس زمین کے نقصان دور کرنے اور اسے توانا اور تندرست بنانے کے لئے ضروری سامان اور اسباب مہیا کرے۔

(۴) حکومت خود فیصلہ کرے کہ کتنے رقبہ ہیں کس جنس کی کاشت ہوگی۔

(۵) اس رقبہ کی پیداوار میں سے کاشت کرنے والے کی ضرورت کے مطابق اس کے پاس رہنے دی جائے اور باقی جنس کو حکومت مناسب اور معقول قیمت پر خرید لے۔ اس رقم کو اس کاشتکار کی آمدنی قرار دیا جائے۔ اور ملک کے عام انکم ٹیکس کے قاعدے کے مطابق اس آمدنی پر ٹیکس لگایا جائے۔ اس کے علاوہ اس سے مالیہ وغیرہ کچھ وصول نہ کیا جائے۔

(۶) فصلوں کو آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری حکومت پر ہو۔ نیز کاشتکاری یا اس کے مال مویشی کے نقصان کی صورت میں اس کی مناسب امداد کی ذمہ داری بھی۔

(۷) ملحقہ دیہات کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کر کے میونسپل کمیٹی کے انداز سے اہل دیہات کی صحت، تعلیم وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ خدا کا یہ وعدہ کس طرح پورا ہوتا ہے کہ **وَأَنَّ أَهْلَ الْقُرَیِّ امْنُونَا**

وَ اتَّقُوا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَ الْأَرْضِ (۷/۹۶) اگر ان بستیوں والے خدا کے اس قانون کی صداقت کو تسلیم کر لیتے اور اس کی پوری پوری نگہداشت کرتے تو ہم ان پر زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

ان دروازوں سے جو آمدنی آئے گی اسے کہا جائے گا "ملک کی آمدنی" اور اسی پر ملک کی فلاح و بہبود کا دارومدار ہوگا۔ فلاح کے تو معنی ہی کھیتی کے ہیں۔

اگر ہم نے یہ کچھ نہ کیا تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا ہے کہ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر کمیونزم کا طوفان بلا کہیں ادھر کا رخ نہ کر لے۔ اور اس کا کسے علم نہیں کہ

اس سیل سبک سیر زمین گیر کے آگے  
عقل و نظر و علم دہن نہیں خس و خاشاک

نہ صرف یہ بلکہ دین اور انسانیت بھی!

اس سے بچنے کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم خدا کے ضابطہ قانون کے دامن میں پناہ لیں اور زمین کو ذاتی ملکیت کے پنجوں سے نکال کر ملت کی مشترکہ تخیل میں دے دیں جو اسے ضرورت مندوں میں حسب ضرورت تقسیم کرتی رہے۔ اسی کا نام ہے خدا کی ملک کو خدا کے حوالے کرنا۔

ملک بڑواں را بہ بیزداں بازده  
تاز کار خویش بکشائی گرہ!



# قرآن کریم کا معاشی نظام

(تحقیق سوشل سوسائٹی کراچی کی تقریر، اگست ۱۹۵۹ء)



انسانی بچہ جب دنیا کی فضا میں پہلا سانس لیتا ہے تو بھوک سے چلاتا ہے اور اپنے رزق کے سرچشموں کی طرف پیک کر جاتا ہے۔ اور جب انسان اس دنیا میں آخری سانس لیتا ہے تو بھی اس کے حلق میں کچھ ٹپکایا جاتا ہے تاکہ اسے کچھ نہ کچھ تو انائی مل سکے۔ جب وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ اس کے حصے کا رزق ختم ہو گیا تھا۔ لہذا رزق کا معاملہ ایسا ہے جس سے انسان اپنی زندگی کے کسی سانس میں بھی بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ انسانی زیست کے لئے اس سے زیادہ اہم مسئلہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص کو آرام سے بافراط کھانے پینے کو مل جاتا ہے اس کی زندگی کو بڑی کامیاب زندگی تصور کیا جاتا ہے۔ اور وہ خود بھی ایک ایک سانس میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اسے روٹی کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہونے دیا۔

انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر انسان کی اجتماعی زندگی پر غور کیجئے تو اس میں بھی نظر آئے گا کہ قوموں کی تگ و تناز اور جدوجہد کے لئے سب سے زیادہ جذبہ محرکہ رزق کا سوال ہوتا ہے۔ رزق کی یہی اہمیت تھی جس کے پیش نظر مارکس اس نتیجہ پر پہنچا کہ تاریخ انسانیت کی تعبیر ہی معاشی نقطہ نگاہ سے کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک سابقہ اقوام کی تاریخ کا تعلق ہے

**معاشیات کی اہمیت** | مارکس کا یہ نظریہ صحیح ہو یا غلط (اس کے متعلق تفصیلی گفت گو ذرا

آگے چل کر کی جائے گی۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے دور میں اس مسئلہ نے ایسی اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ آنے والا مورخ جب اس پر نگاہ ڈالے گا تو وہ اسے عصرِ معاشیات (AGE OF ECONOMICS) کے سوا کسی اور نام سے نہیں پکار سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تہذیبِ تمدنِ معاشرت، سیاست، قومی مسائل اور بین الاقوامی معاملات سب کی باگ ڈور معاشیات کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت دنیا عملاً جن دو بلاکس (BLOCKS) میں بٹی ہوئی ہے ان میں کہنے کو تو خط امتیاز، نظامِ حکومت ہے۔ یعنی ڈکٹیٹر شپ اور جمہوریت۔ لیکن درحقیقت ان میں بنیادی اختلاف، نظامِ معیشت (ECONOMIC ORDERS) ہی کا نتیجہ ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ افراد ہوں یا اقوام روٹی کے مسئلہ نے دونوں کی ناک میں نکیل ڈالی ہوئی ہے اور وہ انہیں جدھر جی چاہے کشاں کشاں لئے لئے پھر رہا ہے۔

**مذہب اور روٹی** انسان نے جب اس اہم مسئلہ کے حل کے لئے مذہب کے دروازے پر دستک دی۔ مذہب سے میری مراد ہے انسانوں کا خود ساختہ مذہب۔ تو اس نے یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑالیا کہ ہمارا مقصد انسان کو مرنے کے بعد کی زندگی میں عذاب سے نجات دلانا ہے۔ اس دنیا کے مسائل سے ہمارا کوئی سروکار نہیں۔ یہ مادی دنیا کثافت اور غلاظت سے بھری ہوئی ہے۔ اس لئے خدا کے نیک بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے قابلِ نفرت سمجھیں اور جہاں تک ہو سکے اس سے دُور بھاگیں۔ لیکن یہ محض فریبِ نفس تھا یا فرار کی راہ۔ اس لئے کہ انسان دنیا سے کتنی ہی دُور کیوں نہ بھاگے اور اس طرح کتنا ہی بڑا ایشور کا بھگت کیوں نہ بن جائے، جب تک وہ زندہ ہے کھانے پینے کا محتاج ہے۔ وہ شہروں کو چھوڑ کر جنگل اور پہاڑوں میں بسیرا کر سکتا ہے لیکن خوراک کے مسئلہ سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ وہ خواہ جو بیس گھنٹے میں ایک مرتبہ ہی کیوں نہ کھائے۔ کھائے بغیر گزارہ ہو نہیں سکتا۔ بھوک، رشیوں، نئیوں کو بھی لگتی ہے اور پیروں فقیروں کو بھی۔ کھائے بغیر نہ ایشور کے اوتار زندہ رہ سکتے ہیں نہ اللہ کے مقرب۔ اس لئے (انسانوں کے خود ساختہ) "مذہب" کا یہ کہنا کہ اسے روٹی کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں حقیقت کو جھٹلانا اور لوگوں کو فریب دینا ہے۔ ایسے مذہب کے علمبرداروں کو روٹی کے مسئلہ سے اس لئے دلچسپی نہیں ہوتی کہ ان کی روٹی کا انتظام دوسرے لوگ کرتے ہیں۔

اسلام مذہب نہیں بلکہ الدین ہے جس کے معنی ہیں نظامِ زندگی یا ضابطہ حیات۔ ظاہر ہے کہ جس نظام کا دعوے ہو کہ وہ انسان کی ساری زندگی کو اپنی آغوش میں لیتا ہے اور جو ضابطہ حیات انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے راہ نمائی دینے کا مدعی ہو وہ انسان کے معاشی مسئلہ سے کس طرح چشم پوشی کر سکتا ہے؟ وہ روٹی کے سوال سے کس طرح آنکھیں بند کر سکتا ہے؟ چنانچہ قرآن نے اس مسئلہ کو پوری پوری اہمیت دی ہے۔ اور اس کا ایسا حل بتایا ہے جو ان پریشانیوں کو نہایت آسانی سے دُور کر دیتا ہے

**قرآن اور روٹی کا مسئلہ** | جو انسان کو جہنم کی آگ کے شعلے بن کر چاروں طرف سے گھیرے رہتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے معاشی مسئلہ کو کس قدر

اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس سے اگایا جاسکتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ جس قوم کو رزق کی فراوانی حاصل ہو یہ سمجھو کہ اس پر خدا کا انعام ہے۔ اور جو بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو اس پر خدا کا غضب ہے۔ سورہ نحل میں ہے ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا (۱۱۲/۱۱۳) خدا تمہیں ایک مثال دے کر بات سمجھاتا ہے۔ (مَثَلًا) قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ، ایک بستی تھی جو نہایت امن و اطمینان کی حالت میں تھی۔ اس کے کھانے پینے کا سامان (رزق) ہر جگہ سے با فراغت اس کے پاس چلا آتا تھا۔ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ، اس نے اللہ کی ان نعمتوں کی ناشکر گزاری کی۔ تو ان کے اس جرم کی پاداش میں فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لُبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۱۲/۱۱۳) اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا۔ یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا۔

آپ نے مذہبی حلقوں میں اس قسم کے فقرے سنے ہوں گے کہ انسان کو ہمیشہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیے۔ جو شخص خدا کی اطاعت نہ کرے اس پر اس کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان سے پوچھئے کہ وہ عذاب کیا ہوتا ہے تو وہ کہہ دیں گے کہ اس قسم کے انسان کو مرنے کے بعد جہنم میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اور وہ وہاں خدا کے عذاب کا مزہ چکھتا ہے۔ مرنے کے بعد کے جہنم اور جنت سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآنِ کریم قانونِ خداوندی سے اعراض برتنے (رد گردانی کرنے) کا جو عذاب بتاتا ہے

**معیشت کی تنگی** | وہ اسی دنیا میں سامنے آجاتا ہے وہ کہتا ہے کہ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنَّا ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (۲۰/۱۲۳) (یاد رکھو) جو کوئی میرے قانون سے رد گردانی کرے گا۔ تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوانینِ خداوندی



سے اعراض اور روگردانی کا نتیجہ رزق کی تنگی (بھوک کا عذاب) ہے۔

آپ نے بعض لوگوں کو یہ کہنے سنا ہو گا کہ خدا اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انہیں کھانے کو روٹی نہیں ملتی۔ پہننے کو کپڑا نہیں ملتا۔ مفلسی، تنگ دستی، بے کسی، بے چارگی انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ وہ اس دنیا میں بڑی عسرت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ان کی عاقبت اتنی ہی زیادہ تابناک اور خوشگوار ہوتی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم اس کے خلاف کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث بھی رونما ہوتے ہیں جن میں انہیں سخت مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے (مثلاً جنگ کے زمانہ کی تکالیف اور مصیبتوں سے کون واقف نہیں جن میں بڑی بڑی خوشحال اور دولت مند قومیں بھی مبتلا ہو جاتی ہیں؟) لیکن یہ صرف ہنگامی حادثات ہوتے ہیں جو آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ لیکن اگر عسرت اور زبوں حالی کسی فرد یا قوم کی زندگی

کا معمول ہو جائے تو انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں

## دنیا اور آخرت میں عذاب

رہنا چاہیے کہ یہ خدا کے مقبول بندوں کی علامتیں ہیں۔ یہ چند روزہ (دنیاوی زندگی) کے مصائب ہیں۔ اس کے بعد (آخرت کی زندگی میں) تمام خوشگواریاں اور سرفرازیاں انہی کے حصے میں آئیں گی۔ اس لئے کہ قرآن نے جہاں کہا ہے کہ مَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی)۔ تو اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وَ نَحْشُرُكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ آعْمَى (۲۰/۱۲۲) اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوانینِ خداوندی سے اعراض کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں رزق کی تنگی اور آخرت میں ذلت و رسوائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رو سے زندگی ایک جوئے رواں ہے جو اس دنیا سے اُس دنیا تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ اس لئے جن اعمال کے نتائج اس زندگی میں رسوا کن اور ذلت انگیز ہوں، عاقبت میں ان کے نتائج عزت بخش اور مسرت آمیز نہیں ہو سکتے۔ اس

## عاقبت کا اندھا

باب میں قرآن کا واضح فیصلہ ہے کہ

مَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَى وَأَضَلُّ

سَبِيلًا (۱۷/۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ راہ گم کرے۔

اقبال کے الفاظ میں۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے  
وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے  
لہذا یہ دیکھنے کے لئے کسی قوم کی عاقبت کی زندگی کیسی ہوگی، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کی اس دنیا  
کی زندگی کیسی ہے۔ اگر اسے سامانِ زیست کی فراوانی نصیب نہیں، اگر وہ رزق کی تنگی کے عذاب میں مانو  
ہے۔ اگر وہ اپنی روٹی کے لئے بھی دوسروں کے دروازے پر بھولی پھیلائے کے لئے مجبور ہے، تو اس قوم کو  
عاقبت کی سرفرازیاں اور سہ بلندیاں نصیب نہیں ہو سکتیں۔ یاد رکھئے قرآن کی رُوسے جنت اور جہنم کی زندگی  
یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور آخرت تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ قرآن نے انسان کی سرگذشت کو  
”قصہ آدم“ کے مثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ اس میں بتاتا ہے کہ جب آدم جنت میں تھا تو اس سے کہہ دیا  
گیا تھا کہ اِنَّ لَكَ اَلَا تَجُوْعُ فِيْهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۗ وَ اَنْتَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝  
(۲۰/۱۱۸) تجھے یہاں یہ میسر ہے کہ تو اس زندگی میں بھوکا نہ رہے نہ ننگا نہ پیاسا رہے اور نہ ہی دھوپ میں۔

یعنی اس جنت کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کوئی فرد اپنی بنیادی  
**جنت کی زندگی** ضروریات زندگی (روٹی، پانی، لباس، مکان) سے محروم نہیں تھا اس میں  
”آدم اور اس کی بیوی“ سے کہہ دیا گیا تھا کہ كَلَّا مِنْهَا رَعْدًا حِيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) تم اس  
میں سے جہاں سے جی چاہے با فراغت کھاؤ (پیو) یعنی اس میں ہر ایک کے لئے ہر جگہ با فراط سامان  
رزق موجود تھا۔ یہ تھی وہ جنتِ ارضی جو انسان کی مفاد پرستیوں کی وجہ سے اس سے چھین گئی اور جسے دوبارہ  
حاصل کرنے کے لئے اسے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملی اور اس سے کہہ دیا گیا کہ فَاِمَّا يَنْتَدِبْكُمْ مِّنْ  
هُدٰى ۗ فَمَنْ اَشْبَحَ هٰذٰى فَلَا يَضِلُّ ۗ وَلَا يَشْقٰى (۲۰/۱۳۲) سو جب تمہارے پاس میری  
طرف سے راہ نمائی آئے، سو جو میری راہ نمائی کا اتباع کرے گا، تو نہ اس کی کوشش رائگاں جائے گی اور  
نہ ہی وہ (سامانِ زندگی) سے محروم رہے گا۔ (اور نہ ہی ان کے حصول کے لئے چکر پاشش مشقتیں اٹھانی  
پڑیں گی)۔

فرزندانِ آدم کے لئے اس زمین پر اسی جنت کی دوبارہ تشکیل قرآن کا مقصود و نیت ہے۔ اسے  
قرآنی نظامِ ربوبیت یا (QURANIC SOCIAL ORDER) کہتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ

**قرآن کا مقصود** | قرآنی نظامِ ربوبیت قائم کس طرح ہوتا ہے اور اس میں انسان کو کیا کچھ حاصل ہوتا ہے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن کی رو سے روٹی کے مسئلہ

کا حل مقصود بالذات ہے۔ یا یہ کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے؟ یہ سوال بہت اہم ہے اس لئے اسی بنیاد پر انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی پوری پوری عمارت استوار ہوتی ہے اس کا اچھی طرح سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

زندگی کا ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی بچہ پیدا ہوتا ہے۔ کھاپی کر بڑا ہوتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے تاکہ کھانے پینے کا سامان حاصل کر سکے۔ شادی کرتا ہے۔ صاحبِ اولاد ہوتا ہے۔ اولاد کو کمانے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اور مر جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر زندگی کا مقصد اتنا ہی ہے تو پھر ایک حیوان اور انسان میں کچھ فرق نہیں۔ یہ کچھ ہر حیوان کرتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے۔ کھانا پیتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے۔ اپنی نسل بڑھاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ قرآن اس

**حیوانی سطح کی زندگی** | زندگی کو کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۱۲/۲۷) اور جو لوگ کفر کرتے ہیں، وہ (متاعِ زندگی سے) فائدہ اٹھاتے ہیں اور حیوانات کی طرح کھاپی کر مر جاتے ہیں ان کا ٹھکانہ آگ ہے۔ اس کے برعکس دوسرا تصورِ حیات یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں۔ انسان میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشوونما

ہے۔ جس سے ایک فرد اس دنیا میں بھی سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں ارتقائے ذات کے مزید مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو تمام نوبہ انسانی کو بھوک، خوف اور ظلم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دے سکے۔ اس کا نام انسانی سطح کی زندگی ہے۔ قرآن کہتا ہے

**انسانی سطح کی زندگی** | کہ اگر افرادِ روٹی کی فکر سے آزاد نہ ہوں تو وہ انسانی سطح کی زندگی تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ ایسا معاشرہ قائم ہونا چاہیے جو افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کرے تاکہ ان کی توانائیاں اور صلاحیتیں، حیوانی سطح سے بلند ہو کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے فارغ ہو جائیں۔ قرآنی نظامِ ربوبیت، افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر کے انہیں انسانیت کی سطح پر لے آتا ہے

اسلامی معاشرہ اس خدا کی ذمہ داریاں اپنے سر پر لیتا ہوا جس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے وہ وجود میں آتا ہے تمام افراد معاشرہ سے پورے حتم و یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ

## رزق کی ذمہ داری

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاكُمْ (۴/۱۵۲)

ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

یہ ذمہ داری صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ اس مملکت کی حدود میں بسنے والے تمام ذمی حیات کو محیط ہوتی ہے، اس لئے کہ جس خدا کے نام پر یہ مملکت قائم ہوتی ہے اس کا اعلان ہے کہ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ يَرْزُقُهَا (۱۱/۱۶) اُڑنے والے کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو؛ اللہ کی یہ ذمہ داری اسلامی مملکت کے ہاتھوں کس طرح پوری ہوتی ہے اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے فرمائیے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر وجہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم عمرؓ سے اس کی باز پرس ہوگی۔

اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد مملکت (بلکہ اس حدود میں بسنے والے تمام جانوروں تک) کے رزق کی ذمہ داری اپنے سر پر لے جو مملکت اس ذمہ داری کو اپنے سر نہیں لیتی وہ اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مملکت ایسی عظیم ذمہ داری کو پورا کس طرح سے کر سکتی ہے؟ قرآن اس کا بھی جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس مملکت نے خدا کی ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے سر پر لیا ہے، رزق کے سرچشمے اور وسائل پیداوار جو خدا کی ملک ہیں، اس مملکت کی تحویل میں چلے جائیں گے تاکہ وہ ان کا ایسا انتظام کرے جس سے تمام افراد کی پرورش ہوتی چلی جائے۔ یہ وجہ

## رزق کے سرچشمے مملکت کی تحویل میں

ہے کہ قرآنی نظام ربوبیت میں، رزق کے سرچشموں پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا، نہ افراد کی اور نہ مملکت کی۔ مملکت بھی صرف ان کا انتظام کرتی ہے۔ رزق کے سرچشموں میں بنیادی حیثیت ارض (زمین) کو حاصل ہے جس سے نہ صرف اناج پیدا ہوتا ہے بلکہ تمام مصنوعات کے لئے خام مواد بھی وہیں سے برآمد



میں (فَتَحْنُ جَعَلْنَا تَنْزِيْرًا) اس سے سبق حاصل کرو۔ یہ سبق کہ یہ سب کچھ تمہارا پیدا کردہ نہیں۔ تمہارا پیدا کردہ ہے۔ تم اس میں صرف محنت کرتے ہو۔ اس لئے اس کھیتی میں تمہارا حصہ تمہاری محنت کے بقدر ہے، باقی سب کچھ تمہارا ہے۔ اسے ہم نے مَتَاعًا لِلْمُقْوِيْنَ (۳) - ۵۶/۶۹) بھوکوں کے لئے سامانِ زلیت بنایا ہے۔ اس لئے اس فالتورزق کو ان کی ضروریات کے لئے کھلا رکھو۔ سارے کا سارا اپنی ملکیت نہ سمجھ لو۔ اقبالؒ کے الفاظ میں 'غور کرو کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟  
کون لایا کھینچ کر پتھر سے بادِ سازگار؟ خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟  
کس نے بھردی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے کھلائی ہے خوں انقلاب؟

وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں!

تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں!

(بالِ جب ریل)

جو کچھ قرآن نے یہاں زمین اور اس کی پیداوار کے متعلق کہا ہے وہی کچھ دوسرے مقامات پر عوامِ دولت کے متعلق بھی کہا ہے۔ قارون کو قرآن نے نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قارون کی ذہنیت یہ تھی کہ وہ کہتا تھا کہ اِنَّمَا اُوْتِيْتُهُ عَلٰی عِلْمِ عِنْدِي (۲۸) میری تمام دولت میری اپنی ہنرمندی کی وجہ سے ملی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنْ اَصْكُرْهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹/۴۹) یہ ذہنیت بڑی غلط لگی اور گمراہی پر مبنی ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور یہی کہے جاتے ہیں کہ جو کچھ انسان کماتا ہے وہ اس کی اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس میں کتنے ایسے عنصر شامل ہوتے ہیں جن میں انفرادی طور پر اسے کچھ دخل نہیں ہونا مثلاً اس کی پیدائشی صلاحیتیں، تعلیم و تربیت، ماحول کے اثرات، معاشرہ کا نظم و نسق، مناسب مواقع (OPPORTUNITIES) کا ملنا وغیرہ۔

یہ تو رہا اس مسئلہ کا اصولی پہلو۔ جہاں تک اس کے عملی پہلو کا تعلق ہے قرآن اسے نہایت عمدگی سے حل کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب افراد کی تمام ضروریات

زندگی اور ان کی مضر صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے سامان و ذرائع فرد اور مملکت کا معاہدہ

کی فراہمی کی ذمہ داری مملکت اپنے سر لے لے تو دولت کا افسردگی ملکیت میں رہنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں افراد اور مملکت میں ایک معاہدہ ہوتا ہے جسے قرآن نے نہایت مختصر لیکن جامع الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ: **إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ** (۹/۱۱۱) افرادِ معاشرہ اپنی جان اور مال اللہ (یعنی اس مملکت) کے سپرد کر دیتے ہیں (جو خدا کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے) اور مملکت انہیں الجنۃ کی ضمانت دے دیتی ہے۔ الجنۃ کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک اس دنیا میں جتنی زندگی کا تعلق ہے اس میں تمام سامانِ زیست اور ضروریاتِ زندگی با فراغت ملتی چلی جاتی ہیں۔ افراد اور مملکت کا یہ معاہدہ یوں ہی ذہنی طور پر نہیں ہوتا بلکہ اس سوسائٹی کا ممبر وہی بن سکتا ہے۔ (بالفاظِ دیگر مسلمان وہی ہو سکتا ہے) جو برضا و رغبت بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے اس معاہدہ پر دستخط کرے۔ اس معاہدہ کی رُو سے ہر فرد اپنے محنت کے ما حاصل سے اپنے پاس صرف اتنا رکھ سکتا ہے جتنے میں اس کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھتا ہے اور مملکت کے فیصلے کے مطابق صرف کرتا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے **يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۗ قُلِ الْعَفْوَ ۗ** (۲/۲۱۹) یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم (اپنی محنت کی کمائی میں سے) کس قدر دوسروں کے لئے دے دیں۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔ اس طرح قرآن، فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی کے پاس نہیں رہنے دیتا۔ اور نظامِ سرمایہ داری کی جزاکاٹ دیتا ہے کیونکہ اس نظام کی بنیاد ہی فاضلہ دولت پر ہے۔

اس مقام پر وہ سوال سامنے آتا ہے جس کا (بظاہر) کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا اور جسے نظامِ سرمایہ داری (CAPITALISTIC SYSTEM) کی تائید میں بطور دلیل محکم پیش کیا جاتا ہے۔ یہی وہ بھنور ہے جس میں روس کے معاشی نظام کی کشتی بڑی طرح پھنس رہی ہے اور اسے اس میں سے نکلنے کی کوئی تدبیر وہاں کے اربابِ حل و عقد کے ذہن میں نہیں آتی۔ سوال یہ ہے کہ جب افرادِ معاشرہ کو یقین ہو جائے کہ وہ کام کریں یا نہ کریں ان کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں گی۔ انہیں اس کا بھی پتہ ہو کہ وہ کتنا ہی کام کیوں نہ کریں ان کی ضروریات سے زائد دولت ان کے پاس رہ نہیں سکتی۔ تو اول تو وہ کام ہی کیوں کریں؟ اور اگر ان سے کسی طرح کام بھی لیا جائے تو وہ پوری محنت سے کام کیوں کریں؟ جس دولت کے متعلق وہ جانتے ہوں کہ ان

کے پاس نہیں رہ سکتی، وہ اس کے حصول کے لئے جان کیوں کھپائیں؟ لہذا اس قسم کے نظام کا نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگ محنت سے جی چرائیں گے، اور ملک کی پیداوار اور قومی دولت روز بروز کم ہوتی جائے گی، روس اس وقت اسی مصیبت میں مبتلا ہے۔ کمیونزم نے غریبوں اور مزدوروں کو یہ کہہ کر انقلاب کے لئے ابھارا کہ تم اٹھو اور دولت مندوں سے ان کی دولت چھین لو۔ لیکن جب یہ مرحلہ گزر گیا اور جن دولت مندوں کے خلاف عوام کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکائی گئی تھی وہ باقی نہ رہے تو عوام کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب وہاں کوئی جذبہ محرکہ ایسا نہیں ملتا جو عوام کو جاں فرود نہ طور پر محنت پر آمادہ کر سکے، کمیونزم کی یہی بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے نظام سرمایہ داری کے حامل یہ کہتے ہیں کہ جب تک افراد کو اس کا یقین نہ ہو کہ وہ جو کچھ کمائیں گے ان کی ملکیت میں رہے گا، وہ کبھی پوری محنت سے کام نہیں کریں گے

لہذا نظام سرمایہ داری ہی قابل عمل نظام ہے، کیونکہ اس میں (PRIVATE ENTERPRISE)

کی عام اجازت اور حدود فراموش وسعت ہوتی ہے، حالانکہ اگر بغور دیکھا جائے تو نظام سرمایہ داری کا یہ کہنا کہ اس میں افراد کی ساری دولت افراد کی ملکیت رہتی ہے، فریب اور سراب سے زیادہ کچھ نہیں، کمیونزم محنت کشوں سے زائد دولت براہ راست چھینتی ہے، کیپٹل ازم کا نظام زائد دولت مختلف قسم کے (TAXES) کے ذریعہ کھینچ لیتا ہے۔ استبداد دونوں جگہ کارفرما ہوتا ہے، کیونکہ نہ اشتراکی نظام میں محنت کش اپنی فاضلہ کمائی، برضا و رغبت اسٹیٹ کے حوالے کرتے ہیں، نہ نظام سرمایہ داری میں لوگ بطیب خاطر ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

لہذا سوال یہ ہے کہ وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جس کی رُو سے افراد زیادہ سے زیادہ محنت کریں اور اپنی

فاضلہ کمائی برضا و رغبت نظام کے حوالے کر دیں؟ پروفیسر (HAWTREY) نے کہا ہے کہ

جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام

میں وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے؟

یہ جذبہ محرکہ صرف قرآن سے مل سکتا ہے۔

قرآنی جذبہ محرکہ | ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رُو سے زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے، انسانی جسم کی پرورش کے لئے قانون یہ ہے کہ جسم کی



پرورش ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں ایک فرد خود کھانا یا استعمال کرتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ دوسروں کو کھلاتے جائیں اور جسم آپ کا تو مند تو انا ہوتا جائے۔ لیکن اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما کے لئے قانون یہ ہے کہ ایک فرد کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے

لئے دے دے۔ لہذا جس قدر کوئی فرد دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا جائے گا اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی کا مقصود اپنی ذات

(PERSONALITY) کی نشوونما (DEVELOPMENT) ہو وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے

کمائے گا اور باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دے گا۔ ایسے شخص سے محنت کرانے کے لئے ڈنڈا یا ہنر تو ایک طرف کسی وعظ یا نصیحت کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ نیز وہ جو کچھ دوسروں کو دے گا اس کے لئے بدلہ یا معاوضہ تو کجا شکر یہ تک کا بھی خواہاں نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ انہیں جو کچھ دیتا ہے خود اپنی ذات کی منفعت کے لئے دیتا ہے۔ ان پر احسان نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جب دوسروں کی پرورش کا انتظام کرتے ہیں تو ان سے کہہ دیتے ہیں اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ بِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا (۷۴/۹) ہم تمہاری پرورش کے لئے جو انتظام کرتے ہیں تو یہ صرف قانونِ خداوندی کے اتباع میں کرتے ہیں (کہ ایسا کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے) اس کے لئے ہم تم سے معاوضہ تو ایک طرف شکر یہ تک کے بھی خواہاں نہیں۔ یہ لوگ اپنی ذات کی نشوونما کے لئے اس قدر بے تاب ہوتے ہیں کہ یُوْثِرُونَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَ تُوْكَانَ بِهِنَّ خِصَاَصَةً (۵۹/۹) وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انہیں تنگی ہی میں گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ مَنْ يُّؤْتِ شَيْئًا نَفْسِهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۵۹/۹) کھیتیاں اپنی کی پروا نہ چڑھتی ہیں جو مفاد پرستانہ جذبات سے محفوظ رہیں۔

یہ ہے وہ جماعت جو دنیا میں نظامِ ربوبیت قائم کرنے کی ذمہ داری سنبھالتی ہے، اپنی کو جماعتِ مومنین یا حقیقی معنوں میں مسلمان کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ پوری پوری محنت کرتے ہیں، اس لئے کہ یہ جانتے ہیں کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹) انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح پیہم محنت اور مسلسل سعی و کوشش

سے انہیں جو کچھ ملتا ہے وہ اس میں سے بقدر ضرورت اپنے لئے رکھتے ہیں اور باقی سب مملکت کی تحویل میں دے دیتے ہیں تاکہ وہ اس سے خدا کی عالمگیر ربوبیت کی عظیم ذمہ داری کو پورا کرے۔ اپنی ضروریات کے تعین میں بھی وہ اسراف سے کام لیتے ہیں نہ تبذیر سے۔ یعنی نہ ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں، نہ بلا ضرورت دولت ضائع کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ **إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ** (۹/۱۳۲) ”خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا“ اور **إِنَّ الْمُبْتَدِرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ** (۱۷/۲۷) ”دولت ضائع کرنے والے شیطان کے بھائی بند ہیں“۔

یہ ہے وہ معاشی نظام جسے قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نظام میں آپ دیکھتے کہ نہ صرف انسان کا معاشی مسئلہ ہی نہایت اطمینان بخش طریق سے حل ہو جاتا ہے بلکہ انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے جس قدر خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ان کا بھی خود بخود استیصال ہو جاتا ہے۔ جب انسان کی ضروریات زندگی خود بخود پوری ہوتی جائیں گی، تو کوئی شخص ان ناپسندیدہ کاموں کے لئے تیار نہیں ہوگا جو اسے موجودہ غلط معاشرے میں محض روٹی کی خاطر کرنے پڑتے ہیں اور جب وہ فاضلہ دولت اپنے پاس نہیں رکھ سکے گا تو اسے بددیانتی، چوربازاری، نفع خوری، سمگلنگ، فریب دہی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اُس وقت نہ زمیندار اور کاشتکار کے جھگڑے ہوں گے نہ مزدور اور کارخانہ دار کے تنازعات۔ نہ صاحبِ جائداد اور کرایہ دار کے مناقشات ہوں گے نہ گاہک اور دکاندار کے قیضے۔ اُس وقت نہ تقسیم وراثت کی مقدمہ بازی ہوگی، نہ لین دین کی گواہی کی فصیحی۔ اُس وقت ہر شخص ضروریات زندگی سے بے نیاز ہوگا اور اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں مصروف۔

کہہ دیا جائے گا کہ صاحبِ ایہ محض حسین خواب (UTOPIA) اور شاعرانہ تخیل ہے۔ اس قسم کا معاشرہ کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ خود غرضی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ آپ اس جذبے کو اس کے دل سے نکال نہیں سکتے۔ انسان کبھی ایسے نیک نہیں بن سکتے جیسی ان کی تصویر کھینچی جا رہی ہے۔ انسان شروع سے ایسا ہی رہا ہے اور ایسا

## حسین خواب

ہی رہے گا۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے۔ انسان بد فطرت نہیں ہے۔ اس کی درحقیقت کوئی فطرت

ہی نہیں۔ فطرتِ جمادات و حیوانات کی ہوتی ہے جسے وہ بدل نہیں سکتے۔ انسان کو کچھ بننے کی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ اگر ان صلاحیتوں کی صحیح تربیت کر دو تو وہ اچھا انسان بن جائے گا۔ ان کی غلط تربیت کر دو تو وہ بُرا انسان ہو جائے گا۔ ہم غلط معاشرہ قائم کرتے ہیں۔ اس میں انسانی بچوں کی تعلیم و تربیت غلط خطوط پر کرتے ہیں۔ جب اس قسم کے معاشرے پر دو چار صدیاں گزر جائیں تو ظاہر ہے کہ وراثت اور ماحول کے اثرات سے اس میں اسی قسم کے انسان پیدا ہونے لگ جائیں گے۔ ہم اس قسم کے خود غرض اور بدنیت انسان پیدا تو خود کرتے ہیں لیکن (خود بری الذمہ ہونے کے لئے) کہہ دیتے ہیں کہ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے۔ اگر ہم اپنے

بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح تصوراتِ زندگی کے مطابق کریں اور اس طرح دو چار نسلوں تک کرتے جائیں تو پھر نظر آئے گا کہ ہمارے معاشرے

## خواب نہیں حقیقت

میں کس قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن 'نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے' ان افراد کی

تعلیم و تربیت نہایت ضروری (بلکہ لاینفک) قرار دیتا ہے جن کے ہاتھوں اس نظام کا قیام عمل میں آتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ تم اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے

## عملی طریق

کہ اس کے لئے ذہنی فضا کو سازگار بناؤ اس کے ساتھ ہی تم اپنی آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت شروع کر دو۔ جوں جوں ان آنے والی نسلوں کا قلب و دماغ صحیح (قرآنی) قالب میں ڈھلتا چلا جائے، اس نظام کو بتدریج آگے بڑھاتے جاؤ۔ تاکہ یہ اپنی آخری منزل تک پہنچ جائے۔

قرآن چونکہ انسانی زندگی کے ہر دور کے لئے راہ نمائی دیتا ہے اس لئے اس نے جہاں اس منزل کا پورا

پورا تعارف کرا دیا ہے۔ جہاں پہنچ کر نظامِ ربوبیت اپنی مکمل شکل میں قائم ہوتا ہے وہاں اس نے عبوری دور (TRANSITORY PERIOD)

## عبوری دور کے احکام

سے متعلق بھی احکامات و ضوابط دے دیئے ہیں۔ جس سے گزر کر یہ بتدریج آخری منزل تک پہنچتا

ہے۔ اس (عبوری) دور کے احکام و قوانین بھی ایسے ہیں جو معاشرہ کو رفتہ رفتہ آخری منزل تک پہنچنے کے لئے تیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں صدقات و خیرات کی ترغیب، بخل اور حرص کی مذمت، ربوگی ممانعت

زراندوزی کی مخالفت، وراثت کے احکام۔ سب اس عبوری دور سے متعلق ہیں۔ کہیں اس کا ارشاد ہے کہ  
وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ  
بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ (۹/۳۵) "جو لوگ چاندی اور سونا جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے

تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے۔ اور کہیں وہ کہتا ہے کہ تمہاری تباہی کی وجہ یہ ہے کہ تَا كُنُوْنَ  
 الْاٰثْرَآءِ اَكْلًا لِّمَآءٍ وَ يَحْبَبُوْنَ اَلْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۲۰-۸۹/۱۹) تم وراثت کے مال کو سمیٹ کر کھا  
 جلتے ہو اور دولت سے اس قدر محبت رکھتے ہو کہ چاہتے ہو کہ سب کا مال تمہارے ہی پاس آجائے۔ کہیں وہ کہتا  
 ہے کہ تباہی ان لوگوں کے لئے ہے جن کی ذہنیت یہ ہے کہ اِذَا كُنْتُمْ عَلٰى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا  
 كَانُوْهُمُ اَوْ ذُرُوْهُمُ يُخْسِرُوْنَ ۝ (۳-۸۳/۲) جب وہ دوسروں سے ماپ کر لیتے ہیں تو  
 پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کہیں وہ مالیات کے مشیروں سے کہتا  
 ہے کہ دولت کی تقسیم اس طرح نہ کرو۔ لَا يَكُوْنُ دَوْلَةٌ بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (۵۹/۷) کہ وہ تم میں  
 سے دولت مندوں کے طبقہ ہی میں گردش کرتی ہے۔ اور کہیں قارون صفتوں سے کہتا ہے کہ تم یہ نہ سمجھ لو کہ  
 جس قدر مال و دولت تمہارے پاس جمع ہو رہا ہے اِنَّمَا اُوْتِيْتُمْهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي (۷۸/۲۸)  
 یہ سب ہماری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس پر ہمیں کامل تصرف حاصل ہے کہ جس طرح جی چاہے  
 اسے صرف کریں! قرآن کے یہ احکام و ضوابط اپنی اپنی جگہ مستقل راہ نمائی کا کام دیتے ہیں۔ لیکن جب  
 نظام ربوبیت اپنی مکمل شکل میں قائم ہوتا ہے تو اس میں چونکہ ضروریات ہر ایک کی پوری ہو جاتی ہیں اور  
 فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی نہیں اس لئے اس وقت اس جماعت (یا معاشرہ) کے لئے عبوری دور  
 سے متعلق احکام کی ضرورت نہیں رہتی۔ جس طرح پانی مل جانے پر تیمم کے قرآنی حکم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔  
 اسی طرح قرآن بتدریج اس نظام کو ان افراد کے ہاتھوں قائم کر دیتا ہے جو صحیح تعلیم و تربیت سے اسے چلانے  
 کی صلاحیتیں اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔



لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر ایسی جماعت پیدا نہ ہو جو اس نظام کے قیام کے لئے کوشش کرے،  
 تو قدرت چپکی بیٹھی منہ دیکھتی رہتی ہے۔ دنیا میں غلط نظامہائے زندگی کی تخریب اور ان کی جگہ صحیح نظام  
 کے قیام کے لئے خدا کا کائناتی قانون اپنے طور پر مصروف عمل رہتا ہے۔ اسی کوشش کا حق و باطل  
 کہا جاتا ہے جو کائنات میں مسلسل جاری و ساری رہتی ہے۔ اس میں باطل کا  
**کائناتی قانون** شکست اور حق کا غلبہ لازمی ہوتا ہے لیکن اس کی رفتار اس قدر سست ہوتی  
 ہے کہ قرآن کے الفاظ میں اس کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے

یہ اسی کائناتی قانون کی کار فرمائی ہوتی ہے جس کی رو سے (مثلاً) قرآن کہتا ہے کہ **أَوْ لَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ مَنقُصَةً نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَاللَّهُ يَخْتَصِمُ لَكُمْ لِأَمْرٍ لَّكُمْ بِهٖ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ** (۱۳/۲۱) کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم کس طرح زمین کو اس کے بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے لے کر کم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان معاملات کے فیصلے خدا (کا قانون) کرتا ہے۔ اس کے فیصلے (کو رد کرنا تو ایک طرف اس) پر نظر ثانی کرنے کا بھی کسی کو اختیار نہیں۔ وہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے، لیکن، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس کا ”بہت جلد حساب کرنا“ بھی ہمارے حساب و شمار سے سینکڑوں برس لے لیتا ہے۔ لیکن اگر انسان چاہے کہ خدا کا یہ قانون ہمارے حساب و شمار کے مطابق نتائج مرتب کر لے تو اس کا طریق یہ ہے کہ انسان اس قانون کے ساتھ تعاون کرے اور آگے بڑھانے کے لئے اس کا دست و بازو بن جائے۔ انسان اگر اس طرح خدا کے قانون کی مدد کرے گا تو اس کا قانون خود انسان کا مدد و معاون بن جائے گا۔ **إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ** (۲۴/۷) کے یہی معنی ہیں۔ اس طرح، غلط نظام کی صفیں دنوں میں اٹٹ جائیں گی اور اس کی جگہ صحیح نظام کی بساط بچھتی چلی جائے گی۔ نبی اکرم اور حضور کے رفقاء کی جماعت نے یہی کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ چند دنوں کے اندر ایک ایسا مجر العقول انقلاب برپا ہو گیا جس کی مثال چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی اور جس کے اسباب معلوم اور متعین کرنے کے سلسلے میں دنیا بھر کے مورخ آج تک انگشت بدندان ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اس قانون کا ساتھ چھوڑ دیا اور اسی نظامِ زندگی کو اختیار کر لیا جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا تو خدا کا کائناتی قانون پھر اپنی رفتار سے چلنے لگ گیا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے آپ

**دُنیا از خود ادھر آرہی ہے** | اس ہزار سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ کس طرح انسان اپنے ناکام تجارب کے بعد رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر،

قرآنی نظامِ زندگی کے مختلف اجزاء کو اپناے چلا آرہا ہے۔ لیکن اس تبدیلی کی رفتار بہر حال سُست ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ ہم اس خطہ زمین میں جسے ہم نے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا کہ ہم یہاں اسلام کا صحیح نظام قائم کریں، خدا کے کائناتی قانون کی رفاقت کا فریضہ سرانجام دیں تاکہ اس کے

**میری کوشش** | نتائج ہمارے حساب و شمار سے برآمد ہونے شروع ہو جائیں۔ اس کے لئے پہلا قدم یہ تھا کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے تاکہ قرآن

کا جو تصورِ زندگی اتنے عرصے سے نکا ہوں سے اوجھل ہو چکا ہے وہ پھر ہمارے سامنے آجائے۔ تشکیلی پاکستان کے بعد میں نے اپنی تمام مساعی کو اس نقطہ پر مرکوز کر رکھا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اس کے نتائج بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ اب اگلا مرحلہ یہ ہے کہ پاکستان کا مجوزہ آئین انہی خطوط کے مطابق مرتب ہو جائے اور اس طرح کاروانِ ملت اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے جو اسے قدم قدم پر آئی نظامِ ربوبیت کی آخری منزل تک لے جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو آپ دیکھئے گا کہ غلط نظامہائے زندگی کا ستیا ہوا انسان کس طرح، کشاں کشاں اس نظام کے حیات پرور سایہ عافیت میں پناہ لینے کے لئے آتا ہے اور کس طرح پھر یَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (۱۱۰/۲) کا کیف اور منظر وجہ بالیدگی قلب و نظر ہو جاتا ہے۔ وَ أَشْرَقَتِ الْأَشْهُارُ مِنْ بَنُوْرٍ رَبَّهَا (۳۹/۱۹) زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی) کی بشارت کس طرح ایک زندہ شہادت بن کر سامنے آجاتی ہے۔

جو لوگ قرآن کے نظامِ ربوبیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں کیا ان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کوشش کریں کہ آئین پاکستان اس نظام کا مظہر ہو اور مملکتِ پاکستان تمام افرادِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دے کہ

فَخَنُّ نَزْنُ قُكُمْ وَ آيَاهُمْ (۱۵۳)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔



## استفسارات

تقریب کے بعد سامعین کی طرف سے کچھ سوالات کئے گئے جن کے وہیں جواب دئے گئے۔ ان میں سے اہم سوالات اور ان کے جوابات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ سوال: ہم بھوک کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تو پھر ہم بلا قصور عذاب

خداوندی میں مبتلا کیوں کر دیتے گئے ہیں؟

جواب: اجتماعی جرائم اور ان کے نتائج کا سلسلہ انفرادی غلطیوں کی پاداش سے مختلف ہے۔

ایک قوم غلط نظام قائم کرتی ہے یا غلط روش اختیار کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ذلت اور پستی

بھوک اور افلاس کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے اس کا یہ عذاب آئندہ نسلوں تک برابر جاری رہتا ہے۔ یعنی اس قوم کی ہر نسل شروع ہی سے بھوک اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہ اس نسل کی پیش رو نسلوں کے اجتماعی اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جسے اس نسل کو بھگتنا پڑے گا۔ بعینہ جس طرح اگر کسی قوم کی ایک نسل اچھے کام کرتی ہے تو وہ قوم خوشحال ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد اس کی آنے والی نسلیں خوش حال پیدا ہوتی ہیں۔ انفرادی طور پر سمجھنا ہو تو یوں سمجھئے کہ تندرست ماں باپ کا بچہ پیدا ہونے پر تندرست ہوتا ہے اور جس بچے کے والدین کسی متعدی مرض میں مبتلا ہوں اسے وہ مرض پیدا ہونے کے ساتھ (وراثت میں) مل جاتا ہے اور وہ عمر بھر اس کا دکھ سہتا رہتا ہے جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس کے لئے تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ہماری سابقہ نسلوں نے غلطی کی اور اس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ ہم نے (تشکیلِ پاکستان کے بعد) خود غلط نظام قائم کیا اور ہم سے ملی جرائم بھی مسلسل سرزد ہوتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بھوک اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ لہذا ہمارے قصے میں تو یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ہم بلا قصور عذابِ خداوندی میں مبتلا ہیں۔ البتہ اگر ہم نے اپنی سابقہ غلطیوں کی تلافی نہ کی تو ہماری آنے والی نسلیں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گی کہ ہم اپنے اسلاف کے جرائم کی سزا بھگت رہے ہیں۔

یہ ہے اجتماعی جرائم کا فلسفہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے "قومیں" جہنم میں داخل ہوتی ہیں (دیکھئے سورۃ اعراف، آیت ۳۸)۔

۲۔ سوال: یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنی سابقہ نسلوں کے جرائم کی پاداش میں بھوک کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ لیکن اس سے ہماری عاقبت کیوں خراب ہو؟

جواب: اگر ہم اپنی موجودہ حالت پر مطمئن رہے اور اس عذاب سے نکلنے کی کوشش نہ کی تو ہمارے اس جرم کی پاداش میں ہماری عاقبت خراب ہوگی۔ لیکن اگر ہم نے یہاں صحیح نظام قائم کرنے کی کوشش کی تو پھر ہماری عاقبت خراب نہیں ہوگی۔ خواہ یہ نظام ہماری زندگی میں قائم ہو جائے یا اس کے بعد۔ اگر یہ نظام ہماری زندگی میں قائم ہو گیا تو ہماری یہ زندگی بھی خوش حال ہو جائے گی اور اگلی زندگی بھی سرسبز و شاداب۔ لیکن اگر یہ نظام ہمارے بعد قائم ہوا تو ہم بے شک عسرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے مرجائیں گے لیکن ہماری اگلی زندگی شاداب ہوگی۔ اور ہماری آنے والی نسل کی زندگی خوش حال۔

اگر انہوں نے اس نظام کے استحکام کے لئے کوشش کی تو اس دنیا کی خوش حالی کے ساتھ ان کی اُخروی زندگی بھی شاد کام ہوگی۔ لیکن اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کی موجودہ زندگی تو آسانی سے گزر جائیگی۔ لیکن آخرت تباہ ہو جائے گی۔

۳۔ سوال :- آپ نے کہا ہے کہ جس قوم کی دنیاوی زندگی عسرت اور بد حالی کی ہوتی ہے اس کی آخرت بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس قوم کی اس دنیا کی زندگی خوش حالی میں گزرتی ہے اس کی آخرت بھی سنور جاتی ہے۔ اقوامِ مغرب کی موجودہ زندگی بڑے عیش و آرام میں گزرتی ہے۔ کیا وہ آخرت میں بھی اسی طرح عیش کریں گے؟

جواب :- آپ نے مندرجہ بالا نتیجہ اخذ کرنے میں عجلت کی ہے۔ صورت یہ ہے کہ اس دنیا میں رزق کی کثاؤگی خدا کے طبعی قوانین سے وابستہ ہے۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق تسخیرِ فطرت کریگی اس کی زندگی خوش حالی میں گزرے گی۔ وہ قوم مسلم ہو یا غیر مسلم۔ قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں خدا کسی میں تفریق نہیں کرتا۔ **كُلًّا نُمِيتُ هَلْؤًا لَّآءٍ وَ هَلْؤًا لَّآءٍ مِّنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَ مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُؤْمًا** (۱۴/۲۰) جو چیزیں خدا نے نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عطا کی ہیں۔ یعنی سامانِ رزق۔ وہ زمین کے دسترخوان پر کھلی پڑی ہیں۔ جس کا جی چاہے ہاتھ بڑھا کر اٹھالے۔ جو قوم ان کے حاصل کرنے میں جس قدر محنت کرے گی اسے اسی قدر مل جائے گا۔ یہ نہیں کہ خدا نے غیر مسلموں کے راستے میں بند لگا دئے ہوں کہ وہ آگے بڑھ کر انھیں حاصل نہیں کر سکتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس دنیا کی متاع ہر قوم کو باندازہ، سعی و عمل مل جاتی ہے لہذا اگر کوئی غیر مسلم قوم اس کے لئے محنت کرتی ہے تو اسے دنیا میں خوش حالی نصیب ہو جاتی ہے۔ جماعتِ مومنین، زندگی کے ہر شعبے میں، قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتی ہے اس لئے اس کی دنیاوی زندگی یقیناً سرفرازی اور سربلندی کی زندگی ہوتی ہے اور چونکہ اس کے نزدیک زندگی اسی دنیا کی نہیں بلکہ وہ موت کے بعد بھی مسلسل آگے بڑھتی ہے اس لئے اس کی اُخروی زندگی بھی تابناک ہوتی ہے۔

جو غیر مسلم قوم دنیاوی متاعِ زیست کے لئے کوشش کرتی ہے اس کی دنیاوی زندگی خوش حال ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ زندگی کو اسی دنیا تک محدود سمجھتی ہے اور انسانی ذات کی نشوونما سے متعلق قوانینِ خداوندی پر یقین نہیں رکھتی اس لئے اس کی اُخروی زندگی ناکام رہتی ہے۔ اقوامِ مغرب کی یہی



حالت ہے۔ لیکن جو قوم بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس سے نکلنے کی کوشش نہ کرے اس کی دنیاوی زندگی بھی عذاب میں گزرتی ہے اور اخروی زندگی بھی عذاب میں۔ (ہم بد قسمتی سے اسی شق میں آتے ہیں۔

۴. سوال: کیا اسلامی مملکت کے نظامِ ربوبیت میں غیر مسلموں کا بھی حصہ ہوگا؟

جواب: قرآنی نظامِ ربوبیت میں ہر فردِ آدم کا حصہ ہوگا خواہ اس کا مذہب و مشرب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ جس ملک میں حالت یہ ہو کہ اگر ایک کتابھی بھوک سے مر جائے تو اس کی ذمہ داری معاشرہ پر عاید ہو، اس میں کسی انسان کی بھوک کو کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے؟ خدا کی رب العالمین (عالمگیر ربوبیت) انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتی۔

۵. سوال: جب نظامِ ربوبیت میں تمام انسانوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں تو پھر قرآنی نظام کے سامنے کیا پروگرام ہوگا؟

جواب: جیسا کہ دورانِ تقریر میں بتایا گیا ہے قرآن کی رو سے انسانوں کو بنیادی ضروریات کی پریشانیوں سے اس لئے فارغ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کامل اطمینان اور سکون سے کر سکیں۔ انسانی ذات کی ممکنات، جن کی نشوونما مقصودِ حیات ہے اتنی وسیع ہیں کہ ہم اس وقت جبکہ ہمیں شعور ذات تک بھی نصیب نہیں، اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ بہت بڑا پروگرام ہے۔ نہ معلوم جب افرادِ انسانہ کی ذات میں نشوونما ہوگا تو یہ دنیا کیا سے کیا بن جائے گی۔

یہ تو رہا انسانی ذات کی نشوونما کا قصہ۔ ویسے اگر محض بنیادی ضروریات کے پورا کرنے کے پروگرام کو لیا جائے تو وہ بھی اتنی جلدی ختم نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے اس نظام کو صرف انسانوں کی ضروریات تک محدود نہیں رکھا اس نے دآبۃ کہا ہے جس کے معنی ہر ذی حیات یا ہر چلنے والا ہے۔ نیز دآبۃ کے متعلق اس نے کہا ہے کہ وہ آسمان کی زمین میں نہیں، اجرامِ فلکی میں بھی موجود ہیں (وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا مِنْ دَابَّةٍ ۙ ۲۹/۴۲) یورپ کے سائنس دانوں کے سامنے صرف اجرامِ فلکی کا مسخر کرنا ہے اور وہاں کے سیاسی مدبروں کے پیش نظر ان جدید دنیاؤں میں اپنی استعماریت کی توسیع لیکن قرآنی نظام ان حالات میں یہ سوچے گا کہ ان اجرام میں بسنے والے ”دابہ“ کی پرورش کی ذمہ داری بھی اس کے فرائض میں شامل ہو جائے گی کیونکہ اس کے خدا نے اپنے آپ کو رب العالمین کہا ہے اور عالمین میں پوری کائنات آجاتی ہے۔ بہر حال آپ گھبرائیے نہیں، قرآنی

نظام کا پروگرام اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو جائے گا کہ آپ کے کرنے کے لئے کوئی کام ہی نہ رہے۔

گماں مبرکہ بہ پایاں رسید کارِ مغان

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

۶۔ سوال :- پاکستان میں قرآنی نظام راجحیت کے قیام کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔

جواب :- سب سے پہلے اس فکر کو عام کرنا چاہیئے کہ دین کا مقصود اس نظام کا قیام ہے اور اسلامی مملکت

اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس فکر کے عام کرنے سے مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے نئے آئین میں یہ بات درج

ہو جائے کہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات اور ان کی ذات کی نشوونما کے لئے اسباب و ذرائع فراہم کرنا مملکت

کی ذمہ داری ہے جب مملکت اس فریضہ کو اپنے ذمہ لے لے گی تو اس نظام کا قیام عمل میں آجائے گا اس کے لئے

وقت ضرور لگے گا۔ آئین میں اس شق کے شامل ہو جانے سے ہماری منزل کا تعین ہو جائے گا۔ آپ اس فکر کے عام

کرنے میں جس قدر کوشش کریں گے اسی قدر اس نظام کے قیام کے امکانات روشن ہوتے جائیں گے۔



# اپنی آنکھ اور قرآن کی روشنی

(اپریل ۱۹۴۲ء)

کسی نئی زبان کے سیکھنے میں کس قدر محنت درکار ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے بچے کو دیکھئے کہ وہ ان دشوار گزار مراحل کو کس آسانی سے عبور کر لیتا ہے۔ بچہ جب بولنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس طرح بلا تکلف تین شروع کر دیتا ہے گویا یہ سب کچھ اسے پہلے ہی سے یاد تھا۔ اس نے اپنے گہوارہ میں خاموش نگاہوں سے سب کچھ سیکھ لیا تھا اور سیکھا اس پختگی سے کہ نہ صرف الفاظ ہی ازبر ہو گئے، بلکہ اس لب و لہجہ کی بھی پوری پوری نقل کر لی جو اس کے ماحول کی فضا کو متحرک کر رہا تھا اور نقل بھی ایسی مکمل کہ دو لفظ بولنے سے معلوم ہو جائے کہ بچہ کس خطہ اور کس قبیلہ سے متعلق ہے۔ بڑی عمر میں پہنچ کر جو زبان سیکھی جائے اس میں اہل زبان کا سلب و لہجہ پیدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے اور ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ یہ پہچانا ہی نہ جاسکے کہ وہ زبان اس کی مادری زبان ہے یا بعد میں سیکھی ہوئی۔ لیکن بچہ اس نقل کرنے میں کمال کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بچہ کا ذہن کس قدر اخاذ ہوتا ہے اور وہ نقوش جو چپکے ہی چپکے اس کے لوح قلب و دماغ پر آغوشِ مادر میں منقش ہو جاتے ہیں۔ کیسے امنٹ اور دیر پا ہوتے ہیں۔ لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بچہ کے دماغ کی یہ اخاذی اور اثر قبولی صرف زبان ہی تک محدود ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دماغ تو بہر حال دماغ ہے جب وہ حروف و الفاظ اور لب و لہجہ کی حرکات و سکنات سے ایسا متاثر ہوتا ہے تو گرد و پیش کے دیگر احوال و کوائف سے اثر پذیر کیوں نہ ہوگا؟ زبان کی اثر پذیری چونکہ الفاظ کے محسوس پیکر میں ہمارے سامنے

آجاتی ہے اس لئے ہم اسے ناپ لیتے ہیں، لیکن خیالات کی اثر پذیری بچنے کے قلب و دماغ میں غیر محسوس طور پر پرورش پاتی ہے اس لئے ہم اس کا احساس نہیں کرتے۔ لیکن اگر

## وراثتی اور ماحولی اثرات

ہم اس کا احساس کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں جنہوں نے کرنا چاہا انہوں نے ان غیر محسوس خیالات کو بھی ناپ تول کر دیکھ لیا۔ علم تجزیہ نفس کی بنیاد ہی اس اصول پر ہے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کا بچہ اپنے وراثتی اور ماحولی اثرات کا پیچر ہوتا ہے۔ اور یہی نقوش و اثرات آہستہ آہستہ وہ محکم چٹانیں بن جاتے ہیں جن پر اس کے نظریات زندگی اور معتقدات حیات کی ثریا بوس عمارتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ یہ اثرات جب توارث و تواتر سے نسل بعد نسل منتقل ہوتے چلے آئیں تو ان کی ابتدا کتنی ہی غلط بیخ پر کیوں نہ ہوئی ہو رفتہ رفتہ اس قوم کے لئے یہی چیزیں صداقت و حقیقت کا معیار بن جاتی ہیں جنہیں اس قوم کے افراد انتہائی خوش عقیدگی سے دل کے نازک ترین گوشوں میں چھپائے پسینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔ یہ غلط نظریات ان کے نزدیک ایسی گراں بہا متاع کی شکل اختیار کر جاتے ہیں کہ ان کا چھوڑنا تو ایک طرف، چھوڑنے کے تصور تک سے وہ اس طرح کانپ اٹھتے ہیں گویا ان کی کائنات لٹی جا رہی ہے۔ غلط نظریات و معتقدات کے یہ حسین و نظر فریب پردے اتنے دبیز ہوتے ہیں کہ انسان کی اپنی کوششیں انہیں چاک نہیں کر سکتیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان پردوں کو کون چاک کرے؟ اس لئے کہ اس ماحول میں تو کم و بیش ہر ایک وراثتی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ مبداء فطرت کی کرم گستری نے یہ انتظام اپنے ذمہ لیا کہ وقتاً فوقتاً ایسے پیغامات اس مقام سے آتے رہیں جو وراثت و ماحول کے تمام اثرات سے محفوظ و غیر متاثر ہے (یعنی وحی کے ذریعہ)۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان پیغامات خداوندی سے ہدایت حاصل کرنے کا طریق کیا ہے؟ اور وہ روش کون سی ہے جس سے اس ہدایت سے مستفید نہیں ہو جا سکتا۔ اس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لے۔ ذہن و ادراک کی قوتوں کو کام میں لائے۔ ڈھور ڈنگ کی طرح آنکھیں بند کر کے جس ڈگر پر چلے آ رہے ہیں اسی پر نہ چلتا جائے۔ اگر انسان نے فکر و نظر سے کام نہ لیا تو اس پر ہدایت کی روشنی گم ہو جائے گی۔ روشنی سے تو وہی مستیز ہو سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر رکھے

## عقل انسانی

آنکھیں بند کر کے دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلنے والوں کا انجام جہنم ہے۔ فرمایا۔  
وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْإِنْسِ لَٰكُمُ قُلُوبٌ

لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ  
لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۗ أُولَٰئِكَ  
هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (۷۹/۷۹)

اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں جنہیں ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا (یعنی ان کے غلط اعمال کی وجہ سے ان کا بالآخر ٹھکانہ جہنم ہونے والا ہے) یہ اس لئے کہ ان کے پاس عقل ہے لیکن اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے (وہ عقل و شعور کی قوتوں کو بیکار کر کے چارپایوں کی مانند ہو گئے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے ایسے ہی لوگ ہیں جو یکسر غفلت میں ڈوب گئے۔

یہ ہیں وہ بنیادی خطوط جن پر حق و باطل کی کشمکش متشکل ہوتی چلی آرہی ہے۔ یعنی قانونِ خداوندی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان (ان قوانین کی روشنی میں) اپنی عقل و فکر سے کام لے اور اس طرح زندگی کی صحیح راہوں پر چلتا جائے۔ اس کے برعکس وراثتی اثرات کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان اس دعوت پر غور و فکر کرے بلکہ بلکہ ضد سے اسی روش پر چمارہے جس پر اس کے آبا و اجداد چلتے آرہے ہیں۔ اور جسے وہ وراثتی اور گرد و پیش کے خارجی اثرات کے ماتحت صحیح راہ سمجھ رہا ہے۔ اس کا نتیجہ جہنم ہے۔ جس دن سے خدا کا پیغام دنیا میں آنا شروع ہوا اس دن سے علم و بصیرت اور تقلید و جمود کی یہ کشمکش جاری ہے۔ قرآن کریم میں اہم سابقہ کے احوال و کوائف بیان کر کے اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا تاکہ آنے والے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ مندرجہ صدر آیات میں مذکور ہے کہ

فَاَقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝ (۲۴/۲۴)

سولے پیغمبر! ان تاریخی سرگزشتوں کو لوگوں سے بیان کرو تاکہ وہ ان پر غور و فکر کریں۔

تاریخی یادداشتیں | قرآن کریم کے بیان کردہ اہم سابقہ کے ان قصص و حکایات کو سامنے لائیے اور پھر ان پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ بار بار اس حقیقت کو

دہرایا گیا ہے کہ آباؤی تقلید سے انسان حقیقت کے راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ اس کے بعد حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے آسمانی انقلاب ان تک آتا۔ لیکن ان میں سے اکثر اس سے محض اس لئے اعراض برتتے

کہ وہ پیغام ان کے آبا و اجداد کی روش کے خلاف ہوتا، حالانکہ اس پیغام کی دعوت سرسری عقل و بصیرت اور غور و تدبیر پر مبنی ہوتی۔ لیکن وہ لوگ غور و فکر کے پاس نہ پھٹکتے اور جس راہ پر چلے آ رہے تھے اسی پر چلے جانے میں عافیت سمجھتے۔ سب سے پہلے قوم حضرت نوحؑ کو لیجئے۔ ان تک پیغام خداوندی آیا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ

مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ (۱۳/۲۴)

ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے ایسی بات کبھی نہیں سنی۔

**تقلیدِ آباء** یعنی انکار کی وجہ یہ ہے کہ یہ دعوت ان کے اسلاف کی روش کے خلاف تھی اور انہوں نے اپنے بزرگوں سے کبھی ایسی بات نہیں سنی تھی۔

قوم نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ کی قوم کو لیجئے۔ جب ان سے کہا گیا کہ خدائے قہار کی عبودیت اختیار کرو تو انہوں نے کہا۔

أَجِئْنَا لِنُعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَ نَدَّأ مَا كَانَ يُعْبَدُ آبَاؤُنَا ؟

(۷/۷۰)

کیا تم صرف اس لئے ہمارے پاس آتے ہو کہ ہم صرف ایک خدا کی عبادت کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آباء و اجداد کرتے چلے آتے ہیں۔

وہی ساز کہن کہ جس روش پر اسلاف چلے آ رہے ہیں اسے چھوڑ کر اس نئی روش کو کس طرح اختیار کر لیا جائے؟ یعنی اپنے مسلک کی تائید و صداقت میں کوئی دلیل نہیں، کوئی بڑھان نہیں۔ بس دلیل ہے تو فقط یہ کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ان کے آباء و اجداد چلتے آ رہے ہیں۔

قوم ہودؑ کے بعد حضرت صالحؑ کی قوم کو دیکھئے۔ قوم کو اس مرد صالح سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ یہ ہمارے باپ دادا کی روش پر چل کر ہماری پیشوائی کرے گا۔ لیکن جب اس نے حق و صداقت کی ایسی بات کہہ دی جو ان کے آبائی مسلک و طریق کے خلاف تھی تو انہوں نے منہ پھیر لیا اور کہہ دیا کہ کیسا افسوس کا مقام ہے! اس شخص سے کتنی اُمیدیں وابستہ تھیں اور اس نے کس طرح ان سب کو خاک میں ملا دیا۔

قَالُوا يٰصَلِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا أَتَنْهَانَا أَنْ

تَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّا لَفِي شَكِّ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ

(۱۱/۶۲)

انہوں نے کہا کہ اے صالح پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ہم ان معبودوں کی عبودیت اختیار کریں جن کی عبادت ہمارے آبا و اجداد کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو۔

ایسا ہی جواب حضرت شعیب کو اپنی قوم کی طرف سے ملا۔ جب انہوں نے قوم کو اس غلط راستے سے روکا جس پر وہ آبائی تقلید کی رو سے آنکھیں بند کر کے چلے آ رہے تھے تو قوم نے جواب دیا۔

قَالُوا يَشْعِيبُ أَسْلَوْنَاكَ تَأْمُرُكَ أَنْ تَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا  
أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ

(۱۱/۸۷)

قوم نے کہا کہ اے شعیب! کیا تیری یہ نمازیں تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں اگر کہے کہ ان معبودوں کو چھوڑ دو جن کی عبودیت ہمارے باپ دادا اختیار کرتے آئے ہیں۔ یا یہ کہ یہ تمہارے اختیار میں نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو کرو۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو۔

غور فرمائیے! اس جواب سے انکار و اعراض کی راہ اختیار کرنے والوں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح چھلک رہی ہے؟ یعنی ہمارے آبا و اجداد سب غلط راستے پر تھے اور یہی تمہارا راہ راست پر ہے؛ اسلاف کی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے والوں کی بالکل یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ان کے قلوب پر بزرگوں کی عظمت و عقیدت اس درجہ چھا جاتی ہے کہ وہ انہیں معصوم و منترہ عن الخطا سمجھنے لگ جاتے ہیں اور اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص ان کی روش کو غلط بتائے۔

یہی کچھ فرعون کی قوم نے کیا جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون ان کے پاس خدا کی کھلی ہوئی نشانیاں لے کر گئے۔ چونکہ ان باتوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس لئے انہوں نے وہی جواب دیا جو اس سے پیشتر آبائی اثرات کے ماتحت ہر داعی الی الحق کو ملتا چلا آیا تھا۔

قَالُوا أَجِئْنَا بِتِلْفٍ نَّاءً وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَشَكُّونَ لَكُمْ  
 الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ ۖ وَمَا نَحْنُ لَكُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۰/۷۸)

انہوں نے کہا کہ کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادا کو  
 چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دو اور ملک میں حکومت تم دونوں بھائیوں کے لئے ہو  
 جائے۔ ہم تو تمہاری بات ماننے کے نہیں۔

ملتِ حنیفہ کے موسسِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ نے بھی جب اپنی قوم کو اس غلط راہ سے روکا جس پر ان کے  
 آبا و اجداد چلتے آ رہے تھے تو انہیں بھی یہی جواب ملا کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا۔

قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عِبَادِينَ ۝ (۲۱/۵۳)

انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا۔ وہ ان ہی کی پرستش کیا کرتے تھے۔  
 غرضیکہ جہاں جہاں اور جب کبھی پیغامِ خداوندی اپنی روشن دلیلوں کے ساتھ پہنچا تو ان لوگوں کی طرف  
 سے جو اپنے آبا و اجداد کے طور طریق پر چلے جانے میں ہی عافیت سمجھتے تھے اور جن کے ذہن میں یہ خیال جم چکا  
 تھا کہ ان کے اسلاف کبھی غلطی نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے ہر جگہ اس پیغامِ حقیقت کی مخالفت کی۔  
 چنانچہ سورۃ ابراہیمؑ میں تمام اقوامِ سابقہ کے متعلق جامع طور پر فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی روش اختیار  
 کی اور حضراتِ انبیاءِ کرامؑ سے یہی کہا کہ

تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَنَا عَمَّا كَانَ آبَاؤُنَا ۖ (۱۲/۱۰)

تم چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی عبادت ہمارے آبا و اجداد کرتے چلے آئے ہیں ان سے ہمیں  
 روک دو۔

پھر جب ایسا ہوا کہ وہی نورِ آسمانی جو پہلے مختلف اقوام و مملکتوں کے پاس قندیلوں کی شکل میں آتا رہا، قرآن  
 کی شکل میں مہرِ عالمتاب بن کر چمکا تو شہرہ چشم لوگوں  
**قرآن اور اسلاف پرستی** نے حسبِ معمول یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم آنکھیں

نہیں کھولیں گے، اس لئے کہ ہم نے اپنے آبا و اجداد کو اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے دیکھا ہے۔

بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ شِرْهِمِ

مُهْتَدُونَ ۝ (۲۳/۲۲)



بلکہ انہوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راہ پر چلتے دیکھا اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چلے جا رہے ہیں۔

ایک دیدہ بینا کے لئے یہ جواب یقیناً حیرت انگیز تھا کہ روشنی آجانے کے بعد جب معلوم ہو جائے کہ جس راہ پر درستی اثرات کے ماتحت چلے جا رہے ہیں وہ راہ ہلاکت و تباہی کے مہیب غاروں کی طرف لئے جا رہی ہے، اس کے باوجود اسی راہ پر چلنے پر اصرار کرنا اور اس کے لئے دلیل یہ لانا کہ ہمارے آبا و اجداد اسی راہ پر چلا کرتے تھے، کھلی ہوئی حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے متعلق خود خالقِ فطرت نے بتایا کہ ان کی یہ روش کچھ انوکھی نہیں، بلکہ مسخ شدہ ذہنیاتوں کا تقاضا ہی ہوتا ہے۔ جہاں جہاں روشنی آتی رہی اسلاف کی تقلید میں آنکھیں بند رکھنے والے خفاشوں نے ہمیشہ اس کی طرف سے منہ موڑا۔

وَكَذَلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ ۝ (۲۳/۲۳)

اور اسی طرح (لئے رسول) تجھ سے پہلے بھی جس بستی میں ہم نے کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا تو وہاں کے تن آسان لوگوں نے ہی کہا کہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آبا و اجداد کو ایک روش پر چلتے دیکھا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم کی پیروی کریں گے۔

جیسا کہ ظاہر ہے، یہ دلیل اتنی بودی اور یہ روش ایسی احمقانہ تھی کہ اس کی تردید کے لئے کسی بحث و تہیص کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے جواب میں اتنا ہی کہا جاسکتا تھا کہ جس روش کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ مسلک خود تمہارے آباؤ اجداد کا مسلک ہے، کتنا ہی بہتر اور محکم کیوں نہ ہو، کیا تم پھر بھی اسی روش کہن ہی پر چلے جاؤ گے؟ یعنی اگر تم اس دعوتِ جدیدہ اور آباؤ اجداد کے مسلک کو دلائل و براہین کے ترازو میں رکھ کر تولنے کی کوشش کرو تو ہم بتائیں کہ یہ دعوت کس قدر گراں بہا ہے، لیکن اگر دلیل فقط اتنی ہو کہ یہ روش چونکہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے سیدھی اور محکم نہیں تو اس کا کیا جواب؟

ثُمَّ إِنِّي أَمَّا آتِيكُمْ بِهِ كَيْفَ رُؤُون ۝ (۲۳/۲۳)

(ان پیغمبر نے) کہا کہ خواہ میں تمہارے پاس اس راہ سے جس پر تمہارے آبا و اجداد چلتے تھے

کہیں زیادہ صحیح راہ لے کر آیا ہوں (تو کیا تم پھر بھی اس پرانی یکسر پر چلتے رہو گے) انہوں نے کہا کہ (ہمارے پاس دلیل و حجت تو ہے نہیں لیکن) بات یہی ہے کہ ہم اس پیغام سے انکار کرتے ہیں جسے دے کر تم بھیجے گئے ہو۔

یہی جواب سلسلہ انبیاء کرام کی پہلی کڑیوں کی طرف سے دیا جاتا رہا اور یہی جواب اس مقدس سلسلہ کی آخری اور مکمل کڑی والی کڑی کی طرف سے دیا گیا۔

وَإِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتِنَا أَنْتَبِعُوا مَا أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ اللَّهُ قَالَُوا بَلْ نَسْتَعِينُ مَا آتَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءُنَا ۚ أَوْ نَكُونُ آبَاءَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ

(۲/۱۷۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے پر چلیں گے جس پر اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر تمہارے بڑے بوڑھے عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں (تو پھر بھی تم عقل و ہدایت سے انکار کر دو گے)۔



انسانی ضد اور جہالت بے دانشی اور بے راہ روی، وراثتی اثرات کے ماتحت اسلاف کی اندھی تقلید کی یہ داستان ہمارے سامنے ہے، جو ان کے آنکھ کھولنے کے دن سے لے کر حضور خاتم النبیین صلعم کے عہد مبارک تک مسلسل چلی آرہی تھی۔ لیکن کیا اس بے دانشی اور اسلاف کی کورانہ تقلید کا سلسلہ ختم ہو گیا؟ ختم کیسے ہو سکتا تھا؟ ابلیس نے تو اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لئے مہلت لے رکھی ہے۔ سو جب تک ابن آدم دنیا میں موجود ہے ابلیس نہ صرف بے بھی اس کی راہ میں موجود رہیں گے۔ پہلی اُمتوں میں کیا ہوتا تھا؟ کچھ عرصہ تک لوگ اپنے رسول کے لائے ہوئے پیغام کا اتباع کرتے۔ اس کے بعد جب نفسانی خواہشات ان پر غالب آجائیں تو وہ رفتہ رفتہ دوسری شاہراہوں پر چل نکلنے شروع میں مگر ابی کی یہ روش بالارادہ ہوتی، لیکن اس کے بعد آنے والی نسلیں، غیر شعوری طور پر اپنے آبا و اجداد کے وراثتی اثرات کے ماتحت، اس غلط مسلک کو اختیار کئے جاتیں۔ اس کے بعد ایک اور رسول آجاتا۔ اس لئے کہ ان لوگوں نے جہاں اپنے عمل کی راہ بدلی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پیغامِ خداوندی میں بھی تحریف و الحاق شروع کر دیا تھا۔

## آج بھی وہی حال ہے

نیز کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ پیغامِ حوادثِ ارضی و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتا۔ بہر حال وہ پیغامِ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ رہتا۔ اس لئے ایک دوسرا رسول آتا اور تجدیدِ دعوت کرتا۔ نبی اکرمؐ کے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس لئے کہ خدا کا آخری پیغام اپنی اصل شکل میں دنیا میں موجود ہے اور موجود رہے گا۔ لیکن اس پیغام کی محض موجودگی اس بات کی دلیل نہیں کہ جس طرح پہلی قومیں راہِ راست کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ وراثتی اثرات کے ماتحت غلط راستے پر چل نکلیں۔ یہ قوم غلط روش اختیار نہیں کرے گی۔ غلط روش اختیار کرنے کے لئے سینکڑوں محرکات اور ہزاروں اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس روش سے محفوظ رہنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے ہر قدم کا جائزہ پیغامِ خداوندی کی روشنی میں لیتا رہے اور جوں ہی کوئی قدم غلط طریق پر اٹھنے لگے اسے فوراً قرآن کے صراطِ مستقیم کی طرف لے جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمان غلط راستے پر چلے مجھے اس سے غرض نہیں کہ فلاں فرقہ غلط راستے پر چلا اور فلاں صحیح روشنی پر گامزن رہا لیکن بہر حال یہ واقعہ ہے کہ ایک فرقہ نہ سہی دوسرا سہی، غلط روش پر ضرور چلا اور چلے جا رہا ہے۔ ملتِ واحدہ کا فرقوں میں بٹ جانا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ہر ایک فرقہ صحیح روش پر نہیں رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ ہی سمجھتا ہے کہ میں راہِ راست پر ہوں اور دوسرے فریق غلط روش پر ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر پہلی امتوں میں سے کسی امت کی یہی حالت ہو جاتی جو ہماری ہو چکی ہے (اور آج سے نہیں ایک عرصہ سے ہو چکی ہے) اور ان کی اصلاح کے لئے کوئی رسول آتا اور خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کرتا تو ان کی طرف سے کیا جواب ملتا؟ وہی جواب جو ملتا آیا ہے۔ یعنی یہ کہ چونکہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم تمہاری نہیں سنتے! اس کے جواب میں داعی الی الحق لاکھ پیغامِ خداوندی کی روشنی کو پیش کرتا۔ لیکن اس کو وہی جواب ملتا جو حضرت صالحؑ کی قوم نے دیا تھا کہ ہاں ہمارے اسلاف سب غلطی پر تھے۔ بس تمہیں ایک راہِ راست پر چلنے والے رہ گئے آج ہماری اصلاح کے لئے کوئی رسول نہیں آسکتا۔ لیکن جو روشنی رسولوں کی وساطت سے ملا کرتی تھی وہ تو ہمارے پاس موجود ہے۔ اب دیکھئے کہ آج بھی جو شخص قرآنِ کریم کی آسمانی تفسیر کو سامنے لا کر قوم کو بتاتا ہے کہ اللہ کی متین کردہ صراطِ مستقیم کون سی ہے اسے وہی جواب ملتا ہے یا نہیں جو پہلی قوموں کی طرف سے ملا کرتا تھا۔ یعنی یہ کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم اسے قبول

کرنے پر تیار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بھائی میں تو کچھ نہیں کہتا۔ کہنے والی خدا کی یہ کتاب ہے۔ ان کی طرف سے اس کا کیا جواب ملتا ہے؟ اسی ساز کہن کی صدائے بازگشت! کہ لو بھائی یہ آگیا کہیں سے بڑا مغتبر! بھلا ہمارے اسلاف قرآن نہیں جانتے تھے؟ وہ کہتا ہے کہ بھائی! اس میں بحث و جدل اور لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ہے قرآن اور یہ ہے تمہاری روشنی! تم خود پرکھ کر دیکھ لو کہ یہ روش قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کا بھی وہی جواب ملتا ہے کہ ہمیں پرکھ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے اسلاف نے سب کچھ دیکھ کر لیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر انسان سے کہا جائے کہ تمہارے بزرگ غلطی بھی کر سکتے تھے تو اس سے ان کے جذبات کو بڑی ٹھیس لگتی ہے۔ بالخصوص

## قرآن میں آباروش

جب کہ ان بزرگوں کے ساتھ عقیدت و ارادت مندی کے مقدس جذبات بھی وابستہ ہوں۔ لیکن تنقید کی حد سے بالا صرف وحی الہی ہوتی ہے۔ غلطی کا امکان ہر انسان سے ہوتا ہے۔ اور غلطی سے کسی انسان کے تقدس اور بزرگی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ ہم اپنے ہم معصروں میں غلطی کا امکان تسلیم کرتے ہیں۔ ان غلطیوں پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ یہی ہم عصر آئندہ نسلوں کے اسلاف بن جاتے ہیں۔ اس لئے اسلاف میں غلطی کا امکان نہ ماننا یا انہیں تنقید کی حد سے بالاتر سمجھنا کس دلیل کے ماتحت ہو سکتا ہے؟ محض یہ اتفاق کہ ایک شخص ہم سے سو برس پیشتر وفات پا چکا ہے اسے منترہ عن الخطا نہیں بنا سکتا! اس کی تحقیقات کو قرآنی روشنی میں پرکھ لینے سے اس کی کسی قسم کی تحقیر و تذلیل نہیں ہو جاتی۔ ہر شخص کا فہم، ادراک، تحقیق، اس کے ماحول اور زمانہ سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر زمانہ مابعد کا انسان اپنے کسی پیشرو کی تحقیق میں غلطی دیکھے تو اس سے اس پیش رو کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ وہ اپنے زمانہ اور ماحول میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے جو محنت کی اور مشقت اٹھائی وہ ہمارے نزدیک درخور تحسین ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی محنت کا ماحصل تمام کا تمام وحی منزل کی طرح واجب التسلیم سمجھ لیا جائے۔ نیز یہ تنقید و تحقیق کسی شخص کی ذاتی رائے کے تابع نہیں ہوگی۔ بلکہ قرآن کریم کے مطابق ہوگی۔ اگر زیر تنقید معاملہ قرآن کے مطابق ہو تو ہوا المراد۔ اس کے صحیح تسلیم کرنے میں کسے انکار ہو سکتا ہے؟ اور اگر وہ قرآن کریم کے مطابق نہ نکلا تو اس سے رجوع کر لینے میں کون سی خفت ہو جائے گی؟ قرآن کریم تو وہ نصاب حیات ہے جس کے اتباع کا حکم خود ذات رسالتاً ہی کو بھی تھا۔

اتَّبِعْ مَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (۶/۱۰۶)

اے رسول جو کچھ تیرے رب کی طرف سے دی گئی ہے تم اس کی پیروی کرو۔  
اس لئے قرآن کریم کے اتباع میں اگر کسی بڑے سے بڑے بزرگ کا ذاتی خیال بھی ترک کر دینا پڑے تو اس میں ذرا سا تامل نہیں ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ حق کو کبھی انسانوں کے ذاتی خیالات کے تابع نہیں رکھنا چاہیے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو کوئی شے اپنی اصل پر قائم نہیں رہنے پاتی۔ آج ہم جادۂ اعتدال سے اس لئے ہٹے ہوئے ہیں کہ ہم نے حق کو انسانوں کی آراء کے تابع رکھ چھوڑا ہے۔ اور یہ سب وراثتی اثرات کے ماتحت غیر شعوری طور پر ہو رہا ہے۔ وَ لَوْ أَتَّبَعْنَا الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَ الْأَرْضُ وَ مَنْ فِيهِنَّ \* (۲۳/۷۱) اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین و آسمان اور جو کچھ اس کے درمیان ہے درہم برہم ہو جائے۔ دینِ خداوندی کے اکمل اور آخری ہونے کی دلیل ہی یہ ہے کہ حق ہر وقت اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے، اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی اور یہی حق ہے جو ہر بات کے پرکھنے کا معیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی دعوتِ علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ اندھی تقلید کی بنا پر نہیں، کورانہ تقلید میں بصیرت کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ یہ عقل و بصیرت کو اپیل کرنے والی دعوت نہ صرف صاحبِ قرآن (صلعم) ہی کا خاصہ و امتیاز تھا بلکہ حضور کے متبعین کی بھی یہی روش زندگی بتائی گئی ہے ارشاد ہے:-

قُلْ هٰذِهِ سَبِيلِي اَدْعُوْا اِلٰى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنْ

اتَّبَعْنِي \* (۱۲/۱۰۸)

(اے رسول!) تم کہہ دو کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں اس روشنی (بصیرت) کی بنا پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میرا اتباع کیا ہے وہ بھی (اسی حق کی طرف) دعوت دیتے ہیں۔

فرمائیے کہ جو نظریات و معتقدات، وراثت و ماحول کے اثرات کے ماتحت، اسلاف کی بے جا عقیدت مندی کے تابع اختیار کئے جائیں، ان کی دعوتِ علیٰ وجہ البصیرت کیسے قرار دی جاسکتی ہے؟



لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے متعلق قرآنی تنبیہ و

**مُسلِمَانِ كِي رُوشِ** | تنذیر اُمم سابقہ کے متعلق یا زیادہ سے زیادہ نبی اکرمؐ کے زمانے کے منکرین کے متعلق تھی، ہم سے اس کا کچھ واسطہ نہیں حالانکہ قرآن کریم میں اقوام گزشتہ کے قصص و حکایات اور احوال و کوائف کا ذکر آیا ہی اس لئے ہے کہ آنے والے ان سے عبرت حاصل کریں۔ لیکن ہم ہیں کہ قدم بہ قدم اُمم سابقہ کے نقوش و آثار پر چلے جا رہے ہیں اور ان میں خوش ہیں کہ ہم بالکل صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ راستہ ہمارے اسلاف کا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ اگر کسی راہ کی صداقت کے لئے اتنا ہی کافی ہو کہ وہ مسلک اسلاف سے منتقل ہو تو پھلا آ رہا ہے تو آپ اپنے زمانہ میں پیدا شدہ فرقوں کے علاوہ کسی اور فرقہ کی کسی روش کی بھی تکذیب نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ کون سا مسلک و مشرب ہے جو اسلاف سے منتقل ہو کر آئندہ نسلوں کو نہیں ملا۔ لہذا حق و صواب کی یہ راہ نہیں کہ اس کے ساتھ اسلاف کے نقوش قدم کی سند ہو۔ بلکہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب زندہ اس کی تائید کرے۔ جب قرآن کریم سامنے آجائے تو اس وقت کوئی چیز خواہ وہ ہمارے اپنے علم و عقل کی پیداوار ہو یا اسلاف سے منتقل ہو تو چلی آ رہی ہو، کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اس وقت حق و صداقت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ خدائی سند کے سامنے تسلیم خم کر دیا جائے، خواہ اس سے ہمارے اپنے خیالات کو ٹھیس لگے یا اسلاف کی غلط عقیدت مندی پر حرف آئے۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو سورۃ لقمان میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

وَ اِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَسْتَعِيْذُ بِكَ  
وَ جَدْنَا عَلَيْنَا اَبَاءَنَا اَوْ لَوْ كَانَ الشّٰيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابٍ  
اَسْتَعِيْزُوْا (۳۱/۲۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی روش کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء کو دیکھا ہے خواہ (اس روش کے مطابق) انہیں شیطان جہنم کے عذاب کی طرف ہی دعوت کیوں نہ دے رہا ہو۔

یہ تو ان کی کیفیت ہے جو اسلاف کے نقوش قدم پر بلا سوچے چلے جانے ہی میں نجات و سعادت کی راہ خیال کرتے ہیں۔ اس سے اگلی آیت میں صحیح مسلک کا بیان ہے۔

وَمَنْ يُسَلِّمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ  
بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ وَإِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ (۳۱/۳۲)  
اور جس نے اپنے آپ کو یہ خلوص قلبِ خدا (کے پیغام) کے سامنے جھکا دیا تو اس نے یقیناً  
ایک مضبوط شاخ کو پکڑ لیا اور انجامِ کار سب اللہ ہی کی طرف ہے۔

یعنی دینِ محکم نہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے خیالات ہی کا اتباع کرنے لگ جائیں اور نہ یہ کہ جو کچھ اسلاف سے  
منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے بغیر دیکھنے پر کھنسنے کے اس پر گامزن ہوتے چلے جائیں۔ دینِ قیم یہ ہے کہ اپنے  
خیالات اور اسلاف کی طرف سے منتقل ہونے والے معتقدات، سب کو قرآنِ کریم کے تراوی میں رکھ  
دیں۔ جو کچھ اس پر پورا اترے وہ قابلِ تسلیم جس کا وہاں کچھ وزن نہ ہو وہ بلا تاثر رد کر دینے کے قابل  
یہ وہ عروۃ الٰہی ہے جسے شکست و ریخت کا کوئی خوف نہیں۔ یہ وہ متاعِ گراں بہا ہے جسے کسی  
رہزن کا خطر نہیں۔

اس مسلک صحیحہ کے اتباع کی ضرورت یوں تو عام حالات میں بھی کچھ کم نہ تھی۔ لیکن اب جب کہ  
ہمارے سامنے ایک نئی زندگی اور زندگی کی نئی تعبیر آئی ہے۔ جب ہم نے اپنی زندگیوں کے لئے نئے  
قالب اختیار کرنے ہیں۔ جب اپنے لئے ایک نیا نظامِ حیات مرتب کرنا ہے۔ اس مسلک کی ضرورت اور بھی  
شدید ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت آئینِ نو کی تدوین میں جو مشکل سب سے زیادہ عنال گیر  
ہو رہی ہے وہ یہی احساس ہے کہ بہت سے عقائد اور احکام جو اسلاف سے متوارث چلے آ رہے ہیں ایسے  
ہیں جو ہماری نئی زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے لیکن چونکہ انہیں مذہب کی مقدس سند مل چکی ہے  
اس لئے انہیں چھوڑتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس ہو رہی ہے نتیجہ اس کا یہ کہ ان تصورات کو قائم ہی  
رکھا جاسکتا ہے نہ چھوڑا ہی جاسکتا ہے۔ قائم رکھنے میں زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے چھوڑنے میں اسلاف  
کے مسلک کی خلاف ورزی کا احساس دامنگیر ہو جاتا ہے۔

غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را

لیکن یہ مشکل ہماری اپنی پیدا کردہ ہے حقیقی نہیں۔ اس کا علاج واضح ہے۔ یعنی ہم خدا کی کتاب کو

اپنا نصب العین قرار دیں۔ اور اس کے سوا جو کچھ ہمارے قلوب و اذہان پر مستولی ہے اسے اس میزان پر تول لیں۔ جو اس پر پورا اترے وہ قابل قبول۔ جو پورا نہ اترے وہ جھٹک کر پھینک دینے کے قابل۔ خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف کیوں نہ کی جا رہی ہو۔





# نسخہ اور اس کا استعمال

(اکتوبر ۱۹۵۱ء)

حکیم صاحب کا کمرہ مریضوں سے بھر رہا تھا۔ حکیم صاحب باری باری ایک مریض کی نبض دیکھتے۔ شاگرد کو نسخہ لکھوا دیتے۔ مریض آگے بڑھ جاتا اور شاگرد سے نسخہ بھی لے لیتا اور ترکیب استعمال بھی سمجھ لیتا۔ ایک مریض جب نسخہ لے کر جانے لگا تو حکیم صاحب نے خاص طور پر پوچھا کہ ترکیب استعمال سمجھ لی ہے۔ اس نے کہا جی ہاں! گرم پانی میں اچھی طرح جوش دے کر چھان کر سوتے وقت پی لینا ہے۔ حکیم صاحب کا مرتبہ ایک ہی مرتبہ حکیم صاحب نے سر بلایا اور کہا کہ ہاں! احتیاط سے پینا۔ اور کل صبح آکر اطلاع دینا۔ مرض کو معمولی نہ سمجھنا۔

## حکیم صاحب کا مرتبہ

دوسری صبح مریض پھر آیا۔ حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور پوچھا کہ ہاں کہو کچھ فرق محسوس ہوا۔ مریض نے کہا "نہیں حضور! کچھ فرق نہیں، بلکہ آج تو تکلیف اور بڑھ گئی ہے۔" حکیم صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ لمبی سانس لی اور کچھ یاس آمیز لہجہ میں کہا "اچھا لاؤ۔ نسخہ دکھاؤ۔" "نسخہ؟" مریض نے کہا "حضور! نسخہ تو میں نے جوش دے کر پی لیا۔ نسخہ کہاں سے نکالوں؟" حکیم صاحب نے گھبرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ کیا کہا! نسخہ پی لیا۔ جی حضور! نسخہ جوش دے کر چھان کر پی لیا۔ چھوٹے چھوٹے پھلنی میں رہ گئے تھے انہیں میں نے پھینک دیا تھا۔" حکیم صاحب کا چہرہ غصے سے تپتا اٹھا۔ جوش غضب میں بولے "ارے بد بخت۔ ایسا حق! نسخہ کو جوش دے کر پی گیا۔" مریض حیران تھا کہ اس سے کیا خطا ہو گئی۔ اس نے تو بالکل ویسا ہی کیا تھا جیسا اس سے کہا گیا تھا۔ حکیم صاحب

نے پھر چلا کر کہا "ارے ہو قوف! کبھی نسخہ کو جوش دے کر بھی پیا کرتے ہیں؟" مریض ابھی تک ششدر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا معنی ہے؟ حکیم صاحب نے اپنی ڈانٹ کو جاری رکھتے ہوئے کہا "پاگل! نسخہ میں جو دوائیاں لکھی تھیں انہیں دوائی خانہ سے لینا تھا اور وہ دوائیاں جوش دے کر پینی تھیں نہ کہ اس کاغذ کے ٹکڑے کو جوش دینا تھا جس پر دوائیاں لکھی تھیں۔" مریض کو اب معلوم ہوا کہ اس کے مرض میں افاقہ کیوں نہیں ہوا؟

مریضوں کے ہجوم میں ہر شخص اس مریض کی حماقت پر ہنستا ہوا واپس آ گیا۔ شام تک شہر کے گلی محلے میں نسخہ کے اس انوکھے استعمال کا چرچا ہونے لگا۔ جو سنتا، قبہ لگاتا۔ لیکن نہ سمجھتا کہ یہ ہنسنا اس مریض پر نہیں، خود اپنے آپ پر ہنسنا ہے۔ اسے آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک ایسے حکیم مطلق نے نسخہ دیا تھا جس کی حداقت پر اس کا ایمان ہے۔ وہ نسخہ انسانیت کے تمام کہنہ اور چھپیدہ امراض کی مکمل تشخیص کے بعد مرتب

## آپ کی اپنی حالت

ہوا تھا۔ لیکن اس نے اس نسخہ کے ساتھ بعینہ وہی کچھ کیا جو اس مریض نے کیا تھا۔ جس کی حماقت پر یہ یوں ہنستا تھا۔ اس نے اس نسخہ عظیمہ کو مقدس غلافوں میں لپیٹ کر رکھا۔ کبھی تعویذ بنا کر گلے میں لٹکایا کبھی زعفران اور مشک وغیرہ سے لکھ کر دھودھو کر پینا شروع کر دیا۔ کبھی دوائیوں کے نام کی گنتی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ کہ مرض روز بروز بڑھتا گیا اور مشکل اندر مشکل یہ کہ جب کبھی کسی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ نسخہ کا استعمال صحیح نہیں ہو رہا تو جھٹلا کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ پھر طرہ یہ کہ نسخہ کے اس انوکھے استعمال میں کچھ عوام ہی مبتلا نہیں، بلکہ ایسی ایسی جلیل القدر ہستیاں بھی جنہیں خود طبیب ہونے کا دعویٰ ہے۔ کہیں! جس قوم کی یہ حالت ہو جائے، اس کی شفا یابی کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ افسوس کہ مسلمان نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ وہ نسخہ کیا جو کائنات کے حکیم و خبیر نے عطا کیا تھا اس کی عظمت کیا ہے۔ وہ عظیم المثال اور عظیم المرتبت نسخہ جس کے متعلق اس حکیم مطلق

## قرآن کی عظمت

کا ارشاد ہے کہ:-

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ ۙ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّوَعْلَمُونَ عَظِيمٌ  
 إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۙ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۙ لَا يَمَسُّهُ  
 إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۙ تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ٥ (۷۵-۷۶)

لے راہ گم کردہ انسانوں! میں تمہیں اس لامحدود وسعتوں والے آسمان کے استاروں کے بلند مقامات کو گواہ ٹھہرا کر کہتا ہوں۔ اگر تمہیں علم ہوتا تو سمجھ لیتے کہ یہ شہادت کتنی عظیم الشان شہادت ہے کہ یہ قرآن بڑی ہی قابل قدر و عزت کتاب ہے (جس کے حقائق فطرت کے چھپے ہوئے صحیفے میں (پلٹے پڑے ہیں) لیکن اس کے حقائق کو سمجھنے کے لئے قلب و نظر کی پاکیزگی ضروری ہے۔ یہ اس خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے جو تمام کائنات کی پرورش کرنے والا ہے۔

غور فرمائیے! رصد گاہ آسمانی کی بے پناہ بلندیوں کو گواہ ٹھہرا کر بتایا جاتا ہے کہ یہ قرآن کس قدر عظمت و توقیر، عزت و تکریم والی کتاب ہے۔ یہ نسخہ عظیم کیسا نایاب اور بے مثال اور اپنے اثر اور نتیجہ کے لحاظ سے کیسا بلند اور یقینی ہے۔ لیکن اس کا اثر اور نتیجہ تو انہی کے لئے ہوگا جو اسے صحیح طور پر استعمال کریں گے۔ جو اسے "جوش دے کر پی جائیں گے" انہیں فائدہ تو ایک طرف التالف نقصان ہوگا۔

وَنُزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۗ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ۝ (۱۷/۸۲)

ہم نے جو کچھ قرآن میں نازل کیا ہے وہ ایمان والوں کے لئے دیکھنا شفا اور رحمت ہے۔ لیکن جو اس کا صحیح استعمال نہیں کرتے ان کے لئے نقصان میں اضافہ کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

**قرآن کا صحیح استعمال** | قرآن کریم کا صحیح استعمال کیا ہے؟ اس کے لئے صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ تمام نوع انسانی کے لئے ضابطہ زندگی ہے۔ اس

ضابطہ کو پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ سمجھ میں آجائے اور سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ زندگی اس کے مطابق بسر کی جائے۔ لیکن اگر نسخے کے انوکھے استعمال کی طرح اس ضابطہ زندگی کو بازوؤں سے باندھ لیا جائے۔ گلے میں لٹکا لیا جائے۔ گھول گھول کر پینا شروع کر دیا جائے۔ اس کے الفاظ و حدود کی گنتی شروع کر دی جائے۔ اور توقع یہ کی جائے کہ جو فوز و فلاح اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہے وہ ہمیں اس انوکھے مگر سہل طریقے سے ہی مل جائے گی تو نتیجہ سوائے نقصان کے اور کیا ہوگا؟

قرآن ایک عملی تحریک کا بے مثال ضابطہ ہے۔ اور اس کے زندہ و پائندہ، درخشندہ و تابندہ

نتائج اسی وقت مرتب ہو سکتے ہیں جب اس کی حامل قوم کا عمل اس کے متعین کردہ نظام کے مطابق ہو نہ یہ کہ اس کے حروف و الفاظ کو گھول گھول کر پیا جائے۔ قرآن کا یہی وہ بے محل استعمال (ظلم) ہے جس کا نتیجہ خسران و نقصان کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ خود قرآن ہی کا فیصلہ ہے۔

اس سے پیشتر طلوع اسلام کے صفحات پر قرآن کریم کے اسی بے محل استعمال کے چند نمونے پیش کئے جا چکے ہیں جو ہمارے علوم دینیہ کے مرکز دیوبند مشرفیت سے شائع ہونے والے رسالہ "خالد" سے نقل کئے گئے تھے۔ آج اسی قبیل سے کچھ اور پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ ایک بزرگ ہستی کے تجویز فرمودہ ہیں۔ جو ہندوستان کے اربابِ شریعت و طریقت میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ علوم شریعت میں بھی مرجعِ انام تھی اور رموز طریقت میں بھی بے شمار انسانوں کے نزدیک منبع فیوض۔ قرآن کریم کے مفسر و مترجم بے شمار کتب دینیہ کے مصنف اور ایک بہت بڑے آستانہ کے مسند نشین۔ ان کی وفات کو زیاوہ عرصہ نہیں گزرا۔ ان کے ارشادات کو دیکھئے اور پھر غور فرمائیے کہ جب خود ایک حکیم الامت نسخہ کو جوش دے کر پینا شروع کر دے اور اسی کی تلقین کرنے تو مریضوں کا خدا حافظ!

لیجئے اب وظائف ملاحظہ فرمائیے۔ قارئین کی سہولت کے لئے ہر ایک وظیفہ کے بعد ہم نے آیت متعلقہ کا ترجمہ (جس کا مفہوم سمجھ میں آجائے) قوسین میں لکھ دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

(۱) فَذُ بَحْوُهَا وَ مَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ۝ (۲/۷۱)

خاصیت ۱۔ یہ آیت پڑھ کر خربوزہ یا کوئی چیز ترلے تو انشاء اللہ تعالیٰ شیریں و لذیذ ہوگی۔

(آیت کا مطلب ۱۔ سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ ایک گائے (بیل) ذبح کریں۔ انہوں نے اس سیدھے حکم کی تعمیل میں بیسیوں جھٹیں کیں اور بصدہ شکل اس پر آمادہ ہوئے۔ فَذُ بَحْوُهَا۔ پس انہوں نے ذبح کیا۔ وَ مَا كَادُوا يَفْعَلُونَ۔ اور ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا کریں۔ یہ تھا قرآن کا مفہوم اور یہ ہے اس آیت مقدسہ کا استعمال جسے حکیم الامت نے تحریر فرمایا ہے۔ غالباً لفظ ذبح سے مطلب خربوزہ تراشنا لیا گیا ہے۔

لہٰذا یہ مضامین ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع ہوئے تھے۔

(۲) أَفَغَيَّرَ دِينَ اللَّهِ يَبْنَعُونَ وَ لَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ

وَ الْأَرْضِ طَوْعًا وَ كَرْهًا وَ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝ (۳/۸۲)

خاصیت:۔ اگر سواری کا کوئی جانور گھوڑا اونٹ سواری کے وقت شوخی اور شرارت کرے اور چڑھنے نہ دے تو اس آیت کو تین مرتبہ پڑھ کر اس کے کان میں پھونک دے۔ انشاء اللہ تعالیٰ سیدھا ہو جائے گا۔  
 (آیت کا مطلب: کیا یہ لوگ اللہ کے قانون کی اطاعت کے علاوہ کوئی اور ضابطہ حیات اپنے لئے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انہیں دیکھنا چاہیے کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے طوعاً و کرہاً اسی کے (قانون کے) سامنے جھکا ہوا ہے اور سب کی گردنیں انہی محور کے گرد ہیں۔ یعنی جب کائنات کی ہر شے اللہ کے قانونِ مشیت کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے تو کیا انسان جو خود کائنات ہی کا ایک جزو ہے اپنے لئے قرآن کے علاوہ کوئی اور ضابطہ زندگی اختیار کرنا چاہتا ہے۔)

(۳) إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَ رَبِّكُمْ ۚ مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ

بِنَاصِيئِهَا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ (۱۱/۵۶)

خاصیت: اگر کوئی لونڈی یا غلام سرکش ہو تو بال پیشانی کے پچڑ کر تین مرتبہ اس کو پڑھے اور اس پر دم کرے۔ انشاء اللہ تعالیٰ تابعدار اور مستحضر ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب: میں اس اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے اور جس کا قانون مکافاتِ عمل ایسا محکم گیر ہے کہ کوئی جاندار ایسا نہیں جسے وہ پیشانی سے پچڑ کر اس سے مواخذہ نہ کرے یقیناً میرا رب ایک متوازن بدوش راستہ پر ہے۔ یعنی اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔)

(۴) كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ (۱۸/۱۸)

خاصیت:۔ اگر راستہ میں شیر یا کتا حملہ کرے اور شور مچادے تو فوراً اس آیت کریمہ کو پڑھ لے چپ ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب:۔ سورہ کہف میں ہے کہ اصحابِ کہف کا کتا اپنے بازو پھیلائے غار کے منہ پر بیٹھا ہے۔ آیت اور اس کی خاصیت کا باہمی ربط ظاہر ہے۔)

(۵) إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۚ وَأَذْنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۚ وَ إِذَا الْأَرْضُ

مُدَّتْ هِ وَ أَلَقَتْ مَا فِيهَا وَ تَخَلَّتْ ۙ (۴-۸۳/۱)

خاصیت :- ان آیتوں کو لکھ کر ولادت کی آسانی کے لئے بائیں ران میں باندھ دے، انشاء اللہ تعالیٰ بہت آسانی سے ولادت ہوگی۔ مگر بعد ولادت تعویذ فوراً کھول دینا چاہیے۔ اور اسی عورت کے سر کے بال کی دھوئی مقام خاص پر دینا مفید ولایت ہے۔

(آیات کا مطلب :- یہ سورۃ الشقاق کی آیات ہیں جن میں قیامت کی نشانیوں کا ذکر ہے۔ ترجمہ یہ ہے "جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم سن لے گا اور وہ اس لائق ہے۔ اور جب زمین کھینچ کر بڑھا دی جائے گی۔ اور زمین اپنے اندر کی چیزوں کو اُگل کر خالی ہو جائے گی۔ ربط ظاہر ہے۔)

(۶) اگر درِ زہ سے تکلیف ہو تو عورت موطا امام مالک (مجموعہ احادیث) پر ہاتھ رکھے فوراً ولادت ہو جائے گی۔

(۷) فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۗ وَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (۲/۱۳۷)

خاصیت :- جس سے حاکم ناراض و خفا ہو وہ اس آیت کو پڑھا کرے یا لکھ کر بازو پر باندھ لیوے۔ انشاء اللہ تعالیٰ حاکم مہربان ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب :- اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو تسلی دی ہے کہ ان سرکش مخالفین کی فتنہ انگیزیوں سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں، اللہ ان سب کے غلاف تیرے لئے کفایت کرے گا۔ وہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

(۸) جو شخص ساتوں حج کو پڑھا کرے اس پر دوزخ کے ساتوں دروازے بند ہو جائیں گے۔

(۹) هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۗ عِلْمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۗ هُوَ

الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝ (۵۹/۲۲)

خاصیت :- اسمِ اعظم اس میں مخفی ہے، جو کوئی صبح کے وقت سات مرتبہ پڑھے تو شام تک اس کے واسطے فرشتے دعائے مغفرت کریں اور اگر اس دن میں مرے تو شہید کا درجہ پائے گا۔ اور اگر شام کو پڑھے تو صبح تک اس کے واسطے فرشتے دعائے مغفرت کریں۔ اور جو اس شب میں مرے تو درجہ شہادت کا پاوے۔

ترجمہ :- اللہ کی ذات وہ ہے جس کے سوا کوئی اور اللہ نہیں۔ وہ غیب و شہادت کا جاننے والا اور

رحمن و رحیم ہے۔

(۱۰) القیوم۔

خاصیت :- اس کے پڑھنے سے کثرت سے نیند آتی ہے۔  
 (القیوم یعنی ایسا قائم کہ جسے اپنے قیام و بقا کے لئے کسی آمرے کی ضرورت نہ ہو۔ غالباً "نیند"  
 کی طرف خیال اس لئے گیا کہ القیوم کے بعد ہے کہ نہ اسے نیند چھو سکتی ہے نہ غنودگی۔ حالانکہ القیوم کی تاثیر  
 سے تو سونے والوں کو بھی بیدار ہو جانا چاہیے!)

(۱۱) المغنی۔

خاصیت :- اگر مشغولی جماع کے وقت خیال سے پڑھے تو بیوی اس سے محبت کرنے لگے۔  
 (المغنی۔ سب سے بے نیاز اور سب کا حاجت روا)۔

(۱۲) الرَّحْمَنُ الرَّحِیْمُ۔

خاصیت :- اگر طالبِ مطلوب کا نام مع نامِ والدہ کے لکھے، اس کی محبت میں سرگرداں ہو۔ بشرطیکہ جائز  
 محبت ہو۔

(۱۳) اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ ۝

خاصیت :- اگر یہ آیت پڑھ کر گم ہوئی چیز کی تلاش کی جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ ضرور مل جائے۔ ورنہ غیب  
 سے کوئی چیز اس سے عمدہ ملے گی۔

(مطلب آیت :- قرآنِ کریم میں مصائب و مشکلات میں استقامت کی تلقین کے بعد فرمایا کہ جماعت  
 مومنین کا مطمح نگاہ یہ ہونا چاہیے کہ ہماری تمام جدوجہد مشیت کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے اور ہماری  
 سعی و عمل کی تمام گردشیں اسی کے قانون کے محور کے گرد گھومتی ہیں۔

(۱۴) يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ (۲۱)

خاصیت :- حفظِ حمل کے لئے مفید ہے۔

(۱۵) اگر پوری سورہ نوح سوتے وقت پڑھ لی جائے تو احتلام سے محفوظ رہے گا۔



ایک اور وظیفہ | اتنے ہی ارشادات کافی ہیں۔ زیادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ورنہ کتاب میں تو  
 بڑے بڑے دلچسپ خواص لکھے ہیں۔ ان وظائف وغیرہ کا نام رکھا جاتا ہے "قرآن

کے اعمال، حالانکہ قرآن کا عمل تو صرف وہی عمل کہلا سکتا ہے جو قرآن کے احکام کے اتباع میں سرزد ہو۔ مؤلف کتاب نے ایک اور دلچسپ وظیفہ بھی لکھا ہے۔

احقر کو مرشدی... نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر کوئی حاجت مند تعویذ وغیرہ لینے آوے تو انکار مت کیا کرو۔ چنانچہ احقر کا معمول ہے کہ اس کی حاجت کے مناسب کوئی آیت قرآنی یا کوئی اسمِ الہی سوچ کر لکھ دیتا ہے اور فضلہ تعالیٰ اس میں برکت ہوتی ہے چنانچہ ایک بی بی کی مانگ باوجود کوشش بار بار کے سیدھی نہ نکلتی تھی۔ احقر نے کہا اهدنا الصراط المستقیم پڑھ کر مانگ نکالو۔ چنانچہ اس کا پڑھنا تھا کہ مانگ بے تکلف سیدھی نکل آئی۔ احقر نے یہ حکایت اس لئے عرض کی ہے کہ اور کوئی طالب بھی اس معمول کو اختیار کرے تو امید نفع اور برکت ہے۔

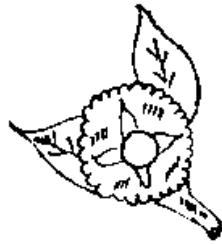
خور فرمائیے! ان اعمالِ قرآنی نے خود قرآن کریم اور اس پر ایمان رکھنے والوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اس زندگی میں فراخی رزق، نیک اولاد دشمن پر غلبہ، عزت کی زندگی، شیطان سے دوری، غیبی خزانوں کا علم، چوری سے حفاظت، ادائیگی قرض، جملہ جسمانی امراض سے شفا اور آخرت میں جنت، شہادت کا مرتبہ، رسول اللہ کی شفا دوزخ سے نجات، غرضیکہ اس دنیا میں اور آئندہ زندگی میں جس چیز کی بھی تمنا کی جاسکتی ہے اس کے متعلق چند اور ادوار و وظائف کے پڑھنے سے یا اگر پڑھ نہ سکتا ہو تو لکھ کر چاٹ لینے سے یا بازو پر باندھ لینے سے غیر مشروط طور پر گارنٹی دی گئی ہے۔ اور کوئی ایسی ضرورت باقی نہیں جس کے لئے قرآن کریم کو ضابطہ حیات بنایا جائے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک اس قسم کے اعمالِ قرآنی جو محمد رسول اللہ والذین معہ کا ضابطہ زندگی بنے تھے کچھ پیچیدہ اور لمبے راستے میں اس لئے ان کی جگہ اس زندگی میں کامیابی اور آخرت میں سرفرازی کے لئے (SHORT CUT) قرآن کی آیات کے ان باطنی معانی میں مضمر ہے جن پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسی صبر آزمایہ عمل کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور یوں مفت میں بیٹھے بھٹائے جنت مل جاتی ہے۔

بہشتے بہرہ را باب ہم است      بہشتے بہرہ پاکانِ حرم است  
بگو ہندی مسلمان را کہ خوش باش      بہشتے فی سبیل اللہ ہم است

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! ان اور ادوار و وظائف کو خود کر کے دیکھ لیجئے۔ ان میں واقعی اثر ہوتا ہے۔ یہ اثر اس لئے نہیں ہوتا کہ درد قرآن کی آیت کا کیا گیا ہے جو لوگ قرآن کریم سے واقف بھی نہیں اور کھلا ہوا شرک کرتے ہیں وہ بھی ایسے ایسے اعمال کرتے اور بتاتے



ہیں جو تاثیر کے اعتبار سے ان اوراد و وظائفِ قرآنی سے بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں۔ کیونکہ تاثیر زیادہ تر عمل کرنے والے کی فنی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے اس (PHENOMENON) کا تعلق علمِ انفس (PSYCHOLOGY) سے ہے۔ ایک خاص طریقہ سے جن الفاظ کو بھی بطور وظیفہ پڑھنے یا لکھنے اس قسم کے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی طویل ہے جسے ہم انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر پیش کریں گے۔ اس وقت تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ کس طرح نسخہ کا یہ انوکھا استعمال طبیبِ مطلق کے بتائے ہوئے علاج سے باز رکھنا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وارثینِ کتاب کی وہ جماعت جسے دنیا کی امامت کے لئے پیدا کیا گیا تھا آج دنیا میں سب سے پیچھے ہے۔ ان کی وہ علمی قوتیں جو انھیں دنیا کے سخت سے سخت مقابلہ میں سینہ سپر کر دیا کرتی تھیں مفقود ہو چکی ہیں۔ قرآنِ کریم کی برکت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی برکت اس پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ جھاڑ، پھونک اور گنڈہ تعویذ سے برکت حاصل کرنے کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں۔ یہ سب عجمی اثرات کا نتیجہ ہے۔



# خدا اور قیصر

(۱۹۵۵ء)

رمضان المبارک کی اسیسویں تاریخ ہے۔ مطلع ابر آلود ہے۔ افطار کے بعد ہر شخص کی آنکھیں ایک خاص سمت کو اٹھ رہی ہیں کہ دیکھیں وہاں سے کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ کل عید ہوگی یا ایک اور روزہ رکھنا ہوگا۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ تذبذب کی وجہ سے سینوں میں دل دھڑک رہے ہیں۔ دوکاندار دوکانوں پر سودے نہیں لگاتے کہ نہ معلوم کل کے متعلق کیا فیصلہ ہو، خریدار چیزیں نہیں خریدتے کہ پہلے کچھ فیصلہ ہو جائے تو پھر خریداری شروع کی جائے۔ غرضیکہ

مملکت کا گورنر جنرل بھی انتظار میں ہے۔

وزیر اعظم بھی انتظار میں ہے۔

کابینہ کے وزراء بھی انتظار میں ہیں۔

عدالتوں کے جج انتظار میں ہیں۔

فیڈرل کورٹ کا چیف جسٹس بھی انتظار میں ہے۔

پولیس کا انسپکٹر جنرل انتظار میں ہے۔

فوج کا کمانڈر انچیف بھی انتظار میں ہے۔

یہ سب انتظار میں ہیں کسی کے فیصلے کے یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب کس کے فیصلے کے انتظار میں ہیں؟ وہ کون سا مرکز ہے جس کی طرف مملکت کے کروڑوں انسانوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں؟ وہ

کون سی اتھاریٹی ہے جس کے پیش نظر یہ تمام اربابِ اقتدار و اختیار دم بخود بیٹھے وقف انتظار میں اور کوئی  
جرات لب کشائی نہیں کرتا؟

یہ کروڑوں نگاہوں کا مرکز، یہ اتھاریٹی اور اقتدار کا سب سے بڑا سرچشمہ، کراچی کی ایک مسجد  
ہے جس میں دو تین مولوی صاحبان بڑے عزت و نمکنت سے بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں کہ کل کے لئے عید کا فیصلہ  
کر دیا جائے یا ایک روزہ اور رکھا دیا جائے۔ اگر انہوں نے کہہ دیا کہ کل عید ہے تو کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ  
کل کا روزہ رکھے اور اگر ان کا فیصلہ یہ ہو کہ کل کا روزہ رکھنا ہوگا تو کسی کو اس کی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ  
عید کرے۔ ان کے اس فیصلے کے خلاف نہ گورنر جنرل دم مار سکے گا نہ کمانڈر انچیف۔ نہ کوئی جج اس کے خلاف  
جاسکے گا نہ چیف جسٹس۔ سب کو اس فیصلے کے سامنے تسلیم خم کرنا ہوگا۔ نہ ان میں سے کوئی اس  
فیصلہ سے پہلے اس معاملہ میں دخل دے سکتا ہے۔ نہ فیصلہ صادر ہونے کے بعد اس کے خلاف کہیں اپیل  
ہو سکتی ہے۔ پوری کی پوری قوم پر ان کی حکومت ہے۔ حالانکہ قوم ان فیصلہ کرنے والوں کو خوب جانتی پہچانتی  
ہے۔ جتنی کہ جس وقت لوگ ان کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے اس وقت بھی ان کے متعلق آپس میں طرح طرح  
کی پرمیگوئیاں کر رہے تھے، لیکن اس کے باوجود فیصلہ انہی کا ماننا تھا نہ کہ کسی اور کا۔ غور کیجئے کہ ان حضرات  
کی حکومت کتنے بڑے اختیار و اقتدار کی حکومت ہے۔

فیصلہ دینے کے بعد ان میں سے ایک صاحب اپنی گاڑی پر روانہ ہوئے۔ چوراہے پر پہنچے تھے کہ ٹریفک  
کے سپاہی نے سیٹی بجا کر روک لیا اور کہا کہ گاڑی کی بتیاں کیوں نہیں جلائیں؟ انہوں نے کہا ایک بتی تو  
جل رہی ہے۔ دونوں کی کیا ضرورت ہے؟ سپاہی نے ڈانٹ کر کہا کہ بتیوں کا حکم چیف کمشنر صاحب  
کا دیا ہوا ہے۔ اس میں آپ کو مجال گفتگو نہیں۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے پرچہ کاٹ کر ہاتھ میں تھما  
دیا اور کہا کہ کل دس بجے تیموری صاحب کی عدالت میں پیش ہونا ہوگا۔

کل عید ہوگی یا نہیں۔۔۔۔۔ اس کا فیصلہ مسجد کے ملا کریں گے۔

گاڑی کی بتیاں کس طرح جلائی جائیں گی۔۔۔۔۔ اس کا فیصلہ چیف کمشنر صاحب کریں گے۔

ایک ہی مملکت میں ایک ہی شہر میں دو متوازی حکومتیں !!!

ایک اور منظر سامنے لائیے۔

پولو گراؤنڈ (کراچی) میں عید کی نماز کا اجتماع ہے۔ لاکھوں کا مجمع ہے۔ گورنر جنرل صاحب تشریف لے رہا

ہیں۔ وزیر اعظم صاحب بھی دوزانو بیٹھے ہیں۔ کابینہ کے وزیر، چیف کمشنر، مجلس آئین ساز کے اراکین سب موجود ہیں۔ سندھ چیف کورٹ کے جج بھی، اور اتفاق سے فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس بھی، سب کسی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ ہر ایک آنکھیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا ہے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ بالآخر ایک عباد قبا میں ملبوس مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ انہیں آنا دیکھ کر بہت سی آنکھوں میں تحقیر کی ہنسی پیر جاتی ہے۔ بہت سے خندہ زیر لبی سے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ آکر مصلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور سب لوگ صاف بستہ ان کے پیچھے خاموشی سے ایستادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ جھکتے ہیں تو سب جھکتے ہیں۔ وہ اٹھتے ہیں تو سب اٹھتے ہیں، اس کے بعد وہ منبر پر تشریف لے جاتے ہیں اور جو جی میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سنتے ہیں اور جی ہی جی میں جنتے ہیں۔ کیونکہ ان کی باتوں میں سے اکثر ایسی ہیں کہ جن پر ہر صاحب عقل و ہوش کو ہنسی آجائے۔ لیکن انہیں اعلانہ بننے کی جرأت نہیں، جب تک امام صاحب کا جی چاہا انہوں نے انہیں باندھ کر بٹھائے رکھا، کسی میں اتنا کہنے کی ہمت نہیں کہ وقت زیادہ ہو رہا ہے۔ ہمت اور جرأت کیسے ہو۔ یہاں ان کی حکومت ہے۔ یہاں انہی کے فیصلے چلیں گے۔ بہر حال انہوں نے خطبہ ختم کیا، دعا مانگی، محفل برخواست ہوئی، بیٹھ بہت زیادہ تھی، یہ ایک طرف سے تیزی سے نکلنے لگے تو سپاہی نے ڈانٹ دیا کہ دیکھتے نہیں کہ یہ راستہ حضور گورنر جنرل کے لئے مخصوص ہے، ادھر مٹ کر چلو، یعنی تمہاری حکومت کا دائرہ اور تھا، اب تم کسی اور کی مملکت میں پہنچ گئے ہو۔

ایک ہی میدان میں پانچ منٹ کے اندر اندر حکومتیں بدل گئیں۔



اور تیسرا منظر بھی!

جناب وزیر اعظم کے صاحبزادے کی شادی ہے۔ گورنر جنرل صاحب تشریف فرما ہیں، وزیر سلطنت اعماد مملکت، اراکین مجلس آئین ساز، بڑی بڑی عدالتوں کے جج، سب زین دہ محفل ہیں، دولہا مجلس میں ہے اور دلہن اندر کمرہ میں، سب کسی کے انتظار میں ہیں، رہ رہ کر دروازے کی طرف دیکھ رہے ہیں، دیر ہوتی جا رہی ہے، چہ میگوئیاں سب کرتے ہیں، لیکن سب بے بس سے ہیں، کافی انتظار کے بعد مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں، سب تعظیم سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں، وہ (دولہا کے باپ) وزیر اعظم صاحب کو حکم دینے لگا کہ آپ اندر جائیں، وہاں یوں کیجئے اور یوں کیجئے، فلاں فلاں کو ساتھ لے جائیے، گورنر جنرل

صاحب آپ ادھر تشریف لائے۔ چیف جسٹس صاحب! میں جو کچھ کہوں آپ اس کے گواہ رہیں۔ وہ سب تکمیل ارشاد کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کچھ الفاظ کہتے ہیں۔ دو لہان الفاظ کو دہراتا ہے۔ ساری محفل ساکت صامت بیٹھی ہے۔ پھر وہ دُعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ جتنا وقت جی چاہے دُعا میں لگا دیتے ہیں کسی کی مجال نہیں کہ ان سے سبقت کر کے اپنی دُعا پہلے ختم کر لے۔ اس کے بعد وہ وزیر اعظم صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کے صاحبزادہ کا نکاح احکام شریعت کے مطابق بہ حُسن و خوبی تکمیل پا گیا۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس میں کسی کو دخل دینے کی اجازت نہ تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس نکاح کے متعلق ایک تنازعہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے کوئی ان مولوی صاحب کی طرف رجوع نہیں کرتا، بلکہ معاملہ اس عدالت تک پہنچتا ہے جسے وزیر اعظم صاحب کی حکومت نے مقرر کر رکھا ہے۔ معاملہ ایسا ہے جس کے لئے پہلے سے واضح قانون موجود نہیں۔ لہذا ایک نیا قانون بنانے کے لئے اسے مجلس قانون ساز کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ادھر یہ ہوتا ہے اور ادھر سے مولوی صاحبان کی طرف سے آواز آتی ہے کہ نکاح و طلاق کے بارے میں قانون بنانے والے تم کون ہونے ہو؟ تمہیں یاد نہیں کہ یہ نکاح خود ہمارا پڑھایا ہوا ہے، جب تم سب موجود تھے اور مولوی صاحب کا انتظار کر رہے تھے جب تمہیں نکاح پڑھانے کا حق نہیں تھا تو اب نکاح کے متعلق قانون بنانے کا حق کیسے حاصل ہو گیا؟ یہ ہمارے حدود و اختیارات کے معاملات ہیں جن میں تم دخل انداز نہیں ہو سکتے۔

غور کیجئے کہ کیا پاکستان کی آئین سازی کی ہشت سالہ تاریخ، اسی کشمکش و نزاع حدود اختیار سے ہی کی و استانِ الم انگریز نہیں؟ کیا یہاں آٹھ سال سے یہی کچھ نہیں ہو رہا کہ ”قوم کے نمائندے“ ایک آئین بنائے ہیں اور ”خدا کے نمائندے“ یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیتے ہیں کہ تمہیں اس آئین سازی کا حق ہی حاصل نہیں۔ یہ مملکت اسلامی ہے۔ یہاں شریعت کا نظام نافذ ہوگا۔ اور نظام شریعت کے مطابق آئین و قوانین سازی کے حقدار ہم ہیں۔ تم نہیں ہو! ”قوم کے نمائندے“ کہتے ہیں کہ نہیں! ہمیں اس کا حق حاصل ہے۔ یہ کہتے ہیں اور ساتھ ہی عید کے چاند، نماز اور خطبہ اور اپنے بچوں کے نکاح کے لئے فیصلہ ”خدا کے نمائندوں“ سے طلب کرتے ہیں، بات بالکل صاف ہے اگر رویتِ ہلال، خطبہ عید اور نکاح خوانی میں فیصلہ کا حق مولوی کو حاصل ہے تو یقیناً قانون سازی کا حق بھی اسی کو حاصل ہونا چاہیے۔ اور اگر قانون سازی کا حق اسے حاصل نہیں تو پھر ان امور میں فیصلوں کے لئے اس کی طرف کیوں رجوع کیا جاتا ہے؟ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ معاملہ

”شریعت“ سے متعلق ہیں۔ اس لئے ان کے لئے اربابِ شریعت ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ ہے وہ اصلی نکتہ جس کی وضاحت کے لئے ہم نے اس قدر طویل تمہید اٹھائی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں امورِ شریعت اور امورِ دنیا دو الگ الگ شعبوں سے متعلق ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر ایک دفعہ بیٹھ کر اس کا فیصلہ کر لینا چاہیے اور دونوں دوائر کی الگ الگ فہرستیں مرتب کر کے خدا کو خدا کی مملکت اور قیصر کو قیصر کی حکومت دے دینی چاہیے۔

اور اگر یہ دوائر الگ الگ نہیں تو پھر اس شرکِ جلی کو ختم کرنا چاہیے کہ رویتِ ہلال کا فیصلہ مسجد میں ہو اور عید کی تعطیل کا فیصلہ وزارتِ امورِ داخلہ میں، مقامِ اجتماعِ عید کا تعین چیف کمشنر کی طرف ہو اور عید کی نماز ملا جیوں پر ٹھہرائیں۔ وزیرِ اعظم صاحب کے لڑکے کا نکاح مولوی صاحب بندھائیں اور نکاح کے متعلق قوانین کا اجراء وزیرِ اعظم صاحب فرمائیں!

یاد رکھیے! ایک مملکت میں بیک وقت دو بادشاہ کبھی نہیں سما سکتے۔ جہاں ایسا ہوگا انار کی پھیل جائے گی۔ ماسکو میں قیصر ہی قیصر ہے۔ وہ خدا کو اپنے ہاں آنے نہیں دیتے۔ ویٹیکن (پوپ کی مملکت) میں ”خدا ہی خدا“ ہے۔ وہ قیصر کو اس مملکت میں قدم نہیں رکھنے دیتے۔ انگلستان میں ”خدا“ کو گرجا کی چار دیواری میں مقید کر دیا گیا ہے۔ اور اس سے باہر قیصر کی مملکت ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی مملکت میں آجا نہیں سکتے۔ لیکن ہم ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں ”خدا اور قیصر“ کی متوازی حکومت جاری کر رکھی ہے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے (یعنی قرآن کے الفاظ میں) خشکی اور تری میں ہر جگہ فساد ہی فساد — کوئی چیز اپنے اصلی اور ٹھیک مقام پر نہیں۔ اور تماشا یہ کہ ہر مذہب اور ہر اسٹیج سے یہ آواز بھی برابر بلند ہوتی رہتی ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دین اور دنیا الگ الگ نہیں۔ ایسی ”خالص منافقت“ بھی دنیا میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آئی ہو جب تک یہ دو علی اور منافقت ختم نہیں کی جائے گی، آپ کا ایک قدم بھی تعمیری منزل کی طرف نہیں اٹھ سکے گا۔

اسلام کے قرنِ اول (عہدِ رسالت) اور خلافتِ راشدہ) میں اس ثنویت کا تصور تک بھی نہیں تھا۔ ایک اسلامی نظام تھا جو ”دین اور دنیا“ دونوں کو محیط تھا۔ اس میں صوبے کا گورنر، جامع مسجد کا امام بھی ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں جب خلافت کی جگہ ملوکیت آگئی تو اس نے سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا۔ سیاست کا تعلق مملکت سے قرار پا گیا اور مذہب، علماء کے سپرد ہو گیا۔ اس طرح اسلام میں وہ ثنویت آگئی جسے مٹانے کے لئے وہ آیا تھا اور جسے اس نے عملاً مٹا کر دکھا دیا تھا۔ یہی ثنویت مسلمان ممالک میں ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ ہندوستان

میں (تقسیم سے پہلے) انگریز کی حکومت تھی۔ اس میں تو ہونا ہی یہی تھا کہ سیاست کا تعلق حکمران طبقہ سے ہوتا اور امور مذہب، علماء کے سپرد رہتے۔ امور مذہب سے مقصود پرسنل لازماً (شخصی قوانین) تھے۔ تحریک پاکستان کی بنیاد اس تقاضا پر تھی کہ مذہب اور سیاست کی یہ ثنویت خلاف اسلام ہے اور چونکہ یہ میٹ اسی صورت میں سکتی ہے کہ مسلمان ایک آزاد خطہ زمین میں اپنی مملکت قائم کریں جس میں دین کا صحیح نظام کار فرما ہو اور مذہب اور سیاست کی یہ ثنویت ختم ہو جائے۔ پاکستان مل گیا مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم ہو گئی لیکن وہ ثنویت جسے مٹانے کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا، بدستور چلی جا رہی ہے بلکہ یہ خلیج پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہو گئی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا ملک میں دو حکومتیں ہیں جو ایک دوسرے سے مسلسل برسرِ پیکار ہیں۔ اس ثنویت اور ثنویت کی ایسی شدت کا نتیجہ ہے کہ قوم بھی دو حصوں میں بٹ گئی ہے اور ان کی باہمی نفرت دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ آپ خود سوچ لیجئے کہ اگر اس ثنویت کو جلد از جلد ختم نہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

اسے ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ یہاں پھر سے وہ صحیح قرآنی نظام مملکت قائم کیا جائے جسے خلافتِ علی منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے اور جس میں مذہبی پیشوائیت کا الگ وجود نہیں ہوتا۔ کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

